گراں
طاہرہ اقبال

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی مدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: +92- 334 0120123

(ناول)

طاہرہ اقبال

دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد

ضابطہ

ISBN: 978-969-496-541-3

کتاب : گراں

مصنفہ : طاہرہ اقبال

موسم اشاعت : 2019

سرورق : خالد رشید

مطبع : ورڈ میٹ، اسلام آباد

قیمت : 550.00روپے

دوست پبلی کیشنز

پلاٹ110، سٹریٹ15، I-9/2، اسلام آباد

فون: 051-4102784-85

E-mail:dostpub@nayatel.pk

اُس انسان کے نام

جس نے مجھے طاہرہ جبیں سے طاہرہ اقبال بنایا۔ جس کی بخشی ہوئی محبتوں،
آسائشوں اور عزتوں کی خوش رنگ بارشیں مجھے سدا مہکاتی اور سنوارتی رہیں۔

میرے اقبال صاحب!

میری روح کی تنہا ویرانی پل پل ایک بین بنتی ہے۔
ہن کدے نہ مُڑسو، کسے گڈی توں نہ لہسو

طاہرہ اقبال

242۔علی روڈ، خیابان کالونی 2، فیصل آباد

موبائل:0333-6556131-0333-7804444

Email:Tahiraiqbal_writer@hotmail.com

ترتیب

''انشا کی رانی''

میں نے اس سے پہلے بھی طاہرہ اقبال کے کئی طویل افسانے پڑھے ہیں مگر یہ ان کے ناول ''گراں'' کا ابتدائی باب، اس کے بارے میں تو یہی کہوں گی کہ این کارِگراں است......تو بس این چیزے دِگراست۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے قلم میں نہ اتنی طاقت ہےاور نہ ہی وہ الفاظ کہ میں اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت کرسکوں۔کوئی ایک بات ہوتو مجھ جیسی کوتاہ قلم کے قابو آئے۔کیا سراسر فصاحت وبلاغت، کیا گاتی گنگناتی مدھر عبارت ہے جس کی لہروں کا سارا اتار چڑھاؤ اور بدلتے تیوروں کا بیان طاہرہ کے قلم کی کرامت کہی جاسکتی ہے۔''گراں'' زندگی کے ایک ایک پل بدلتے روز وشب کے جلو میں لحہ لحہ بدلتی موہوم سے موہوم کیفیتوں کا بیان پوری رنگا رنگ جزئیات اور صوتی تاثرات قائم کرنا! اس انداز کی خلاقی اور تخلیقی ہنر کسی کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے۔''گراں'' ناول کیا ہے ایک جیّد میموریل ہے جس میں رنگ بھرنے والی کے قلم (قلم ہے یا موقلم) نے گراں اور اس کے تناظر میں پھیلی نباتی اور حیاتی زندگی کے خفیف سے خفیف گوشے کونظر انداز نہیں کیا۔حد یہ کہ چوے کے ٹھہرے پانی کی تہہ میں جمی کائی کی تہہ سے پھوٹتے پودوں اور کناروں پر لٹکتے جالوں کے کتھئی رنگ اور لمبی لمبی ٹانگوں والے مینڈکوں کے رنگوں کو بھی نظر انداز

کرنے کا کیا سوال، وہ تو مکئی اور باجرے کی گرم گرم بھاپ چھوڑتی روٹیوں پر مکھن کی سفید جھاگ سے پگھلتے رنگوں کو بھی رنگ دیتی ہیں۔ میں کہتی ہوں اس خاتون نے اپنی نوکِ قلم کے اندر کتنی پلیٹوں اور رنگ کی کتنی پیالیوں میں کیسے کیسے اور کتنے رنگ بھر رکھے ہیں۔ کبھی بھلا ہی کی لکڑی کے کوئلوں کی آگ پر جمی سفید راکھ ہے۔ کہیں کہیں مونگ پھلی کے کھیت کھودنے اور سرخ سرخ مٹی پر چھائی ہری ہری بیلوں کے رنگ ہیں۔ میں خود سے پوچھتی ہوں اور پھر اس تمام رنگا رنگ بنت کے تار و پود سے بنتی اور ابھرتی ہوئی ''گراں'' کی زندگی کی ہمہ رنگی کہانی۔ حرکات و جزئیات کی خفیف سے خفیف کیفیت کو ایک راگ، ایک لے، سُر اور رنگ کے ساتھ کہانی میں سراسر بغیر تکلف یا کسی کوشش کے سموتے جانا۔

اور طاہرہ کا جو ذخیرۂ الفاظ ہے مجھے تو انشاء کی رانی کیتکی کے بعد اسی ڈکشن نے متاثر کیا ہے۔ بس اب کیا کہوں اور کیا لکھوں، میرے قلم میں تو سکت نہیں۔ اس ظالم نے تو رفتہ و گزشتہ کو حال اور آنے والے وقت کو اس طور اور انداز سے پاپیا کیا ہے کہ ہر ہر زمانے کے قدموں کی چاپ آنے اور گزر جانے والے سایوں کے موہوم مسکن اس طرح موجود ہیں کہ کچھ کہنے کی حاجت ہی نہیں رہتی۔

میں نہیں کہہ سکتی کہ میرے تاثرات صحیح ہیں یا غلط، پر میں نے اس کو پڑھ کر یہ دعا کی ہے کہ اس اسٹیج پر آ کر زندگی پر بھروسہ کرنا عقلمندی نہیں مگر یا اللہ اس ناول کو مکمل طور پر پڑھنے کے لیے ضرور زندہ رکھنا۔

الطاف فاطمہ

دیباچہ

چشمے کے وجود کو سرخوشی اور سیرابی سے تعبیر کیا جاتا ہے، چشمہ بے خود جذبات کا تلاطم اور مسرت کا ٹھہراؤ ہے۔

طاہرہ اقبال کا ناول ''گراں'' دراصل پانی کا وہ دھارا ہے جس سے پوٹھواری ثقافت اور معاشرت کے سُوتے پھوٹتے ہیں۔

''گراں'' قسط وار کولاژ میں چھپا، پہلی قسط کے بعد ہی ٹیلیفون کالز کا تانتا بندھ گیا، ''اگلی قسط کب آئیگی؟'' میں نے کہا جریدہ بھی دیر سے آتا ہے اور طاہرہ اقبال صاحبہ بھی تخلیقی کیفیت کے زیرِاثر لکھتی ہیں، جو لکھنے والے پر ہمہ وقت طاری نہیں رہتی، لیکن مجھے بعد میں احساس ہوا میں غلطی پر تھا۔ ناول کا وِژن اس بات کا غماز تھا کہ طاہرہ اگر لکھ نہیں رہی ہوں گی تو اسی بارے میں سوچ ضرور رہی ہوں گی، یوں تخلیق کا عمل جز وقتی نہیں ہمہ وقتی تھا۔

اکثر فون خواتین کے ہوتے اور ان میں سے بیشتر اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے تامل نہ کرتیں کہ وہ پڑھتے ہوئے رو دی تھیں،...... پھر ایک خاتون سے میں نے اعتراف کر ہی لیا۔

''آبدیدہ تو میں بھی ہو گیا تھا۔''

بلاشبہ حقیقت کی یہ دنیا کہانیوں سے بنی ہے۔

پہلی کہانی کی خالق عورت ہی تھی جو تخلیق کا موجب بنی اور یہ تخلیق بے شمار کہانیاں بن کر عورت کی صورت تجسیم ہوگئی۔اس ایک صنفِ نازک نے مرد کو ان نادیدہ گوشوں کی آگاہی دی، جہاں تک اس کی رسائی نہیں تھی،تشبیہات اور استعاروں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ساتھ کردیا۔ کبھی وہ انکار اور اقرار کا درمیانی اظہار یہ بنی،کبھی دوٹوک بات کا حرفِ آخر اور کبھی لب بستگی کا سخنِ معتبر......پھول کی پتیوں سے بنی ہوئی یہ نازک مخلوق درحقیقت ہیرے کی ہم جنس ہے،اس کی کھری ذات سے متعلق ساری تعلّی مرد کی اپنی تراشیدہ ہے۔۔۔عورت کہانیاں ڈھالنے کا سانچا ہے،جنہیں مرد بگاڑتا رہتا ہے۔

عورت کا سارا وجود کہانیوں کی کتاب ہے،جنہیں مرد بار بار پڑھتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، اس کتاب کے درمیان میں اگر کچھ صفحات خالی ہیں تو انہیں خالی نہ سمجھا جائے،......کچھ کہانیاں اَن کہی بھی تو ہوتی ہیں۔

عورت صحیح معنوں میں بتاتی ہے کہ محبت کیسے کی جاتی ہے،انتقام کیسے لیا جاتا ہے اور صبر کیسے کیا جاتا ہے۔۔۔مقابلتاً مرد اپنے جذبوں میں خام نظر آتا ہے کیونکہ وہ حسّاس نوعیت کے تمام کام انتہائی بے ڈھنگے پن سے کرتا ہے۔

ظاہری عورت کے اندر ایک دوسری عورت چھپی ہوتی ہے اور یہی عورت تیسری عورت کا روپ تب دھارتی ہے جب ظاہری اور مخفی عورت میں اپنے وجود کو مدغم کرلیتی ہے اور ایسا تبھی ہوتا ہے جب کوئی لکھنے والا شومئی قسمت سے اس تیسری کو دریافت کرلیتا ہے۔

ناول کے مطالعے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بارے میں بہت کچھ ایسا تھا، جو نسائیت کے حوالے سے اب تک پڑھنے اور پرکھنے والوں سے مخفی تھا۔ماحول کے پروردہ ناول ذہن میں رچ بس جاتے ہیں، یہ ہنرمندی روسی ناولوں کا طرّہ امتیاز ہے۔اس کی بہترین مثال And Quiet Flows The Don ڈاکٹر ژواگو اور چنگیز اُتماتوف کا ناول جمیلہ ہے۔

ماحول کی رنگا رنگی کرداروں کی محتاج نہیں۔ ماحول کے اپنے کردار ہوتے ہیں جو بہر طور اپنی حیثیت، اہمیت اور افادیت اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ منوا لیتے ہیں، لیکن اصل مسئلہ وہی ہے کہ اصل کام محسوس کرنا نہیں، محسوس کر کے بیان کرنا ہے۔ لائقِ تحسین بات یہ ہے کہ ''گراں'' پڑھتے ہوئے لگتا ہے آپ بھی اسی فضا میں سانس لے رہے ہیں، آتی جاتی سانس کے ساتھ جذبات کا زیر و بم آپ کو اس کرشماتی ماحول سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔

پوٹھوار، جب طاہرہ اقبال کے تحریری کینوس پر منتقل ہوتا ہے تو اس کے رنگ ڈھنگ پڑھنے والے کو ایک نیا زاویۂ نگاہ دیتے ہیں۔ یہاں فطرت کے تراشیدہ سارے ماحول پر ایک ایسی پراسراریت چھائی رہتی ہے جو دبیز سناٹوں کو جنم دیتی ہے لیکن یہی سناٹے واقعات اور حادثات کے افشا پر، وادیوں اور گھاٹیوں سے کبھی چیخوں اور کبھی قہقہوں سے گونج اٹھتے ہیں۔

جنوں اور انسانوں کے محسوسات اور جذبات کو اس طرح ہم ربط شاید ہی کسی نے کیا ہو...... یہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ ہے۔

''اعلیٰ تخلیقی جہت ٹکے بندھے اصولوں سے انحراف ہے''۔

اس جملے کی روشنی میں ''گراں'' کا مطالعہ کیا جائے تو کیفیت اور اظہار کا ایک اعلیٰ معیار اپنے پورے رچاؤ اور سبھاؤ کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے پوٹھوار ایک سیارہ ہے جو دریافت تو ہو گیا تھا لیکن اس کی بازیافت ''گراں'' کے توسط سے ہوئی، یوں دیکھا جائے تو گراں کا مطالعہ دراصل پوٹھوار کی رونمائی ہے۔

ناول کے پہلے اور دوسرے حصّے کا ادغام انتہائی مہارت کا متقاضی تھا، جسے طاہرہ اقبال نے عمدگی سے ایک دوسرے میں یوں سما دیا کہ کرداروں کی مکانیت تو بدل گئی لیکن سائیکی وہی رہی۔۔

میرے نزدیک پوٹھوار کی دو چیزیں تعظیم، حرمت اور عظمت کا درجہ رکھتی ہیں۔۔۔ایک طاہرہ اقبال کا ناول اور دوسرے گلزار صاحب کی اسی خطے میں گزاری ہوئی ابتدائی زندگی، جو ایک

مکمل ناول کا درجہ رکھتی ہے۔

آیئے ہم اردو زبان کے ایک بڑے ناول کا استقبال کرتے ہیں۔جس کے لیے ہم طاہرہ اقبال کے ممنون اور شکر گزار ہیں۔

اقبال نظر

چواپاک

صبح کا تارا سیاہ چٹان پر جھکی بکائن کے گھنیرے جھاڑ کی چوٹی سے جھلملایا۔ صنوبر جان نے چکی کی انی پور برابر اُونچی کی، دستی پر لپٹے کپڑے کو کھول کر کئی بل دیئے۔ شکیلہ جان نے پشمینے کی کڑھائی والی سیاہ شال کس کر لپیٹی، دونوں نے اُوپر تلے دستی پر مٹھیاں کسیں اور سینے کے ارتعاش کے ساتھ چکی کے پاٹ گھوں گھوں گھومنے لگے۔ مکئی کا زرد زرد آٹا چکی کے پڑوں سے چھٹا، چکی کا من بھر گیا جیسے لڑکیوں کے گالوں سے جھڑتے زردانے سفوف بن سوندھی مہک چھوڑتے ہوں۔ سیاہ پتھروں سے اسارے ہوئے اوٹے سے مختار کی آواز دُھندلی تاریکی کو چھیدتی رات بھر چتکبرے پتھروں پر گرتی آبشار میں جھنکار سی اُتری۔

سرگی نیا تاریا لو چاہ لا
روٹھرا ڈولا لواں منا
سرگی نیا تاریا۔۔۔ ہوشے
سرگی نیا تاریا لو چا لا

(سپیدۂ سحر جلد روشنی بکھیر دے کہ میں روٹھا ہوا محبوب ترت منالوں)

میلوں گھرے کسوں، نشیبوں، اترائیوں اور کوسوں بلند تیکھی دندیوں اور چوٹیوں پر چڑھ بیٹھی آسیب زدہ تاریکی کو چیرتی تیز گام، کوکتی چنگھاڑتی ہوئی کسوں پہاڑوں میں رات بھر بجنے والے جنات کے ڈھول باجوں کے رِدھم کو لپیٹ لے گئی۔ سوئے ہوئے جاگے۔ چولہوں پر دھرے گرم پانی کے تسلوں سے لوٹے بھر عورتیں لڑی (نشیب) میں اُتر گئیں اور مرد مسجد کو چلے۔

تنوروں سے تازہ تازہ اُترتی مکئی جوار کی موٹی موٹی روٹیوں کی مہک پوہ ماگھ کی ٹھٹھرتی صبح میں جیسے گرم گرم سانسوں کی ٹکور کرتی ہو۔

خانماں جان نے چاٹی کی کمر میں پیر کا وزن ڈال کر مدھانی کی رسیاں زور سے کھینچیں۔ مکھن کی موٹی تہ میں مدھانی بھاری ہو کر ٹھہر گئی۔ باجرے مکئی کی بھاپ چھوڑتی روٹیوں پر مکھن کی سفید جھاگ سی پگھلنے لگی۔

''ساری راتیں اہین پئی (برف اور کہرا پڑا) ہوکو! گرم جرابوں میں بھی اُنگلیاں جم جڑ گئی ہیں ہوکو توبہ! ''

تائی بختو نے بھوسہ مِلا کر پورے پچاس عدد یخ ٹھنڈے گوبر کے اُپلے تھاپے تھے۔ گوبر میں برف کا کانچ بھر گیا تھا جس کی بلیڈ سی دھار سخت ہتھیلیوں میں چھید لگاتی تھی۔ ابھی ہاتھوں کی سیاہ ریکھاؤں میں گوبر کی بر فیلی ہریالی دھنسی تھی، جسے چیڑ کی چل پل جلتی آگ پگھلا رہی تھی۔

نو دس برس کی زینب نے مرغیوں کا ڈربہ کھول دیا کڑ کڑ کڑاں پھڑ پھڑاتی ہوئی مرغیاں زینب کے سر پر اُڈاریاں مارنے لگیں۔ رات کی باسی روٹیوں کے بھوروں بھری رکابی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ نو عمر یوسف نے بکریوں کے کوٹھے کی سرکی (سرکنڈوں کی بنی کھڑکی) ہٹا دی۔ پورے گراں کا ریوڑ پھلائیاں چونڈتے پگڈنڈیاں چڑھتے کھائیاں اُترتے چوٹیوں نشیبوں پر بکھر گیا۔

کراچی سے آنے والی تیز گام نے پہاڑی سلسلوں میں ارتعاش مچا دیا۔ شکیلہ جان ناہموار زینے ٹاپتی جب تک چھت کے بنیرے پر پہنچی، نان سٹاپ ریل گاڑی اس قصباتی ریلوے اسٹیشن پر رُکے بغیر چھک چھک چھاں چھاں گزر گئی۔ شکیلہ جان کے دِل کی طرح لرزتی دہلتی پٹڑیاں تادیر

سَن سَن بجتی رہیں جن کے سینے سے آہوں سا دھواں اُٹھتا تھا۔ سیاہ بجریوں کے گول ملائم پتھر فضا میں اُڑتے اور پھر دھک دھک دھڑکنوں کے سے آہنگ میں باہم بجتے ٹکراتے۔ پہاڑ کی اس چوٹی پر آباد آٹھ دس گھرانوں کی عورتوں نے جھاڑو پوچا کرتے گھسڑ گھسڑ تاسف بھری سخت کُھردری ہتھیلیاں باہم رگڑیں۔

''ہوکو ہائے! چار سال گزر گئے کپتان صاحب نہ آپ پھرے نہ کوئی سکھ سنیہا بھیجا۔ شکیلہ جان اُڈیک (انتظار) کی ہر گاڑی کو تکتی اور خالی پٹڑیوں سے اُٹھتے دھوئیں کو تکتی جوانی کھا رہی ہے۔''

''ہائے کیوں نہ تکے، ٹھیکرے نی منگ اے اکبر خانے نی۔'' (بچپن کی منگیتر ہے اکبر خان کی)

''سن ادھر کان لا بجھ۔'' تائی بختو نے تیز دھار دمبیاں ٹوکرے میں بھریں، پشمینے کی کشمیری کڑھائی والی سیاہ چادر کی بکل کسّی اور فاطمہ کے کان میں نسوار زدہ دانتوں کی بھاپ چھوڑتی سانس کا بدبودار قطرہ سا پھونکا۔

''بجھ (سن) سراج کشمیری ناں جاتک (لڑکا) ادھر فوج میں نوکر ہے۔ اپنے اکبر خانے کی پلاٹوں میں ہی بھرتی ہے۔۔۔ پر ہم کیوں کہیں، جو کہے وہی پھنسے۔۔۔''

''نہ کہنا تائی۔''

فاطمہ نے میلے کپڑوں کی پنڈ سفید دوسوتی چادر میں باندھی، جس کے کناروں پر چپہ چپہ کروشیے کی جھالر لٹکتی تھی اور پوری چادر میں دس پھول کڑھے تھے۔ سبز پتیوں اور گلابی پنکھڑیوں والے گلاب کے پھول۔۔۔

صنوبر نے رات کی بجھی ہوئی کانگڑیوں اور ہاتھ سے اُساری چکنی مٹی کی کنگروں، سوراخوں اور میناروں والی انگیٹھیوں کی ٹھنڈی راکھ اُنڈیلی اور تازہ کوئلے بھرنے لگی۔ نومبر، دسمبر کی برفیلی ہوا کے کاٹ دار جھونکے چولہوں میں پھلا ہی کی لکڑیوں کو بھڑکا کر بجھا گئے۔ کوئلوں پر جمی سفید راکھ اُڑی۔

''سن صاف کہہ دیا اپنے اکبر خان نے کہ اس اَن پڑھ پوٹھوارن سے شادی کرنے والا نہیں، وہیں بیاہ دیں کسی گراں میں شہروں کے لائق نہیں ہے اور سن۔۔۔''

تائی بختو نے فاطمہ کی ران میں رازداری والا چٹکا بھرا۔

''افسر ہے کوئی اُدھر کرنیل بڑا۔۔۔اسی کی بیٹی سے۔۔۔'' نہرو ماشکی نے سوکھے گھڑوں پر مشکیزے کا منہ کھول دیا تھا جن کی چھونیوں (ڈھکن) پر رات بھر کی پھو(کہرا) جمی تھی۔ چشمے کے ٹھنڈے شفاف پانی کی دھار سے گھڑوں کی بیرونی سطح پر جمی گھڑونجیوں پر بیٹھی کہرے کی جھاگ مَس مَس بجھنے اور ڈھلکنے لگی۔ ریت کے موٹے موٹے ذرّات آنسوؤں میں ڈبڈبائی پتلیوں کی طرح چمکے، صحن میں کھڑی بیری پر سے پتوں کی پوری کھیپ ہوا نے اُڑا کر کسوں میں بھری اور چتکبری چٹانوں پر بچھا دی، جن کی کہانوں پر رات بھر گرنے والی پھو کی سفید جھاگ کو سورج کی پہلی پہلی کرنوں نے چمکا دیا تھا اور اب سرد سا، زرد رو سورج انھی جھلسی ہوئی چٹانوں کے سروں پر ٹنگا تھا۔ نہرو ماشکی میر حسن کی قبر پر پانی چھڑک رہا تھا۔ پورے قبرستان میں سب سے بلند تعویذ والی سفید سنگِ مرمر کی پختہ قبر پر زرینہ جان بیٹھی قرآنِ پاک پڑھ رہی تھی اور قبر روشن چاندی سی چمکتی تھی۔

اب ہر گھر سے عورتیں کمر سے ٹوکرے لگائے مونگ پھلی کھودنے کھیتوں کو نکلیں۔ کھائیاں اُترتے چوٹیاں چڑھتے چھوٹے چھوٹے سرخ مٹی بھرے کھیت مونگ پھلی کی ہری بیلوں سے ڈھکے ہوئے۔ عورتیں رمبیوں کی چمکتی قوسی دھار سخت مٹی میں کھبوتیں اور مونگ پھلیوں سے بھرا جڑوں کا گچھا باہر آجاتا۔

محمد جان نے مونگ پھلی کا گچھا ہاتھ سے توڑ کر ٹوکرے میں ڈالا۔

''بڈھی ہوگئی پر قبر نہ چھٹی ہائے کیسے چھٹتی۔۔۔''

عورتوں نے ربع صدی قبل کے اپنے پسندیدہ واقعے پر پھر تبادلۂ خیالات شروع کر دیا۔

''ہائے زرینہ جان کا تو برقعہ بھی سِل کر آ گیا تھا۔۔۔''

''ہائے لوٹی! کیوں نہ آتا فوجی کی بیگم بن کر کلکتے جو جا رہی تھی۔ میر حسن لام سے واپس آچکا تھا۔ جہاز کراچی بندرگاہ پر لگ گیا تھا۔ تار پہنچ چکا تھا۔ لکھا تھا وقت کم ہے۔ صرف آٹھ دِن کی چھٹی ملی ہے۔ زرینہ جان کو تیار رکھیں، ہائے جس روز تار پہنچا سارے گراؤں میں کمی گیتوں کا سدا (بلاوا) دینے

گیا۔ مغرب کی اذان کے بعد ہر گراں سے عورتیں پتاشوں، مونگ پھلیوں اور گڑ شکر سے بھری پراتیں کمنیانیوں کے سروں پر رکھوا، ڈھولچی ساتھ لگا ادھر بنہے گراں رتھ کنارے ڈھول کی تھاپ کے ساتھ پہنچتیں۔ ادھر ہم سب وڈھے موہرے والیاں ڈھولچی ساتھ لیے اُنھیں آگے لینے کو جاتیں۔ باریاں دیتیں ٹپے گاتیں، سٹھنیاں سناتیں۔ ابھی انھیں گھر لا کر بیٹھاتیں تو خبر ملتی کسی اور گراں سے دوستالا آ پہنچا ہے۔ ادھر ساگری، روات اُدھر سہوان سے گوجر خان تک سارا پوٹھوار آ پہنچا۔۔۔''

مختار نے زنخا لہجے میں بین کھینچا اور پگڑی کھول کپڑا ناک پر لپیٹا۔

''ہوکولوٹی ہائے لوٹی! پورے آٹھ دیہاڑے رج وج کے باجا گاجا ہوا ہائے ہائے۔''

عورتوں نے رمبیاں چھوڑ کر رانوں پر تاڑ تاڑ ہتھیلیاں پیٹیں۔

''جس دیہاڑے آٹھ گراؤں کے مرد ڈھول باجوں کے ساتھ پنڈی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔۔ہائے ہائے ہوکولوٹی۔۔۔میر حسن کو لینے پہنچے۔'' عورتوں نے جھوم جھوم کے سینے کوٹے۔

کہانی کا اگلا حصہ آہوں کراہوں میں ڈھل گیا۔ نان سٹاپ خیبر میل دھڑ دھڑ گزر گئی۔ پتہ نہیں بارش کہاں برس رہی تھی جو آبشار ٹپک رہی تھی۔ پانی رچ رچ کر پتھروں میں سے کائی پھوٹ نکلی تھی۔ سطح مرتفع پوٹھوار کے نقشوں جیسے ہرے لجلجے مخملیں جالے لٹک رہے تھے۔ پتھروں کی دراڑوں سے نکلے چھوٹے چھوتے پیپل، شہتوت، پالا کھائے پیڑ راکھ ہو چکے تھے لیکن پت جھڑ میں ابھی دِن باقی تھے۔ پرلی پہاڑی چوٹی پر سیاہ پتھروں کی چنائی والے مکان کی چھت کے بنیرے سے شکیلہ جان کی سیاہ بکل اُبھری۔ خیبر میل اِک ہنگامے کے ساتھ گزر گئی۔ سیٹیوں کی کوک اور پہیوں کی چھک چھک تادیر کسوں اور کھائیوں میں سنسناتی رہی اور بازگشت پہاڑوں کی بھیانک دیواروں سے ٹکرا کر پلٹتی رہی، جیسے زیرِ زمین زلزلے برپا ہوں اور پہاڑوں کے سارے کیل اُکھڑ گئے ہوں جن کے سینے سے بھیانک گونج نکلتی ہو۔

''ڈھول سپاہیے نا راہ پئی تکنی چار سال ہو گئے فوج سے چھٹی ملے تو کیسے کپتان صاحب کد مرن تے کد و چاری نی اُڈیک مکے۔'' (کب مریں اور کب بے چاری کا انتظار ختم ہو۔)

مختار عورتوں کی ٹولی میں بیٹھا تاسف بھری ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے زنانہ لب و لہجے میں وِچھوڑے کے گیت گنگنانے لگا۔

رکھیا باشا کھیڑے پے گئی اِل ماہیا
لمے وِچھوڑے کسے بہانے مِل ماہیا

(باز پالا تو اُس سے گِدھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگ گئی، لمبی جدائی پڑ گئی میرے محبوب کسی بہانے آن ملو۔)

''اس گراں کی مٹی تو اُڈیک (انتظار) کے پانی میں گندھی ہے۔ ادھر زرینہ جان کو دیکھ پچیس سال ہو گئے سر کا سائیں مان کر میر حسن کی قبر سے چپکی ہے۔ اُدھر جھلی میرن۔۔۔''

عورتوں نے گرم شالوں سے بھیگی آنکھیں رگڑیں۔

''عبدل صوبے دار کشمیر کے محاذ پر مارا گیا کہ قید ہوا۔ خبر ہی نہ ملی۔ پر اُڈیک نہ ہاری، مرنے کی خبر ہی لگ جاتی تو زرینہ جان کی طرح قبر کے تعویذ سے لگ حیاتی کاٹ دیتی۔ ہائے اُمید اندھی لاٹ جلائے بھی پر راکھ نہ بننے دے۔''

سارے گراں کی گائیں بھینسیں ہانکتی لیر و لیر تلوے، میل اور جوؤں سے جڑی جٹائیں بکھیرے جھلی میرن تیری چوٹی سے کوکتی ہوئی اُتری۔

''ہندوستان نی قیداچوں چھٹ آسن ٹیلی فون آیا ہے جرنیل صاحب نا۔'' (ہندوستان کی قید سے چھوٹ آئیں گے جرنیل صاحب کا فون آیا ہے۔)

جھلی گھونگھٹ کاڑھ سینے کے اندر ہی اندر گنگی، جیسے خوشی کے سازِ ینے بجاتی بے قابو تانیں ہر رگ، نس سے اُمڈ پڑی ہوں۔ موسموں کے شدائد کی ماری سالخوردہ جلد میں عجب لچک اور نرمی پیدا ہوئی جیسے اُبٹن ہلدی، عرق گلاب میں مِلا کر چڑھایا ہو۔

ہر روز جب سورج پہاڑوں کی اوٹ پرے اُتر جاتا ہے تو میرن جنگلی پھولوں کا گلدستہ بنا کر میلی چیکٹ چادر کا گھونگھٹ کاڑھ ادھر کلعام ریلوے اسٹیشن پر اپنے فوجی کا استقبال کرنے جاتی ہے۔ اسٹیشن ماسٹر مذاق میں پڑ جاتا ہے۔

''میرن! تیرا فوجی تو آج بھی نہیں اُترا۔''

وہ شرما کر پلّو ناک کی پھٹی ہوئی پھنک پر لپیٹتی ہے۔

'' گاڑی کو کراس پڑ گیا ہو گا۔کل اُترے گا لکھ ناؤں جیے۔۔۔ ہندوستان کی قید سے چھوٹ گیا ہے جرنیل صاحب نا ٹیلی فون آیا ہے۔''

کل کے دھاگے سے بندھا بے اَنت انتظار کھینچے ڈراؤنا انجن سیاہ راکھ دھوئیں لپیٹے چلا جاتا تھا۔جس کی ساری بوگیاں دوسرے انجنوں کو لگا دی گئی تھیں جو ساری دخانی توانائیاں اپنے ہی وجود میں بلوتا، دُکھتی سانسوں میں ہونکتا تھا۔مردوں نے مکئی کے ٹانڈے کاٹ کاٹ پھلے باندھے، جن کی بغلوں میں سبز پردوں والے سفید مکئی کے بھٹے چڑھے تھے۔ پھلاہی اور بڑ کے جنگلوں میں سنسناتی سیاہ مٹیالے پہاڑی سلسلوں کو چیرتی ہوئی تیز دھار ہوائیں عورتوں کے گالوں میں چرکے لگا گئی تھیں۔ کھکھڑی سی پھٹی جلد میں آڑے ترچھے چیرے پڑ گئے۔کالے کھرانڈ اُبھر آئے تھے۔ باریک باریک جڑوں سے لٹکتی موتیا رنگ مونگ پھلیوں کی ڈھیریاں پورے کھیت میں پھیلی تھیں جن پر سرخ ریتلی مٹی ملی تھی۔

''ہائے زرینہ جان کی کوئی بری بنی تھی۔ تین تولے کے مکھر ، پانچ تولے کا گلوبند، دس تولے کے شیر کے منہ والے کڑے، تولے تولے کی چار چھاپیں (انگوٹھیاں)،مخمل کے تین سوٹ، زری کے دو، تین بنارسی ، دو کم خواب کے ،لیڈی ہملٹن کی شلواریں، دِل پیاس کی قمیضیں ،شنگھائی اور ساٹن کے جوڑے، چاچا خزان سنگھ پنڈی سے سلوا کر لایا، ہائے کیا ویلا (وقت) تھا۔۔۔''

چوے سے پرے چتکبری چٹانوں کی نوکیلی چوٹیوں پر بارش کے قطرے ٹخ ٹخ گرنے لگے۔تہ بہ تہ کھیتوں میں مونگ پھلیوں کے گچھے توڑتی عورتیں گزرے زمانے پھرولنے لگیں۔ سامنے برستی بارش میں دُھندلاتے پہاڑی سلسلے جیسے دو دو کہانوں والے اُونٹوں کا قافلہ رواں ہو، جن کے سوار گرد میں چھپے نظر نہ آتے ہوں۔ پگڈنڈیوں سے بارش کے ریلے دھوئیں کے گولوں کی طرح اُڑنے لگے۔

''ہائے کیا ویلے تھے۔ ادھر ماسی کرتار کور کا چوکا روز نیل ملا کر چکنی مٹی کا پوچا پھیرتی۔ کانسی کے برتن مانجھ مانجھ آرسی بنا پرچھتی پر سجاتی چاہے تو منہ دیکھ کر سیدھی چیر نکال لو۔ جب بھی گرداوری آتی سکھ اہل کاروں کے لیے وہی تو جھٹکا پکاتی۔ کوئی اگا نہ پیچھا اکیلی جنمی اکیلی سدھاری۔''

''نہ اکیلی کیوں؟''

مونگ پھلی کے کھیت کنارے بچھی ماجی کی چارپائی جیسے گرم گدیلوں کی سرنگ بنی ہو۔ تازہ بیلی ہوئی روئی جیسی، سفید اچھاڑ چڑھی رضائی اور تلائی میں دبی براق روئی کی پونی سی ماں جی دھنسی تھیں۔ دونوں پسلیوں کے آس پاس بھنتی ہوئی دو کانگڑیاں چارپائی کے نیچے پکے کوئلوں کی گرم انگیٹھی، سفید چادر میں لپٹے برف کی قاش جیسے ہاتھ سے حقے کی چلم کے کوئلے پھرولے۔ گلابی بھڑک بالشت بھر باہر نکلی۔ لمبے کش میں دھخ دھخ انگارے دہکے۔

''نہ اکیلی کیوں بھرا پُرا خویش قبیلہ بس بچی اکیلی ہی۔۔۔''

ماں مہرالنساء کے حقے کے سوٹے میں کئی گزرے عہد سانس لینے لگے۔

''ہائے گھروں کے گھر اُٹھ گئے۔ گلٹی والی بیماری ایسی پھیلی قبروں کے لیے جگہ نہ رہی۔ جنازے پڑھنے کو انسان نہ بچے۔ سو، جی تھے اس گراں میں، بس سترہ جنے اور تیرہ زنانیاں بچیں۔ سا گری ویہلا (خالی) ہوگیا۔ روات، کلعام ویران ہوگئے۔ ادھر لبانی بنگلے میں انگریز ڈاکٹر آکر کئی دِن رہے پر موت کا علاج بندے کو تھوڑی دیا ہے اللہ جی نے۔ ہائے ہر پاسے موت کِھلر گئی مانس گند چھوڑنے لگا۔ آسمان چیلوں کوؤں سے بھر گیا۔'' بنا بتیسی کے جبڑوں سے پھونکنی کی طرح پھخ پھخ بین نکلے۔

رات بھر کی اہین اور بھوک سے بلبلاتی ہوئی بکریاں کھرے میں سکڑی کرنڈ پھلاہیاں چونڈنے لگیں۔ اُوپر چوٹیوں پر بارش رُک گئی تھی۔ پانی اک پتھریلے شور کے ساتھ جا جا سے بہہ نکلا تھا۔ ادھر نشیبی کھیتوں میں سکڑی ٹھٹھری زرد رو دھوپ چوٹیوں سے اُتر آئی تھی، جو یخ فضا میں دھواں سی بکھرتی۔ سانسوں کی بھاپ جم کر برف سی جھڑتی تھی۔ مختار نے گرم چادر سے زنانہ انداز

میں بکل ماری اور ناک کی پھنگ پر شہادت کی اُنگلی رکھی۔

''ماجی! آپ کی تو ابھی پہلی دوسری نہانی ہی ہو گی۔''

''دُر لعنت۔''

''رناں اِچ کناں، کوئی مرداں آلی تے گل ای نہیں خنزیرے اچ۔''

(کوئی مردوں والی تو بات ہی نہیں خنزیر میں)

ماجی نے لرزتے ہاتھ کی اُنگلیاں مختار کی کمر پر جھانپڑ بھر ماریں۔ ماجی کی چارپائی کے گرد مونگ پھلیوں کی جڑوں سے لٹکتے گچھے توڑتی عورتوں نے دانتوں میں پلّو دبا کر ہنسی روکی۔

''صرف ہمارے گھر سے ستائیس میتّیں اُٹھیں بس اوتے میں ای بچے۔''

''ہم نے جو پیدا ہونا تھا۔ اگر آپ بھی ماکرتارو کی طرح اکیلی رہ جاتیں تو ہم کہاں پیدا ہوتے۔۔۔ لیکن ماجی! آپ نے بھی موت کا جواب زندگی سے اچھا دیا۔ آٹھ بیٹے اور چھ بیٹیاں پورا قبیلہ جن دیا۔۔۔''

ماجی اپنی زرخیزی سے شرما گئیں۔ سر پر بندھے سفید گرم کپڑے کے ہم رنگ چہرے میں سرخ لہریں سی چھٹیں راکھ تاریکیوں میں چنگاری سی پھوٹی۔

''ہائے جنات انسانوں سے بڑھ کر مرے۔ ساری رات کسوں سے بینوں اور جنیوں کے رونے پیٹنے کی آوازیں آتی رہتیں۔ جنوں اور انسانوں کی لاشیں سڑ گئیں۔ گند چھوڑتے مانس کی بو سے درندے حیوان کہیں کو منہ کر گئے۔''

زرد روپتوں پر جما کہرا پگھل کر موٹے موٹے آنسوؤں کی صورت ڈبڈبانے لگا۔ چوے کی سطح پر جمی باریک کانچ سی برف کی تہ پھٹ گئی تھی۔ برساتی جھیل کے کنارے گول گیٹیاں اور نوکیلے پتھر سفید پھو (کہرا) میں لپٹے پگڈنڈیوں سے لڑھکے اور بارش کے پانیوں میں بہنے لگے۔

''ہائے کیسا ویلا (وقت) آیا جو دفن ہو جاتا اُس کی ماں بہن کو مبارکباد دیتے کہ مٹی نصیب ہوئی۔ کفن کہاں سلیں درزی کون بچا، گھروں میں چادریں بھی کتنی ہوتیں، جن کپڑوں میں

مرے اُٹھی میں دفنایا۔ ماتم کا مطلب نہ رہا موت کا خوف نہ رہا۔ کرتارو بھی اسی وبا میں اکیلی بچی۔ ابھی ہاتھوں کی مہندی نہ اُتری تھی کہ سر کا سائیں اُٹھ گیا۔ پر وفا ایسی کہ ساری عمر چوکھٹ نہ چھوڑی۔ ملٹری والے آئے زبردستی اُٹھا کر جیپ میں ڈالا۔ ہائے ہوکو! بین آج بھی کانوں میں پڑتے ہیں۔ چوکھٹ سے دیواروں سے لپٹ لپٹ کُرلائی ہے کہ کلیجہ پہاڑوں کا شق ہو گیا۔۔۔''

ادھر پہاڑی کے دامن میں پرال بچھا، دوپہر کا کھانا لگنے لگا۔ دیسی گھی کی تری سے بھرا پہاڑی بکرے کے گوشت کا مرچیلا سالن، تنوری پراٹھے، میوے کھوپرے بھرا سوجی کا حلوا، شکیلہ، صنوبر، صابرہ، زینت، فخرن، فاطمہ ساری لڑکیاں روغنی مٹی کی رکابیاں سالن اور حلوے کی بھربھر ترپال پر رکھنے لگیں۔ عورتیں ہاتھ دھوتے ہوئے پھر ماضی پھرولنے لگیں۔

''ہائے باوا خزان سنگھ کی ہٹی! چھ ماہی ادھار پر سودا چلتا، شادی بیاہ پر گڑ پتاشوں کے تھال مفت بھیجتا۔ ہائے لوٹیاں پڑیں۔ ساگری لٹی، پنڈی سڑی۔ ہائے لوٹی۔۔۔ ہائے لوٹی۔۔۔کیسی کیسی پھلکاریاں ہندوانیوں کے ہاتھ کی ریشم کی کڑھائی والی، اِتنی پیٹھ دار کہ کپڑا نظر نہ آتا۔ سوسو پھلکاری، ایک ایک گھر سے نکلی ''تھلے'' اور ''گڑھے'' کے ظلمی لوگ لوٹ کر لائے۔ پیتل کی گاگریں کھیس، دریاں اور ریشم اور کھدر کی ساڑھیاں۔ ہائے بیچاری، ہندوانیاں اور سکھنیاں گھٹے گھٹے مکانوں کے تھڑوں پر بیٹھی ساری دیہاڑی چرخہ کاتتیں۔ دونوں باہنیں سونے کے چوڑوں سے بھری ہوئیں، جی بھر کے لٹ پڑی۔ باہنیں کان بھی خالی ہوئے، بھرے گھر خالی ہوئے۔ ہائے بیٹھے بٹھائے صدیوں کے جمے جمائے وسیب میں کیسا واہڑا وگیا (ہل چل گیا)۔ عمروں کے سنگی ساتھی اِک دوسرے کو کاٹنے وڈنے لگے۔ ہائے ہائے ظلمی۔۔۔ ہائے ہائے لوٹی۔۔۔''

عورتوں نے گھٹنوں پر ماتمی ہتھیلیاں ماریں جیسے تاریخ کا یہ المناک باب ابھی ابھی اُن کی نظروں کے سامنے رقم ہوا ہو اور گرم خون اور کٹے پھٹے اعضا سامنے پڑے دھواں چھوڑتے ہوں۔

''بڑے باوا جی بہشتی چھت پر کھڑے لٹیروں، قزاقوں کو ''توہ توہ'' کرتے، ہائے آنکھوں پہ چربی چڑھی تھی وہی خونی بن گئے جن کے ساتھ برسوں نسلوں سے ہنستے بستے عمریں گزری تھیں۔

باوا خزان سنگھ ادھر چوبارے پر دس دِن مہمان رہا۔ آپ بندوق ساتھ لے کر سارے پوٹھوار سے اگراہی کروائی۔ پیسہ پیسہ وصول کر کے دیا پھر اپنی حفاظت میں پنڈی کیمپ چھوڑ کر آئے۔ کسی مائی کے لال کو جرأت نہ ہوئی کہ سکھوں کے گھرانے پر میلی نظر ڈالے۔ باوا جی بہشتی ایک کندھے پر کارتوسوں والی پیٹی، دوسرے پر پستول چڑھائے ہاتھ میں بندوق پکڑے شملے پر مشہدی لنگی باندھ کر باہر نکلتے، کڑکڑ مائع والا سوٹ، اُوپر کالی اچکن، راہوں کے لکھ بھی اُٹھ اُٹھ دیکھتے۔ عورتیں گلیوں میں نکل آتیں، نظریں اُتارتیں، کہتیں کس ماں نے لال جنا، ساڑھے چھ فٹ کا شیہ جوان۔ پورے پوٹھوار کے مرد سلام کرنے آتے۔ انگریز کچہری میں کرسی دیتے افسر اُٹھ کر ہاتھ ملاتے۔''

تائی بختو نے بڑا سا نوالہ لسّی کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے اُتارا، جیسے لمبی کتھا سناتے سناتے سانس چڑھ گیا ہو۔

بارش کے بعد پرشور گرنے والی آبشار تھک کر دھیمے سروں اب گنگنا رہی تھی۔ کائی کھائے پتھروں سے لٹکتے لجلجے سبز جالوں میں سے قطرہ قطرہ کہرے کا کانچ پگھل رہا تھا۔ اردگرد کے گراؤں کی عورتیں سروں پر گھڑے رکھے سانپ کے لہریئوں جیسی پگڈنڈیاں چڑھتی اُترتی تھیں۔ شکیلہ اور صنوبر میلے کپڑوں کی پنڈیں اُٹھا کس چڑھیں۔ تبھی ''تیز رو'' بلند چوٹیوں سے اُدھر دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ گزر گئی۔ شکیلہ جان جھیل کے پانیوں میں نتھارتی کپڑا چھوڑ پگڈنڈی چڑھی۔ شاید کوئی کراس پڑا تھا۔ قصباتی ریلوے اسٹیشن پر ''تیز رو'' رُک گئی تھی لیکن کوئی ایک مسافر بھی نہ اُترا تھا۔ شکیلہ کے اندر بین کا لہریا سا اُٹھا۔

''کد مڑ سو کیڑی گڈی توں لہسو۔'' (کب واپس آؤ گے کس گاڑی سے اُترو گے۔)

کراس کرتی تیز گام پہاڑی سلسلوں میں ارتعاش مچاتی گزر گئی۔ گارڈ ہری جھنڈی ہلاتا کثیف دھویں اور چنگاریوں کے غبار میں لپٹا رہ گیا۔ پہاڑی پگڈنڈی کے صدیوں پرانے نوکیلے پتھروں کے گھسے زینوں سے شکیلہ جان واپس اُتری۔ جس کے ایک طرف سیاہ مہیب نوکیلی چٹانیں تنی تھیں۔ دوسری سمت کی چٹان گھِس گھِس کر پتلی دیوار سی کھڑی تھی۔ جیسے یاجوج ماجوج نے چاٹ چاٹ پیاز کے چھلکے جیسا باریک کر دیا تھا۔ نیچے گہری کھائی میں برساتی نالہ اُترتا چلا گیا جس کے

کنارے بیٹھی عورتیں کپڑے دھوتی تھیں۔ پنڈیں کپڑوں کی ڈھل کر جھاڑیوں اور پتھروں پر سوکھ رہی تھیں۔ اب تن کے کپڑے اُتار کر اُنھیں دھو رہی تھیں۔ برہنہ جسموں کو بانہوں کے شکنجے میں یوں جکڑے ہوئے کہ سوائے کھلی کمر کے کوئی حصہ دِکھائی نہ دیتا تھا۔ پتہ نہیں دوبارہ ایسی روشن دھوپ کب کھلے۔ یہاں جھڑی لگتی تو آٹھ آٹھ روز سورج انگڑائی نہ لیتا بادلوں کے لحاف اوڑھ گہری نیند سویا تو دِنوں آنکھ نہ کھلی۔

''بی بیو چیلا (دوپٹہ) کرو ڈنگروں کو پانی پلانا ہے۔''

اصغر خان کی ہانک کے ساتھ نہائی دھوئی عورتوں نے ساٹن کی شلواریں اور دِل پیاس کی قمیصیں جلدی جلدی پہنیں۔ پشت تک پھیلے گیلے بال اوڑھنیوں میں ڈھک جھاڑیوں پر سوکھتے کپڑے اکٹھے کرنے لگیں۔ صنوبر ہلکے سروں گنگنائی۔

''لنگھ آؤ۔''

زینب نے کولہے میں چٹکا بھرا۔

''آپوں بناساں ماہیے نوں لاڑا۔'' (اپنے محبوب کو خود اپنے ہاتھوں دُولہا بناؤں گی۔)

''چھی او چھی۔۔۔چھی او چھی۔''

اصغر خان برساتی جھیل کے اتراؤ کی سمت مویشیوں کو پانی پلاتا تھا۔ صنوبر جیسے پیاسی ٹیٹری آبشار کے شفاف پانیوں میں ڈُبکیاں لگاتی تھی۔ ''چھی او چھی۔''

جانوروں نے سیر ہو کر باچھیں جھٹکیں، کرلاتی ٹیٹری، سمندروں بہتے پانیوں میں بھیگتی پیاس پیاس پکارتی رہی۔ ''چھی او چھی۔'' برفیلی تند ہواؤں میں جھلسی بیلیں اور پودے چوٹیوں پر ٹھٹھر کر کرنڈ ہو چکے تھے۔ نیچے نشیبوں میں تیکھے کوہانوں والی سیاہ چٹانیں کہرے کی بھربھری جھاگ سے ڈھکی تھیں۔

ایک ہی باپ دادا کی اولاد یہ دس گھرانے اِس پہاڑی گاؤں میں نجانے کب سے آباد تھے۔ یہاں باہر سے آ کر کبھی کوئی نہ بسا۔ سنتالیس کے اجاڑوں میں بھی جب زمین و آسمان اُتھل پتھل ہو گئے، جب ہر بستی نئے اور دُکھیارے چہروں سے پھوڑوں سی بھر گئی۔ یہاں کے دُشوار

گزار پہاڑ عبور کر کے کوئی نہ آ سکا۔ بس ایک سکھ گھرانہ پرایا تھا، جو ماں جائے کی طرح اپنا تھا جو اپنی یادیں چھوڑ کر کب کا جا چکا تھا۔ پہاڑوں کے دامن میں اُترتے چڑھتے ٹیرسنگ کھیت مونگ پھلی مکئی جوار، گندم اُگاتے تھے۔ بس اِتنی مقدار میں کہ پیٹ بھوکے نہ رہیں۔ نہ کوئی ان کا مزارع نوکر نہ یہ خود کسی کے تابع محکوم۔ بارانی فصل بارش کی محتاج تو تھی لیکن انھیں کسی کا محتاج نہ کرتی۔ نہ کبھی یہاں کی کوئی لڑکی بیاہ کر باہر گئی نہ یہاں سے بیاہنے کو کوئی باہر نکلا۔ چہار اطراف سنگینوں کی مانند بلند کھڑے پہاڑوں میں بسی یہاں کی عورتوں کی زندگیاں انھی کے اندر سمٹی ہوئی محدود تھیں جن کی دُنیا بس انھی دس بارہ گراؤں کے خول میں بند تھیں۔ اس گاؤں کی تاریخ کے اہم واقعات یہی تین چار تھے۔ جنھیں ساون بھادوں کی آٹھ آٹھ روز لگی جھڑی میں، سردیوں کی ٹھٹھرتی لمبی راتوں میں اور گرمیوں کی تپتی پہاڑی دوپہروں میں پچھلی عورتیں اگلی نسلوں کو کہانیوں کی طرح سنا سنا کر روائت منتقل کرتی رہتی تھیں۔ اس وقت بھی اُوپر مونگ پھلی کے کھیتوں میں باتوں کا رُخ سنتالیس کے فسادات سے زرینہ جان کے قصے کی طرف پھر مڑ گیا تھا۔

''ہائے ہم ساری تو بیاہ کے گیت گا رہی تھیں کہ تائے فضل کریم کی ایسی دُکھیاری ڈانٹ پڑی جس نے گیت کے حلق میں بین پرو دیئے۔''

زرینہ جان کے سینے کی لائن پر سے گزرتی نان سٹاپ گاڑی دھڑ دھڑ کچھ بوٹیاں قیمہ بنا کر اُڑا لے گئی، پگھلتی ہوئی پٹڑیوں میں سے دُھواں اُڑتا رہ گیا۔

''ہائے میر حسن لام سے تو بچ آیا پر کراچی کی سڑکیں اُسے نگل گئیں۔۔۔''

نیچے نشیبوں میں نظر نہ آنے والی گہرائیوں میں جنات کے ہاں کوئی مرگ ہو گئی تھی۔ جنیوں کے رونے پیٹنے کی صدائیں جنگل پاٹتی کس چڑھتی پتھریلی چوٹیوں سے دھاڑ دھاڑ ٹکراتی تھیں۔ یہاں انسانوں اور جنوں نے اپنی اپنی حد بندی کر رکھی تھی۔ انسان ''ڈونگھے لڑ'' میں پھیلے جنگلوں میں کبھی نہ اُترتے اور جنات انسانی بستیوں کے رستوں پر کبھی گھر نہ بناتے۔ دونوں مخلوقات نے اک دوجے کے جینے کے حق کو صدیوں سے تسلیم کر رکھا تھا۔

مختار ہل کو روک کر مردانہ لباس میں زنانہ چال چلتا ہوا عورتوں کے قصے میں شامل ہوا۔ پگڑی کھول کر دوپٹے کی طرح سَر پر لپیٹی۔

''زرینہ جان بھی فوجی کی منگ تھی نہ روئی نہ کرلائی مائیوں والے پیلے چیلے (دوپٹہ) میں لپٹی ساس کے گھر گئی اور بین کھینچا۔

''دیکھ بے جی! تیری بہو آپ چل کے تیرے دیوارے آئی ہے۔'' ساس بہو جو مل کر روئی ہیں تو پہاڑوں کے دِل پھٹ گئے۔ ڈونگھے لڑ سے جنیاں منہ سر پیٹتی ہوئی باہر چوٹیوں پر نکل آئیں۔ لے وہ دِن اور آج کا دِن اس در کو نہ چھوڑا۔ کیسے کیسے رِشتے نہ آئے۔ ساس نے آپ منت کی تو کنج کنواری ہے۔ نکاح کے دو بول ہی تو پڑھے گئے تھے۔ پر ایک بار جو نام ساتھ جڑ گیا۔ بس جڑ گیا۔ یہ تو پوٹھوار کی ریت ہی نہیں توبہ توبہ! اِک واری جیہڑی منگی گئی مرد دیکھا کہ نہ دیکھا بس اسی نام کے لڑ لگ عمر گزار دی۔''

اس گراں کی وفا شعاری کے تفاخر سے عورتوں کی گردنیں تن گئیں۔ روایات کی پاسداری کا عزم اور حوصلہ مشقتی جھریوں میں لپٹی آنکھوں میں لو دینے لگا۔ میلوں نیچے چوے کے پاک پانیوں سے لڑکیاں گھڑے ڈبو کر بھرتی تھیں۔ ہاتھ ڈال پاؤ پاؤ بھر پستئی رنگ مینڈک اور اُنگلی اُنگلی بھر چتکبری مچھلیاں باہر نکال واپس چوے میں چھوڑ دیتیں۔

پھر اُنگلیوں میں پڑی منگنی کی چھاپ (انگوٹھی) کو چوے (چشمے) کے پاک پانی سے مَل مَل دھوتیں۔ جس لڑکی کی اُنگلی میں یہ چھاپ نہیں بھی تھی وہ بھی دِل میں اِک چھاپ بسائے ہوئے تھی۔ سب جانتی تھیں کہ پھپھیرے، ممیرے، مسیرے بھائیوں میں سے جن کا جوڑ بنتا تھا اُنہی کے نام کی چھاپ سارے وجود پر گڑھی تھی، جیسے درختوں جانوروں کے جسموں پر اُن کے مالکوں کے نام کندہ ہوتے ہیں۔ جو مر گئے تھے اُن کی قبروں کی چھاپ سدا زندہ تھی۔ میر حسن کی قبر اس گراں میں ایسے ہی تھی جیسے کوئی قابلِ احترام درگاہ، جس کی مجاور زرینہ جان تھی۔ جو پچھلے پچیس برس سے قبر کے تعویذ سے لگی اِتنی بار قرآنِ پاک ختم کر چکی تھی کہ اب تو بغیر دیکھے کئی کئی سورتیں پڑھ جاتی۔ اِتنی بار تسبیح گھمائی

تھی کہ کھور کی گٹھلیوں سے بنے دانوں پر پوروں کی چھاپ آ گئی تھی اور جاپ سوتے میں بھی لبوں پر جاری رہتا تھا۔ اس گراں کی دوسری قابلِ احترام قبر شہید لانس نائیک امجد خان کی تھی جسے سال میں دوبار فوجی بینڈ سلامی دینے آتا تھا۔ چاق و چوبند فوجیوں کا دستہ مارچ کرتا پھولوں کی چادر چڑھا کر سلیوٹ مارتا تو اردگرد کے گراؤں سے جمع ہونے والے نوجوان فوجی بوٹوں کی آہنی دھمک میں ایسی شہادت کے خواب بنتے۔ شہید کی بیوہ امیر جان آج بھی فوجی وردی والی تصویر اور نشانِ جرأت والے تمغے کے ساتھ سہاگن تھی۔ شہید کی بیٹی صنوبر کو دوسری لڑکیوں کے مقابل اک عزت دی جاتی تھی، جس پر تایا زاد اصغر خان کے نام کی چھاپ لگی تھی، جو پتھروں، کنکروں پر لیٹی پہاڑی جھیل کے شفاف پانیوں میں سے مویشیوں کو پانی پلاتے ہوئے انھیں پیار سے تھپتھپاتا لیکن اک پیاسی ٹیٹری ایک بوند اِک نگاہ اِک تھپکی اک چپھی اوچھی کی پیاسی ہی رہ جاتی۔ آپ ہی آپ کرلاتی ''لنگھ آ ؤ'' جیسے دل کے سارے دروازے کھول دیا جا کر پلکوں کے اوٹے میں رکھا ہو۔ ''لنگھ آ ؤ'' (در آ ؤ)

آج سورج چڑھے سے عورتیں مکئی کے ٹانڈوں میں چھپے بھٹے چھیل چھیل کر الگ کر رہی تھیں۔ سنہری موتیوں سے چمکتے سفید دانوں سے بھرے بھٹے پڑ (ڈھیر) میں پھینکتی جاتیں اور گنجے تکے جن پر موٹے موٹے آنسوؤں جیسے چند دانے جڑے ہوتے، انھیں اپنی جھولی میں چھپا لیتیں جنھیں شام پڑے کوئلوں پر بھون کر کھانا تھا اور ایک ایک دانے کے موتی پر کسی کا نام جپنا تھا۔ جیسے تسبیحوں پر ''یا حبیبو'' ''یا حبیبو'' کا ورد ہوتا ہے۔ کھیت سے پرے اُونچی پہاڑی کی ہموار سطح پر بنی قبروں میں سفید سنگِ مرمر کی لوح کے ساتھ بیٹھی زرینہ جان قرآن پاک پڑھ رہی تھی جس کا کاغذ بوسیدہ ہو چکا تھا اور بیچ بیچ میں سے لفظ نکل گئے تھے لیکن اب اُسے یاد تھا کہ پھٹ کر مڑے ہوئے کاغذ پر کونسا لفظ لکھا تھا۔ ادھر بوہڑ کے نیچے شہید کی قبر تھی جس نے کشمیر کے محاذ پر بہادری کی مثال قائم کی تھی اور ستارۂ جرأت حاصل کیا تھا۔

تائی بختو نے دودھی چھلی چبائی گودا باچھوں کے دونوں کناروں سے ٹپکا۔

''ہائے کیا جنازہ تھا شہید کا جنازہ۔۔۔ ڈغ ڈغ ڈغ فوجیوں کے بوٹ بندوقوں کی

جھنکار پھولوں کی چادریں، مہینوں مٹی کی ڈھیری دِکھائی نہ دی اور خوشبو کے ہولارے سے پورا پوٹھوار مہکتا رہا۔"

مختار نے مردانہ آواز میں زنانہ آہ بھری۔

"اللہ ایسی موت ہر کسی کو نصیب کرے۔۔۔شہادت کی موت، سیدھا جنت کے باغوں کے جھولے جھولے۔ہائے ہائے اللہ ہر کسی کو جھلائے۔"

ماجی نے دھپ لگایا۔

"زنخا! تو فوج میں کیوں نہیں بھرتی ہوتا۔ایسی موت کی چاہ میں بس ٹھنڈی آہیں بھرتا رہے گا۔" مختار نے سر پر چادر لپیٹ ناک پر شہادت کی اُنگلی ٹیڑھی کر کے رکھی۔

"ماجی! میں چلا گیا تو آپ کی میّت سریلے لمبے لمبے بینوں سے کون سجائے گا اور کپتان صاحب کے سہرے کے گیت کون گائے گا۔"

مختار نے منہ پر کپڑا ڈال کر لمبا بین کھینچا۔"دوہرے دوہرے وسباں آلی ماجی ٹری گئی ہائے لوٹی! کپتان صاحبے ناں سہرا وی نہ تکیا۔۔۔سہرے نیاں لڑیاں پنج ماجی کیتا اے حج۔۔۔بین اور سہرے کے بول ملا کر جب مختار نے زنانہ انداز میں گائے تو عورتیں کچی مونگ پھلیوں کے ڈھیروں پر لوٹ پوٹ ہو گئیں۔

بہت نیچے چوے سے گھڑے بھرتی لڑکیاں آواز سے آواز ملانے لگیں۔چوے میں تین تین پاؤ کے پستئی رنگ مینڈک چھلانگیں لگاتے تھے اور اُنگلی اُنگلی بھر مچھلیوں کا پونگر سطح آب پر تڑپتا تھا۔چوے میں بچھی کائی میں سے پودے پھوٹ نکلے تھے کناروں پر کتھئی جالے لٹکتے تھے جو لمبی جاہنگوں والے مینڈکوں کے ہم رنگ، ہم شکل تھے۔

اصغر خان نے چٹان کی اوٹ سے ہانک لگائی۔

"بیبیو چیلا کرو" بازگشت سفید چٹانوں سے ٹکراتی کسّوں میں پلٹتی رہی۔

عورتیں نہا دھو کر کپڑے پہن چکی تھیں اب پشت پر پھیلے سیاہ گھنیرے بال پھلاہی کی ذرا سی

ٹہنی کے ساتھ جھٹک جھٹک کر سکھا رہی تھیں۔ برساتی ڈھلانی جھیل کے اردگرد پورے گراں کے کپڑے سوکھتے تھے۔ چٹانوں پر، جھاڑیوں پر، گھاس کے قطعات پر پھیلے ہوئے رنگ برنگ کپڑے۔

''لنگھ آ ؤ۔''

صنوبر گیلے بدن کو سیاہ گرم شال میں لپیٹ آواز کی سریلی لہک میں سمٹ گئی۔

چوے سے گھڑے نتھارتی موہڑے، گڑھے، تھلے، کرپال، بگے سارے گراؤں کی عورتیں چادروں کی بکلوں میں منہ چھپا کر ہنسیں۔ نہ منگنی نہ نکاح بس زبان کا بھروسہ۔ فاطمہ کو تو زبان کا آسرا بھی نہ تھا لیکن اظہار الحق سے اُس کی عمر کا جوڑ تھا۔ سو دِل ہی دِل میں سب نے سوچ لیا تھا کہ یہ جوڑا اچھا ہے لیکن خود اظہار الحق نے تو اپنا جوڑ کتابوں سے بنا رکھا تھا۔

فاطمہ نے اُوپر چوٹی پر پھیلے بوہڑ کے گھنیرے جھاڑ کو تکا جس کے ساتھ لگی چارپائی پر اظہار الحق کتابوں میں دبا تھا۔ جس پر بیٹھے پہاڑی کوّے سیاہ ٹوپیاں سروں پر اوڑھے پھٹی آواز میں گھاں گھاں کر رہے تھے۔ تبھی تیز رو پوری رفتار سے گزر گئی۔ شکیلہ جان کی جان بھی اسی رفتار سے لائین کی پٹڑیوں پر پٹختی رہ گئی۔ ایسی ہی کوئی گاڑی اِک روز اکبر خان کو لا کر پنڈی اسٹیشن پر اُتارے گی۔ کپتان صاحب فوجی وردی میں کیسے سجتے ہوں گے۔ چٹے پڑ پر کھڑے اکلوتے دیودار سا قد، چوے کی بغلی چٹان سا پھیلا کشادہ مضبوط سینہ، چوے کے میٹھے پانیوں سا آنکھوں کا شربت، بولے تو بیری کے بُور سے کتنے پھول جھڑ جائیں۔ شکیلہ جان بنفشہ کے خوشبودار پھولوں کی پھوار میں مہکار میں ڈھک گئی۔

''کدمڑسو کیڑی گڈی توں لہسو اُڈیک اُڈیک اکھیاں وی تھک ہاریاں۔''

فاطمہ نے تھلے اور موہڑے گراں کی لڑکیوں کو ہاتھ کی اوک بنا قریب بلایا۔ سطح مرتفع پوٹھوار سے بادلوں کے سیاہ پہاڑی سلسلے اُٹھے اور آسمان پر چوٹیاں بنا گئے۔ عورتوں نے جھاڑیوں پر سوکھتے ہوئے کپڑے سمیٹے۔ پہاڑوں کی بارش کا بھی کوئی اعتبار۔ سیاہ وردی پوش فوجی پلاٹون، دگڑ دگڑ بھاری بوٹوں سے مارچ کرتے ہوئے جیسے چھاؤنیوں سے نکلے ہوں۔ جنگی نعرے لگاتے

کہیں حملہ آور ہونے کو صفیں بنائے بھاگے چلے جا رہے ہوں۔

''بے چاری اُڈیک میں اہین کی طرح کھڑ رہی ہے۔ پر اکبر خانے نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس اَن پڑھ پوٹھوارن سے شادی نہ کرے گا۔''

''کسی کرنیل کی پڑھی لکھی لڑکی سے کر رہا ہے۔''

موٹی موٹی بوندیں چتکبری چٹانوں کی تند چوٹیوں پر ٹخ ٹخ بجیں جیسے گوریلوں نے شب خون مارا ہو جیسے چھاتہ بردار رسوں میں پروئے ہیلی کاپٹروں سے اُترتے ہوں۔

''توبہ توبہ۔''

لڑکیوں نے کانوں کی لویں چھوئیں۔

''اس پوٹھوار میں تو ایسی عہد شکنی اور بے وفائی کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ جھوٹ نرا جھوٹ۔ چھوڑ فاطمہ جان! نکاح ہوا ہے پچاس مردوں کے بیچ مکر کیسے سکتا ہے۔''

''نکاح ہوا ہے، بدائی تو نہیں ہوئی نا۔ کوئی بے اِیمان ہو جائے تو پھر نکاح بھی تو دو بول ہی ہیں نا۔''

لڑکیوں نے شکیلہ جان کے دہکتی کانگڑی سے وجود کا سینک سینوں میں محسوس کیا، جو انتظار کی جوت میں ساری ہی سلگ رہی تھی۔ جس کی لو تو ہر لڑکی کے سینے میں روشن تھی۔ ہر کوئی کسی ایک نام کے دِیئے میں بڑی واٹ سی دُختی تھی۔ ہوا کا جو جھونکا ایک کو بجھائے تو دوسریوں کی جوت بھی تھرتھرائے۔ سبھوں نے اپنے اپنے دِیئے کو ہوا کی سمت سے پلکوں کی اوٹ میں ڈھکا۔

''نہ نہ ماننے اندر نہیں آتا۔ کپتان صاحب بھی صوبیدار حکم داد کے نطفے میں سے ہیں جن کی فوجی بندوق لوڈ ہو کر ہر ویلے کندھے سے چڑھی رہتی ہے۔ اِتنی بے ایمانی نہ نہ۔۔۔''

لڑکیاں دو دو تین تین پانی بھرے گھڑے سروں پر اُٹھا پہاڑ چڑھنے لگیں۔ جیسے سروں پر اُن ناموں کے بھرے گھڑے اُٹھا رکھے ہوں جن کی چھاپ اُنگلی میں پڑی ہے۔ دِلوں میں گڑھی ہے جسموں پر کھدی ہے۔

رات کولڑکیاں لال ٹین اور لیمپ کی روشنی میں اپنے منگیتروں، چچیرے، پھپھیرے، ممیرے، مسیرے بھائیوں کے نام کے سویٹر بنتیں۔ جتنے مشکل نمونے ڈالتیں۔ شاید محبت بھی اُتنی ہی گوڑھی ہوتی۔ ادھر پنڈی سے گوجر خان، چکوال سے اٹک تک سے، کالے پھڈے والے سکول کی اُستانیاں نئے نئے نمونے لاتیں، جو ہاتھوں ہاتھ ساری دُنیا سے الگ تھلگ اُونچی پہاڑی پر ٹنگے اس گراں تک بھی پہنچ جاتے۔ سردیوں کی کہرازدہ راتیں جب چشموں، جھیلوں، آبشاروں پر سے ٹپکتے پانیوں پر برف کی تہیں جما جاتیں۔ کنویں پینڈوں میں اُتر جاتے۔ دندیوں چوٹیوں پر برف کا کانچ چڑھ جاتا، تو یہ لڑکیاں اُون کی گرمی میں پوروں کی ٹھنڈک کو سینکتیں۔ ہر پھندنے میں اپنے اپنے جوڑ کے نام کو گوندھتیں۔ پکی گرھیں لگا لگا پندرہ بیس گھروں والے مشکل نمونے میں جکڑ دیتیں۔ تائی بختو نے کچی مونگ پھلی چھیل کر اکٹھے آٹھ دس دانے منہ میں ڈالے۔ کچی مونگ پھلی کا دودھ باچھوں کنارے سے بہا۔

گل بجھ (بات سن) کالے پھڈے والا راجا لہراسب توبہ توبہ۔۔۔"

کانوں کی لویں چھوئیں۔ کچی مونگ پھلی کا چبایا ہوا گودا باچھوں پر سفید سفید چپک گیا۔ نسوار کی چٹکی نتھنوں میں پھونکی، صنوبر کی ماں امیر جان، شکیلہ کی ماں خانماں، صابرہ کی ماں رحمت جان، فاطمہ کی ماں نعمت جان ساریہ کی ماں محمودہ جان ساریوں نے اپنی اپنی بکل میں دہکتی کانگڑیوں کو جما کر گودیوں میں رکھا کہ تائی بختو جب بھی لاتی کوئی اندر کی گجی خبر ہی ڈھونڈ کے لاتی۔ جھٹکے دار مصالحہ دار ساری دیورانیوں، جٹھانیوں، نندوں، بھاوجوں نے بکلوں سے کان باہر نکالے۔

"توبہ توبہ ہڈا اُچاناں تے ہڈے ہوئے آلا (اتنا بڑا نام اور ثروت مند) سگا بھتیجا۔۔۔ بیٹی لینے سے اوکا انکاری ہوگیا۔"

ہائے لوٹی! کہنے لگا اَن پڑھ ہے آپ چودھویں جماعت میں پڑھتا ہے نا جاتک (لڑکا) زمیندارہ کالج میں اپنے جیون جوگے اظہار الحق کا جماعتیا ہے نا۔۔۔"

فاطمہ کی ماں نعمت جان کی رضائی میں چھپی کانگڑی پھسل گئی۔

''سنا اب اُستانی گھر پر رکھوا کر دی ہے۔ پہلی جماعت کا قاعدہ پڑھ رہی ہے۔۔۔ہائے سولہویں سال میں لڑکی اور الف ب والا قاعدہ۔۔۔''

ڈونگھے لڑ، میں جنات کی بجتی ہوئی ڈھولک گہری چیخ سی بن کر پگڈنڈیاں چڑھی جیسے طنبورے کی آخری کربناک تان ٹوٹی ہو۔

''توبہ کل جگ ہے سارے پڑھیاں لکھیاں مانگتے ہیں تو اَن پڑھ بیچاریاں کدھر جائیں۔''

گہرے نشیبوں میں گونجتی بازگشت کی تیز چیخیں سرد ٹھٹھرتی چٹانوں سے ٹکرائیں۔شکیلہ جان بڑبڑائی۔

''جنات کے ہاں کوئی موت ہوگئی ہے۔''

''اب دیکھو نا اپنا اکبر خاناں پڑھ لکھ کر کپتان ہوگیا۔ پر نکاح تو اپنی شکیلہ جان سے ہوا ہے نا۔ سگھڑ سیانی سوسو وسباں والی، پر پڑھی تو قرآن مجید ہی ہے نا،کل کلاں وہی کہے کسی کرنیل جرنیل کی پڑھی لکھی لڑکی سے۔۔۔

''کیا کہتی ہو بختاور! یہ کوئی بات ہے کرنے کی۔''

اکبر خان کی ماں محمد جان نے تڑپ کر کانگڑی دائیں پسلی سے بائیں پسلی کی طرف کھسکائی۔ بھسم ہوتی دونوں انگیٹھیوں میں شکیلہ جان نے ہاتھ مار سفید راکھ جھاڑی۔گلابی چنگاریاں اُڑیں۔

لالٹین کی لاٹ پھڑ پھڑانے لگی۔چمنی کو تیل چڑھ گیا تھا۔شعلہ چھت سے باہر بھڑکا۔فاطمہ نے پھونک مار کر لالٹین بجھادی۔شکیلہ کی بُنتی خراب ہوگئی تھی۔ایک گھر گر گیا تھا اب دوانگلی سویٹر اُدھیڑنا پڑے گا یہ نمونے بھی کتنے گنجل ہوتے ہیں ایک گھر غلط بن لیا پورا نمونہ بگڑ گیا۔ایک گھر گر گیا چپہ بھر بنا ہوا اُدھیڑنا پڑا۔

''ویسے ایک بات کر رہی تھی اپنا اکبر خاناں تو اتنا بی با بچہ۔۔۔شکیلہ کوفتاں (عشاء) کی نماز پڑھ لی تو نے۔۔۔دُعا کیا کر۔۔۔اپنے فوجی کے لیے۔۔۔''

تائی بختو گنگنانے لگی۔

مسیتی پڑھنی آں قاعدہ۔۔۔نکی عمراں اِچ پے گیا وعدہ
تے کدوں نکھٹسی ہائے رب کدوں نکھٹسی

شکیلہ بالشت بھر بنائی اُدھیڑتی چلی گئی نماز تو کب کی پڑھ چکی تھی لیکن دُعا تو ہنوز ہر خانے کی بنتی میں گندھتی چلی جارہی تھی۔ دُعاؤں سے گُتھا سویٹر پورا ہونے والا تھا جو پارسل بنا کر ادھر کوئٹہ چھاؤنی بھیجا جانا تھا۔ جسے کپتان اکبر خان خود اپنے ہاتھوں سے کھولے گا۔ جس کے ہر ہر خانے میں شکیلہ جان کی آنکھوں کے چراغ کھلے دھرے ہوں گے۔ شاید نظریں چار ہو جائیں۔ شکیلہ جان اس تصور سے ہی سرد پسینے میں نہا گئی۔

فاطمہ نے اظہار الحق کے سویٹر کے بازو کے کندھے کے گھر گھٹائے نظروں ہی نظروں میں تولا۔

''پورا ہی ہوگا۔''

صابرہ کے کان میں سرگوشی کی۔

''ذرا بھائی کی بانہہ تو ناپ دے۔''

صابرہ نے کھڑکی میں لیمپ رکھے کتاب پڑھتے ہوئے اظہار الحق کے بازو کو کھینچا۔ اُس نے بہن کی اس جسارت پر احتجاج کیا۔

''کیوں وقت ضائع کرتی ہو بی ایس سی کے پرچے دینے ہیں۔ کسوں میں کپڑے کوٹتے اورمیّرے میں مونگ پھلی کھودتے عمر نہیں گزارنی مجھے۔''

لالٹین کی لاٹ بھڑ کنے لگی شاید کھڑکی کی کسی درز میں سے سرد ہوا کے جھونکے نے سسکی بھری تھی۔ بہت نیچے ڈونگھے لڑ میں جنات کی آوازیں بہت تیز اور بلند ہوگئی تھیں۔ ڈھولک کی گونج پہاڑ کے چاروں پاٹوں سے ٹکراتی تو پھٹے ہوئے حلق کی چیخ سی بن جاتی تھی۔ دِن بھر فضاؤں میں بھری رہنے والی آوازیں اب گہرے نشیبوں میں بھری چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں، جنھیں عورتیں جنات کی آوازیں کہتی تھیں۔

محمودہ جان نے بیٹے کی تلخی کو مخصوص پوٹھواری لہجے کی لچک دار ڈھیلی لیٹی شیرینی میں ڈبو دیا۔

''نہ بچہ جی نہ۔ بہن نے کتنے چاؤ سے سویٹر بنا ہے کتنی پیٹھ دار بنتی ہے۔ آٹھ گھروں سے مِل کر بننے والا مشکل نمونہ ڈالا ہے، پہنے گا تو شہزادہ لگے گا میرا لال۔۔۔''

''اُدھر راجہ بازار میں بہت پڑے ہیں۔ شہروں میں کون پہنتا ہے، ہاتھوں کا بنا ہوا یہ دگڑ مال۔۔۔ نہ لکھائی نہ پڑھائی ساری رات اُون لپیٹتی رہتی ہیں۔''

اظہار الحق گرم دھسا لپیٹتے ہوئے کتابیں سمیٹنے لگا۔

''نہ بچہ نہ ولائتی مشینی سویٹروں میں تو مشینوں کی ٹھنڈی گھسی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں تو ہاتھوں کی گرمی رچی ہے۔''

ڈھو والے نواری پلنگوں پر نرم گرم گدیلے ٹانگوں پر ڈالے گرم کانگڑیاں بکلوں میں چھپائے ساری لڑکیاں ہاتھوں کی گرمی میں دِل کی دھڑکنیں پرو رہی تھیں۔ نرم گرم اُون کے پیچ دار پھندنوں میں اُس نام کی گرہ لگاتیں جو اُن کے نام سے جڑا تھا جیسے یہ سویٹر کی بنتی نہ ہو بلکہ ہر ہر خانے میں وہ نام لکھا گیا ہو جس کی شبیہ دِل کے نہاں خانے میں گھڑ ھت ہوئی تھی۔ ان میں سے اگرچہ کوئی بھی لکھنا نہ جانتی تھی لیکن چادروں سرہانوں پر اُنھی ناموں کے پہلے پہلے حروف چھپوا کر ریشم کے دھاگوں سے کاڑھتیں۔ جیسے ان ناموں میں وہ صورتیں چھپی ہوں جن کے ریشم بالوں کو وہ نرم پوروں سے سہلاتی ہوں۔ چکنی اُنگلیوں سے دھیرے دھیرے مساج کرتی ہوں۔ محمودہ جان روکتی رہی لیکن اظہار الحق کتابیں اُٹھا کر باہر بیٹھک میں پڑھنے کو چلا گیا۔ فاطمہ کی گود میں رکھی کانگڑی یخ ہوگئی باہر پوہ ماگھ کی ہوائیں لمبے لمبے سیاہ بال کھولے چڑیلوں کی طرح چیختی چنگھاڑتی، بند دروازوں سے منہ سر ٹکراتی رہیں اور ڈونگھے لڑ میں ہونے والی موت پر جنیاں گونجیلی آواز میں پرسوز بین کرتی رہیں۔ صحن میں کھڑی بیری اور بکائین کے سیاہ جھاڑ کہرے میں سمٹ گئے تھے۔ کنوؤں، چشموں اور برساتی نالوں میں جہاں کہیں بھی کوئی پانی کا قطرہ موجود تھا کہرا بن کر جم گیا۔ تازہ بھری رضائیوں کی روئی ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ انگیٹھی میں دہکتے کوئلے سفید راکھ میں لپٹے تھے لیکن کہیں کہیں سے گلابی بھا مار جاتے تھے۔

''محمودہ جان نے برف میں جمی فاطمہ کو بجھتی کانگڑی کا سینک دیا۔''

''مردانہ بازو تین گٹھ اور ایک چپہ ہوتا ہے، جیون جوگا قد آور ہے تو چار بالشت بن لے۔ ناپنے کی تو لوڑ (ضرورت) ہی نہیں۔۔۔''

ناپ تو دِل کے پیمانے میں پورا پورا نپا تلا تھا لیکن فاطمہ پھر بھی پھو (گرتی ہوئی برف) سی جمتی رہی کہیں پور بھر فرق نہ رہ جائے۔ پوری سردیاں لڑکیاں سویٹر بنتی رہتیں کہ ہر ہر اونی گھر میں دِل جگر پروتی رہتیں۔ دس گھرانوں کے اس پہاڑی گاؤں کو چہار اطراف سے لپیٹے مٹیالے پتھریلے پہاڑی سلسلوں کی چوٹیوں پر پھو پڑتی رہی۔ یہاں برف تو نہ جمتی تھی لیکن صفر درجہ حرارت میں اوس کے قطرے یا بارش کی بوندیں، نیچے اُترتیں تو ٹھٹھر کر کہرا بن جاتیں۔ چٹانوں، چوٹیوں کے دروں سے تلوار کی دھار لیے تیز ہوائیں اُترتیں اور چہروں، ہاتھوں کی جلد کو چھید و چھید جھلسا ڈالتیں۔ پتھروں میں سے نکلتے پودے جھلس کر کرنڈ ہو جاتے، جیسے میدانی علاقوں میں گرمی جھلساتی ہے۔ یہاں سردی جلا ڈالتی۔ بارش شروع ہوتی تو پانچ چھ روز چوٹیوں کو دھوتی۔ ڈھلانوں سے اُترتے ریلے کسوں کھیتوں، ندی نالوں میں موجود نباتات کو ٹھٹھرا کر جھلسا کر مار ڈالتے۔

مرد روئی بھری صدریاں پہنتے جن پر موٹے کپڑے کی قمیصیں اور اُونی سویٹر پھر کوٹ پہنتے اور اُوپر اوورکوٹ جن پر دھسے لپیٹے ہوتے۔ چھتریاں تانے کبھی پنڈی کبھی ساگری، سہالے، روات ادھر گوجر خان، چکوال اور اٹک تک جانوروں کی گاڑیاں بھر بھر لے جاتے اور واپسی پر گندم اور چینی کی بوریاں لاتے۔ کبھی جنگل سے لکڑیاں کٹوا کر چھکڑے لاد گوجر خان اور دینہ کی لکڑ منڈی میں لے جاتے اور گرم کپڑے اور اُون کے گولے بدلے میں لاتے۔

عورتیں پشمینے کی چادریں لپیٹے جانوروں کے کوٹھے صاف کرتیں۔ گھروں میں بھر آیا بارش کا پانی جھاڑو مار مار باہر نکالتیں۔ ہاتھوں پیروں کی پوریں لال نیلی ٹھٹھر کر گل جاتیں۔ باجرہ، مکئی کوٹتیں، چکیاں پیستیں، کانگڑیاں اور انگیٹھیاں دہکاتیں۔ سوں سوں ناک سڑنکتیں، اذانوں کے

وقت چائے کے دیگچے چڑھاتیں، پراٹھے پکاتیں، گیلی لکڑیوں کو پھونکنی سے پھونک پھونک سیروں راکھ لگاتیں، تنوروں پر مکئی جوار باجرے کی روٹیاں پکاتیں۔ اس موسم میں جسے گندم کی روٹی اور دال سبزی کا سالن نصیب ہوتا وہ علاقے کا امیر گھرانہ سمجھا جاتا۔ عام گھرانوں میں ساگ کے گنے چڑھتے جس میں لسی مِلا کر کھٹا سالن پکایا جاتا لیکن جب کوئی سرکاری اہلکار یا مہمان آتا تو پھر دیسی مرغا بھون کر پکتا اور شوربے والا بٹیر یا تیتروں کا سالن الگ بنتا۔ گندم کے آٹے کے چھلکے اور باداموں کھوپرے والا سوجی کا حلوہ بنتا۔ پوٹھوار کی یہ عورتیں مرغ پلاؤ پکانا بھی خوب جانتی تھیں۔ سگھڑسیانی ایسی کہ غریبانہ گزربسر والے گھرانوں میں سے جب خوان پک کر دسترخوان پر سجتے اور حقے تازہ ہوتے، بیٹھکوں میں بستر لگتے تو پنجاب کے جاگیرداروں کی حویلی کے منظر تازہ ہوجاتے۔

اب کی بار سردی معمول سے بڑھ کر پڑی تھی۔ گندم کے پودے زرد رو ہو گئے تھے۔ مونگ پھلی اور مکئی باجرے کی اوسط بھی اس برس کم رہی تھی ابھی چھ مہینے یہی اناج کھانا تھا۔ گندم کی بوری بوری سنبھال کر مہمانوں کے لیے رکھ دی گئی تھی۔ بچھڑوں بکریوں کو پرانے فوجی کوٹوں میں لپیٹنے کے باوجود وہ ٹھٹھر کر مرنے لگے تھے۔ سبزہ چارہ کہرے نے جھلسا دیا تھا۔ جانوروں کی پسلیاں پیٹ میں اُتر گئیں۔ اسہال کی بیماری پھوٹ پڑی۔ روز کوئی چھوٹا بڑا جانور ذبح ہو جاتا اور بے بختو چربی والی بوٹیاں بھون بھون سب کو کھلاتی۔

جھلی میرن دن بھر کسوں میں اور دندیوں پر گراں بھر کے مویشی ہانکتی لیکن منہ مارنے کو نوکیلے پتھروں اور جلی ہوئی گھاس کی جڑوں کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔ کنوؤں میں پانی خشک ہو گئے تھے۔ پتھروں اور مٹی کو کہرے نے جلا کر راکھ رنگا کر دیا تھا۔ لیکن لڑکیوں کے خواب ان جھلسا دینے والی سردیوں میں بھی ہرے بھرے شاداب اور لہلہاتے رہے تھے۔

پہاڑوں کی فصیل کے ادھر قصباتی ریلوے اسٹیشن پر سے جب کوئی تیز رفتار گاڑی گزر جاتی تو جھلی میرن شرما کر جانوروں کے کانوں میں سرگوشیاں کرتی۔

''اج مڑآ سن ٹیلی فون آیا ہے۔ ہندوستان کی قید سے چھٹ آئے ہیں۔''

شکیلہ جان ہر گاڑی کے استقبال کے لیے بوسیدہ زینے چڑھتی اور چھت کی منڈیر سے ہر ہر ڈبے کو گزرتے ہوئے دیکھتی لیکن گاڑی پوری خالی نکلتی۔ اگرچہ ہر ڈبہ کھڑکیوں، دروازوں تک انسانوں سے لبالب چھلک رہا ہوتا۔ عید، شب رات چھت پر بھی مسافر چپکے ہوتے لیکن شکیلہ کے اندر ہوک سی اُٹھتی ''ہر ڈبہ خالی کسی میں کوئی بھی تو نہیں۔ کیوں چلاتے ہیں پھر یہ گاڑیاں، جب کوئی چڑھتا ہی نہیں۔۔۔'' اتنی بھری چھلکتی اُڈتی گاڑی کتنی خالی خالی ہوتی۔ لرزتی ہوئی پٹڑیاں گرم گرم آہیں چھوڑتیں۔

''کدمڑ آسو کیڑی گڈی توں لہسو۔'' (کب لوٹ آؤ گے کس گاڑی سے اُترو گے۔)

کراچی، کوئٹہ سے آنے والی ہر گاڑی یہاں سے گزرتی تھی لیکن وہ گاڑی کبھی نہ آتی۔ جس کے انتظار میں شکیلہ جان کی جان سیٹیاں بجاتی اور ہری جھنڈیاں ہلاتی، سنسناتی دھڑ دھڑاتی، پٹڑیوں پر دوڑتی چلی جاتی۔

''کدمڑ آسو کیڑی گڈی توں لہسو۔''

اگرچہ گراں کے لوگوں نے اپنے سونے جاگنے اور کام کے اوقات انھی گاڑیوں کے آنے جانے کے اوقات سے مربوط کر رکھے تھے۔ اُنھیں خوب معلوم تھا آج تیز رو آدھ گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔ آج تیز گام دس منٹ پہلے گزر گئی۔ آج کوئٹہ ایکسپریس وقت پر نکل گئی اور کراچی میل کو کراس پڑ گیا۔ شکیلہ جان تصوّر کی مکڑی کے مکر جالے میں سے جھانکتی۔

کبھی تو وہ بھری پُری گاڑی اس قصباتی ریلوے اسٹیشن پر آن رُکے گی جس کی ہر بوگی چھلکتی اُڈتی ہو گی۔ قطار و قطار کھڑے ہر ڈبے کے دروازے سے ایک ہی مسافر نکلے گا۔ گارڈ ڈبے سے لے کر انجن تک ایک ہی شبیہ لہرائے گی۔ ''اکبر خاناں اکبر خاناں۔''

جو کبھی لفٹین بھرتی ہو کر گیا تو اب کپتان ہو گیا، پر مڑ کے نہ آیا۔ جس روز کاکول اکیڈمی جانا تھا اُس سے پچھلی رات ہی تو شکیلہ جان سے نکاح کا جوڑ جڑا تھا۔ وہ دِن بھر چوے پر کپڑے کوٹتی رہی تھی۔ ابھی خود نہانے اور تن کے کپڑے دھونے کی باری نہ آئی تھی کہ مختار سہاگ کے گیت گاتا

ہوا کس اُترا۔

''ہائے مری گچھیں پیڑ یئے اُٹھ تہواڑا نکاح اے۔'' (ہائے مر جانیے اُٹھ تیرا نکاح ہے۔)

اور شکیلہ جان جب میلی چادر میں لپٹی اندرونی کوٹھڑی میں بیٹھی تھی تو یہ بھی نہ جانتی تھی کہ نکاح تو ہے مگر کس کے ساتھ اور جب مُلّا نے قبول و ایجاب کروائے تو اکبر خان کے نام پر جیسے روم روم نے سر جھکا کر قبول ہے قبول ہے کی گواہی دی تھی۔ مُلّا کے یہ حرف کانوں سے گزرتے دِل کے پمپ میں بھرتے خون میں گردش کرتے ساری نسوں شریانوں میں دوڑ گئے تھے۔

اُس سال اِتنا کہرا پڑا، اِتنی اہن برسی کہ گندم کی فصل کرنڈ ہوگئی، سبزہ جل کر سیاہ راکھ سی جم گیا، جانور اونے پونے بک گئے یا سوکھے کا شکار ہو کر مر گئے، جن کے دُکھ میں دیہاتی شاعروں نے رِقت آمیز شعر کہے۔ عورتوں نے روزے رکھے قرآن پاک ختم کیے۔ چوے پر کھڑی بکائین منت کی ٹاکیوں سے بھر گئی لیکن ربع صدی میں ایک بار قدرت بہت سے جانداروں کی یکبارگی موت کا یہاں بندوبست کرتی رہتی تھی۔ زلزلہ، سیلاب، چھوت وبا، قحط، اسی لیے تو صدیوں بعد بھی آبادی چند گھرانوں سے نہ بڑھی تھی۔ چشمے سوکھ گئے، کنویں تہہ میں اُتر گئے، ارد گرد کے گراؤں میں بھکا پڑ گئی۔ بس ایک چوا ہی بچا تھا جو دس گراؤں کو پانی پلاتا رہا۔ نہ سوکھا نہ برف بنا، کوسا کوسا (نیم گرم) پانی اہن پالوں میں بھی اُبلتا رہا۔ آج آٹھویں روز جھڑی رُکی تھی اور سونے میں لدی دھوپ دُلہن بنی نکھر آئی تھی۔ سبھی آٹھوں گراؤں کی عورتیں میلے کپڑوں کی پنڈیں باندھ چشمے کے قدموں میں بہتی برساتی جھیل کے کنارے جھاگیں اُڑا رہی تھیں۔ اُوپر لی سطح پر جمی برف کے کانچ کی تہہ سی توڑتیں تو نیچے کوسا کوسا گُنگُنا پانی لہریں مارنے لگتا۔

''ہائے اگر غوثِ پاک کا معجزہ نہ ہوتا تو دُنیا تو پیاسی ہی مر جاتی۔'' چشمے پر سایہ فگن بکائین پر ٹنگے جھنڈوں میں شکیلہ، صنوبر، فاطمہ نے اپنی اپنی منتوں کے بندھے دھاگوں اور دوپٹے کی کترنوں کی دھجیوں کو کھوجا، جن کی مرادیں بر آئیں گی تو پھر وہ ان دھجیوں کو کھول کر سیاہ جھنڈے لہرائیں گی اور بچوں کو حلوہ کھلائیں گی۔

اُوپر تلے تہ در تہ بچھے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں عورتیں ٹانڈوں میں چھپے سنہری سفید بھٹے توڑتی تھیں۔ ہر دانہ سونے کے برابر تھا کہ اگلے تین مہینے اسی اناج کو جسم وجاں کا رِشتہ قائم رکھنا تھا۔ زرد، سفید، کاسنی بھٹوں کے ڈھیر لگے تھے جنھیں خشک ہونے کے بعد موسلوں سے کوٹنا تھا اور دانے الگ کرنے تھے۔

بھٹے توڑتی کوٹتی عورتوں کے سامنے دوپہر کا کھانا رکھا جا رہا تھا۔ ماش اور چنے کی دال پر پیاز کا بگھار لگایا گیا تھا۔ ساتھ شکر کی بھری رکابیاں جن میں گرم دیسی گھی کا تار چھوڑا گیا تھا۔ لسوڑے اور مرچ کے اچار روٹی پر رکھ کھاتی عورتیں پھر تقسیم کے فسادات کی بے رحمی کو لے بیٹھیں۔

''ہائے! پتہ نہیں کب سجن دُشمن ہو گئے۔ ادھر موہڑے، گوڑھے، تھلے، بگے، کرپال، پرتھے، ساگری، روات سکھوں کی کوئی دُکانیں تھیں۔ چھنی عالم شیر میں خزان سنگھ کی ہٹی سب سے بڑی دُکان تھی۔ یاد ہے محمد جان! ہم چھوٹی چھوٹی تھیں۔ پھوپھیوں، چاچیوں کے ساتھ باوا خزان سنگھ کی ہٹی میں جانا، ایسا بھاگوان کبھی خالی ہاتھ واپس نہ آنے دیا۔ جھولی بتاشوں یا مونگ پھلی سے بھرنی اور چنی چولے جوگا کپڑے کا ٹوٹا دے کر ٹورنا۔'' (رخصت کرنا)

محمد جان نے سینے پر ہاتھ مارا۔

''ہائے کوئی فرق ہی نہ تھا۔ ہائے ہندوانیوں کے نمکین تکونے پراٹھے منہ سے نہ اُتریں۔ گائے بھینسیں بیاتیں وہ ہمارے گھروں میں دودھ بوہلی بھیجتے، ہم اُن کے گھروں میں بھجواتے۔ میٹھی روٹیوں کا، پوڑوں اور سالنوں کا تبادلہ کرتے۔ اچار اور مربعے ایک دوسرے کو بھجواتے۔''

چاچی بختو نے گھٹنوں پر زور زور سے ہتھیلیاں پیٹیں۔

''ہائے ہائے ماں کرتارو کا چولہا چوکا! ہائے لشکتا ہوا جیسے چاندی کی کٹوری میں ابرق بھرا ہو۔ روز نیل ملا پوچا پھیرتی، پیتل کی تھالیاں جگر جگر لشکتیں جیسے سونے کے ورق لپیٹے ہوں۔ ہائے ادھر لبانی بنگلے میں انگریز افسروں کے ڈیرے اُترتے۔ ٹائپ کی ہوئی چٹھی پٹواری لے کر گھر آتا لکھا ہوتا۔''

''بیس افسروں کا کھانا بھجوائیں۔ پورے علاقے میں یہ عزت صرف ہمارے گھرانے کو ہی ملتی۔''

رحمت جان نے باجرے کی روٹی پر پگھلتے مکھن میں نوالہ چور کر کے گال پھلالیا۔

''پہاڑی بکرا ذبح ہوتا۔ چنگاتری والا شوربہ بنتا۔ بانگی مرغ بھون کر پکاتیں، ساتھ میوے کھوپے ڈال کر سوجی کا حلوہ بنتا۔ گوروں کے تو منہ سے نہ اُترتا۔ چینی کے برتن، پیلے لال دسترخوان، پانی کی صراحیاں، جھلنے کو گھنگھریوں والے پنکھے، دریاں اور چاندنیاں چھکڑے پر لد کر جاتیں۔ تین تین دِن میزبانی ہوتی، جاتے وقت انگریز (تعریفی سند) چٹھی دے کر جاتے۔۔۔''

عورتیں گاؤں کی تاریخ کے اس موڑ کو زیرِ بحث لاتے ہوئے رِقت آمیز گلوں کے ساتھ سوں سوں ناک سڑ کتیں آنسو پونچھنے لگیں۔

''مونگ پھلی کو مول لگتا، گیہوں کو سنوا لگتا۔ ہائے ہائے بڑی برکتیں! ایک سرسا ہی آٹے کی بیس جنے کھاتے پھر بھی روٹیاں چھکو میں بچ رہتیں۔ مرغیوں کو بھورا ڈالتے، جانوروں کو سانی دیتے۔ مونگ پھلی، گندم، مکئی کے ڈھیروں سے پنج سیریاں بھر بھر دھی دھانیوں کی جھولی میں ڈالتے اناج کبھی کم نہ پڑا۔۔۔''

ہائے بے برکتیاں پڑ گئیں ہو کولوٹی۔۔۔''

عورتوں نے لوہے کے برش جیسی سخت ہتھیلیاں پھر رگڑیں۔

پہاڑی علاقوں کی تیز دھوپ گرم چادروں سویٹروں میں پسینہ بھر رہی تھی۔ سورج سروں پر دھرا تھا۔ جذبات کی شدت سے پالے کے مارے جھلسے ہوئے چہرے انار کی طرح پھوٹے پڑ رہے تھے۔

لالولال انارکلیاں۔

''ہائے لوٹیاں کیا پڑیں برکتیں اُٹھ گئیں۔ نہ اناج میں سواد رہا، نہ زمینوں میں مٹھاس رہی جس مٹی نے ناحق خون پیا ہو اُس کی تاثیر زہریلی ہو جاتی ہے۔ مٹھاس کڑواہٹ بن جاتی ہے جو

اُگتا ہے بے برکت ہو جاتا ہے۔ ہوکولوٹی! میٹھی زمینیں تھور ہو گئیں۔۔۔کنویں سوکھ گئے بارشیں آسمانوں میں کرنڈ ہو گئیں۔ ہائے کیا لہر بہر تھی سب سوکھ سڑ گیا۔''

اب عورتیں پنجے ڈبوڈبو میوے کھوپرے والا حلوہ کھا رہی تھیں۔

''ہائے انگریز کا ویلا! زنانی سیروں سیر سونا مٹکا کر دس کوس اکیلی چلی جائے نہ عزت کا خطرہ نہ مال کی فکر۔۔۔''

''خاندانوں کی عزت تھی۔کمی کمین چوراُچکوں کو جرأت نہ تھی۔فوج میں بڑی ذاتوں کے لوگ بھرتی ہوتے۔انگریز سرکار اپنے درباروں میں خاندانی لوگوں کو کرسی پیش کرتے۔آج ہر کمی کمین ذات بدل کر شہروں میں جا کر عزت دار بن بیٹھا ہے۔ ہائے انگریز بڑی سیانی قوم، ہائے ایسی سست بھائیاں کسی چیز کی کمتی نہ ہوتی۔زنانیاں سونے سے لدی رہتیں۔انبار اناج سے خالی نہ ہوتے۔مارشل ذاتوں کو عزت ملتی۔سیّد، اعوان، راجپوت، پٹھان، پانچویں کسی ذات کو تو وہ منہ نہ لگاتے۔''

بہت نیچے کسوں کے نشیب میں برساتی جھیل کنارے کپڑے دھوتی عورتیں چوے کی سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی تاریخ دُہرا رہی تھیں۔ چہار اطراف گھری اُونچی چوٹیاں کہرے سے ڈھکی تھیں۔ ڈھلانوں پر جھکے پہاڑی کیکر، کیل اور بکائین جیسے سرمئی راکھ میں لپٹے ہوں۔ چاہے آگ لگا دو اُن ڈھینگروں کو، انھی میں سے آئندہ ماہ کونپلیں پھوٹیں گی۔ کہرے پگھلیں گے تو پتھروں کی دراڑوں میں سے روئیدگی پھوٹ نکلے گی۔ اسی چوے کا فیض ہے کہ آٹھ گراں پانی پیتے ہیں۔ چوے والی اُونچی پہاڑی سے گرتے آبشار برساتی نالے اور چوے کے اضافی پانی سب مِل کر جھیل کی شکل میں ادھر نشیبوں میں اُتر جاتے تھے۔جس کے کناروں بیٹھ کر عورتیں کپڑے دھوتیں اور نشیبی بہاؤ میں جانور پانی پیتے۔لڑکیاں پانی پلانے والوں کو نیچی نظروں سے گھُٹ گھُٹ دیکھتیں، اپنے اپنے جوڑ کی سلامتی کی منتیں مانگتیں۔

''آنحضرت غوثِ اعظم کا گزر ایک بار ان کسّوں میں سے ہوا، گرمی اِتنی کہ سارے کنویں چشمے سوکھ نمک ہو گئے۔ پتھر چقماق بن کر آگ اُگلنے لگے۔ کھڑاؤں کے اندر تلوؤں میں چھالے

پڑ گئے۔ پیاس لگی دُور دُور تک نہ پانی نہ آبادی، عصا پتھروں پر جو مارا ہے تو یہ چوا اُبل پڑا۔ پانی پیا پھر ادھر نیچے عصا پھینکا تو یہ جھیل بہہ نکلی۔ وضو کیا، ان جلتے ہوئے پتھروں پر نماز ادا کی تو یہ بکائین اُگ آئی۔ لو وہ دِن اور آج کا دِن، چاہے سارے پوٹھوار کے پانی خشک ہو جائیں۔ ساری جھیلیں چشمے برف بن جائیں، سورج سارے پانی چاٹ لے جائے لیکن یہ چوا یہ جھیل کبھی نہ سوکھے۔''

لڑکیوں نے گھڑے ڈبو کر چوے سے بھرے، جس پر گاؤں والوں نے کوٹھڑی سی بنا دی تھی کہ پانی آلائشوں سے محفوظ رہے۔ پالا کھائی بکائین چوے پر کھڑی منت کے جھنڈوں سے بھری تھی، جسے ہری کالی ٹاکیوں نے ڈھک رکھا تھا۔

''اس گراں میں نہ کبھی کوئی موذی مرض پھیلا نہ بیماریاں لگتیں۔ اسی نوّے سال کے بڈھے بھی ایک سانس میں کسّ چڑھتے اور ہل جوتتے تھے۔ نہ کبھی لڑائی جھگڑا، نہ حسد نہ کینہ، اسی پانی کی برکت سے تو۔۔۔ چھوٹے بچوں کو تو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ سگا ماں باپ کون ہے سارے تائے چاچے مامے، پھوپھڑ باپ بجا۔ جس سے چاہیں شیرینی کا پیسہ دھیلا، آنا دوانی مانگیں۔ جس سے چاہیں سکول کی فیس لے لیں۔۔۔ جس گھر میں چاہیں کھانے پر جا بیٹھیں، جو چیز ضرورت ہو پوچھے بنا اُٹھا لیں۔''

اس گراں کے سارے دس گھرانوں کے کپڑے لتے سودا سلف صوبیدار حکم داد ادھر ساگری یا پھر روات سے خرید کر لاتے۔ گھر گھر جا کر مردوں عورتوں کی گنتی کرتے ضروریات پوچھتے اور فہرست بنا لیتے۔ نہ کبھی کسی نے اعتراض کیا نہ نقص نکالے۔ جب سے ساگری گراں میں جندر لگی تھی، پورے گاؤں کی گندم، باجرے، مکئی کی پسوائی کی ذمہ داری چاچا قیوم کے سپرد تھی۔ سارے گھروں کے لڑکوں کو روات سکول چھوڑنے لانے کا ذمہ تایا امانت خان کا تھا۔ یہاں ہل بیل، گیس لالٹین، بستر بستر بند، بیگ بکسے پلیٹیں، گلاس، بیٹھکیں، ترپال کچھ بھی ذاتی یا نجی نہ تھا سب کا اجتماعی استعمال تھا۔ آج کل قحط سالی کے دِن تھے اسی لیے ماما نذر محمد ہر گھر میں پتہ کرنے جاتے کہیں اناج کی تھوڑ تو نہیں اور جہاں کمی نظر آتی تو ایک ایک بٹھل ہر گھر سے اکٹھا کر کے وہاں چھوڑ کر آتے۔ یہاں بال بچے دھی دھانیاں،

مال ڈنگر فصل کھیت کھلیان خوشی غمی سب سانجھے تھے۔ زمینوں مکانوں کی ملکیت آباؤ اجداد کے نام پر تھی جنھیں مرے بھی آدھی پوّن صدی گزر چکی۔ کبھی ملکیت یا تقسیم کا قضیہ اُٹھا ہی نا تھا کہ بٹوارہ ہوتا۔ اُن کے لیے تو مُلک کا بٹوارہ بھی عجب سانحہ تھا جس کی یاد ابھی تک دِلوں کے چھید بنی ہوئی تھی۔ پہاڑیوں کی جھولیوں میں بچھے آڑھے ٹیڑھے کھیتوں میں عورتیں باجرے کے سٹے کوٹ رہی تھیں۔ ریلوے لائین کے اِدھر پہاڑی سلسلوں پر چڑھتی اُترتی پگڈنڈیوں پر زرینہ جان کا، لے پالک بیٹا انور خان مشکی گھوڑی کی راس پکڑے آٹھ نو ماہ کا بچہ کندھے سے لگائے، چٹے پڑ کی اوٹ سے نمایاں ہوا۔ عورتوں نے زبان کی نوک نکال کر تھو تھو نظر اُتاری۔

''ہائے زرینہ بندیئے! بھر جوانی اس پونگر کے سَر پر کاٹی۔ پیدا تو بھرجائی نے کیا لیکن چھلا یہ نہائی۔ میر حسن تو تھا ہی اکلوتا، ستائیس بیگھے زمین بیوہ کے نام لگی کسی لگتے لانے نے مرلہ بھر نہ بانٹا۔ آپ سرگی ویلے سر پر پگڑ باندھ چاچے تائے کے ساتھ مل ہل جوتتی آپ جھولی باندھ بیج کیرتی۔۔۔''

پہاڑی پگڈنڈی سے کبھی گھوڑے کی گردن پہلے نظر آتی کبھی انور خان کا دراز قد اور سیاہ گھنگھریالے بال لہراتے۔ کبھی شیشہ سی جھلمل پیشانی عکس مارتی عورتیں کام چھوڑ اُسے دیکھنے لگیں، کبھی کوئی چٹان سامنے آ کر پورے منظر کو اپنی اوٹ میں ڈھانپ لیتی۔۔۔

عورتیں چھوڑے ہوئے قصے کا سرا پھر پکڑ بیٹھیں۔

''ہائے کیسے کشٹ سے پالا، سوہنا جوان! پتہ نہیں زرینہ جان نے امام ضامن باندھا کہ نا آپوں پُچھی اچیچا ہنساں سوہنے لال نظری وینے۔۔۔'' (خود خصوصی طور پر جا کر باندھوں گی خوبصورت بچوں کو نظر لگ جاتی ہے۔)

اب گھوڑے کی پُشت نظر آئی۔ نیلے برقعے میں ملبوس انور خان کی دُلہن نے سیاہ نقاب اُلٹی جیسے سنگِ مرمر کی چوٹی سے چڑھتے سورج کی شفق چمکیلی برف کے شیشے سے ٹکراتی ہو۔ عورتوں نے ایک دوسری کے چپے دِیئے۔

''اسی حسن پر تو عاشق ہوا انور خاناں، ورنہ اعوانوں کی کشمیریوں سے کبھی رِشتہ داری ہوئی۔

ایسا جادو ڈالا کشمیرن نے اپنے چناری حسن کا کہ لڑکا زہر کھانے کی دھمکیاں دینے لگا۔ کیا کرتی لے آئی بیاہ کر مجبوراً۔۔۔ چلو اللہ نے پوتے کا منہ دِکھایا۔ ساری جوانی تو روتے گزر گئی۔ اب بڑھاپا تو چین سے گزرے گا نا، لحظ بھر نظروں سے بیٹے کو اوجھل نہیں کرتی۔ لفٹین بھرتی ہو رہا تھا پر فوج میں بھیجنے کا حوصلہ نہ کیا۔۔۔"

عورتوں کے سامنے ادھ کوٹے باجرے کے سٹے بکھرے تھے۔ چڑیا کے آنسوؤں جیسے باجرے کے دانے پستئی رنگ بھوسے سے الگ ہو چکے تھے لیکن ابھی پھٹکنے باقی تھے۔ عورتیں قصہ ختم کر کے پوری طاقت کے ساتھ بچ رہے سٹوں کو کوٹنے پھٹکنے لگیں۔ بھوسے کا غبار سروں کے اُوپر اُوپر گھوم رہا تھا۔

کرانچی تیار کھڑی تھی۔ بیل سامنے جوت دیئے گئے تھے۔ گراں کے دس گھرانوں سے ایک ایک بوری مکئی اور ایک ایک باجرے کی رکھی جا رہی تھی۔ باوا الہراسب یہ اناج جندر پر پسوائی کے لیے لے جا رہا تھا، جب سے پسائی والی مشین ساگری گراں میں لگی تھی۔ گھروں میں چکی پسنے کا رواج کم ہو چلا تھا۔ عورتوں کی ہتھیلیوں اور پوروں پر بنے گٹے اب چھوٹی چھوٹی گرہیں بن کر رہ گئی تھیں۔ اب صرف دالیں اور مرچ نمک ہی چکی پر پیسا جاتا تھا۔ گندم کی بوری بوری ہر گھر میں بچ رہی تھی جو بساکھ کا تک تک آئے گئے کے لیے سنبھال کر رکھنا تھی اور مکئی باجرے پر گزارہ کرنا تھا۔ ان مہینوں میں تو گندم کی روٹی ایسی عیاشی تھی جو علاقے کے امیر امراء کو ہی میسر آ سکتی تھی یا پھر شہری لوگ کھاتے تھے۔

عورتیں سٹوں کے ٹوٹوں پر جڑے رہ گئے دانے انگوٹھے کے پیٹ سے گیر رہی تھیں۔ مرد ترنگلوں سے اناج پھٹک رہے تھے، تبھی فائر کی آواز نے دس گھرانوں کے اس پہاڑی گاؤں کو لرزا دیا۔ اگرچہ یہاں فائرنگ تو معمول کی بات تھی لیکن جنگلی درندوں اور شہری چوروں کو ڈرانے بھگانے کو گاؤں کے ریٹائرڈ فوجی رات کو چھتوں پر چڑھ کر ہوائی فائر کرتے، لیکن یہ گولی دِن کے وقت چلی تھی اور کسی گھر کے اندر سے آواز آئی تھی۔ سب عورتیں مرد کام چھوڑ گولی کی سمت کا تعین کرتے

ہوئے زرینہ جان کے گھر کی طرف دوڑے۔ خود زرینہ جان کسّوں میں دِن بھر کے دھوئے کپڑے جھاڑیوں پر چھوڑ کر پہاڑی پگڈنڈی سے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ رکھ چڑھی۔ کمر گھسیٹتی سارے مجمع میں مِل کر اپنے گھر کے بیرونی دروازے پر پہنچی۔ مردوں کے حلق سے وحشت ناک پکاریں نکلیں۔

''انور خاناں، انور خاناں بوہا کھول۔''

جوابی خاموشی پر زرینہ سمیت عورتوں کا ہیجانی دھکا دروازے کے بیچوں بیچ پڑا۔ دونوں پٹ کھل کر پتھروں سے چنی دیوار میں دائیں بائیں بجے۔ مجمع لرزتے ہوئے دروازے کے اندر چھلکا جس کے ایک پٹ کا قبضہ اُکھڑ گیا اور چوکھاٹ چھوڑ باہر کو جھک گیا تھا، جیسے غم کے مارے کمر دوہری ہوگئی ہو۔ اندر کا منظر مجمع کو ساکت وصامت کر گیا ہر جسم کی رُوح نچڑ کر پتلیوں میں ہانپنے لگی۔

انور خان کے پیر کا انگوٹھا میر حسن کی فوجی بندوق کے ٹرائیگر پہ دبا تھا۔ نالی کنپٹی کی سیدھ میں تھی گولی بھیجے کو چھیدتی ہوئی پچھلی دیوار کے پتھر میں سوراخ کر گئی تھی۔ کنپٹی کے سوراخ میں سے مغز کے دانے دار لوتھڑے قطرہ قطرہ لہو میں لپٹے ٹپکتے تھے۔ پہلو میں لیٹا ہوا بچہ بے تحاشا رو رہا تھا اور اُس کی کشمیرن ماں ہاتھ میں چائے کا کپ پکڑے بت بنی کھڑی تھی۔

واقعہ کی شدت اور دہشت سانسوں کی کھڑکھڑاہٹ میں ہانپتی رہی۔ آخر زرینہ جان کی سِل چٹخی۔

''بولتی کیوں نہیں بیوگی کی چادر لپیٹے چپ کیوں کھڑی ہے۔''

بہو کے ہاتھ سے چائے کا کپ گر کر کانچ زرینہ جان کے پیروں پر ٹوٹا۔ ایک ٹکڑا اُڑ کر لڑکی کی پیشانی میں چُبھا، لہو کا قطرہ آنسو سا اُبھرا۔ ''مجھے نہیں پتہ۔۔۔''

لڑکی چلاتی ہوئی کمرے سے نکلنے لگی۔ عورتوں نے جکڑ لیا ہیجانی لفظوں کا ریلا چھٹپٹاتے حلق سے یکبارگی بہہ نکلا۔

''مجھے کچھ پتہ نہیں، گھر پہنچتے ہی کہنے لگے جاؤ، چائے بنا کر لاؤ۔ میں نے کہا، نِکا (چھوٹا) میری گود میں سو رہا ہے، بولے اِسے میرے پاس لٹا جاؤ۔ میں چائے کا کپ لے کر رسوئی سے نکلی ہی

تھی کہ فائر۔۔۔"
عورتوں نے دونوں بازوؤں کو فضا میں لہرا کر بین کھینچا۔ آندھی سی جھلی۔
"ہائے ظلمی فائر۔۔۔ ہائے انورخاناں! جیسے کابل کا پٹھان، جیسے عرب کا شہزادہ، جیسے پوٹھوار کا گہنا۔ پہاڑوں کا سنگھار ہائے ابھی ابھی۔۔۔ ابھی تو پیروں کے نشان بھی نہ مٹے تھے۔۔۔ ابھی تو گھوڑے کے کھروں کی مٹی بھی نہ جھڑی تھی۔۔۔ پتہ ہوتا۔۔۔ ہائے پتہ ہوتا۔ وہیں روک لیتی۔ ہائے ایک قدم نہ آگے بڑھنے دیتی۔۔۔ گھوڑے کے سموں سے لپٹ جاتی۔۔۔ ہائے انورخاناں۔۔۔ ہائے لوٹی! انورخاناں۔۔۔"
عورتوں نے منہ سر پیٹے، رانیں اور سینے چانٹے مار مار اُدھیڑ ڈالے۔ جیسے ہر ایک کے جگر کی بوٹیاں آنسوؤں، چیخوں اور بینوں کے ساتھ باہر کو اُبل رہی ہوں۔ سامنے پڑا نوجوان لاشہ ابھی گرم خون اُگلتا تھا، لیکن نبضیں ٹھہر گئی تھیں اور آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں جیسے کسی حیرت ناک وقوعہ کی چشم دید گواہ ہوں۔ خون ابھی بھی سرسائیاں بھر بھر اُبل رہا تھا۔ ناک، منہ اور کنپٹی کے سوراخ سے دماغ کے لوتھڑے باہر بہہ رہے تھے۔
چہار اطراف سے مقانیں اُمڈ کر آئیں۔ عورتوں کے بین، کس، پہاڑ، چوٹیاں کھائیاں پاٹتے رہے۔ اناج کے ڈھیر لومڑ گیدڑ پھرولتے رہے۔ رکھوالے کتے بھونک بھونک کر خطرے کے سائرن بجاتے رہے لیکن آج عورتوں کے بین ہر آواز کو لپیٹ لے گئے تھے اور پتھر دِل مردوں کو بھی دھاڑ ودھاڑ رولا گئے تھے۔ انورخان کی حسین جوانی اور المناک موت کے واقعات کو فی البدیہہ حزنیہ قافیہ پیائی کو اُونچی اور لمبی لے میں پروتی ہوئی عورتوں کو یکبارگی خیال آیا کہ انورخان کی دلہن کا کاجل تو ابھی جوں کا توں چیرویں آنکھوں میں سیاہ دھاریاں کھینچے ہوئے ہے۔ کالے چمکیلے بالوں کی ٹیڑھی مانگ میں سے ایک بال نہیں بگڑا۔ سر پر گلابی شفعون کا دوپٹہ اور تلے والی سیاہ پشمینے کی چادر کندھوں پر ابھی لپٹی ہے۔ جس میں سے گلابی شنیل کے جوڑے پر سنہری دبکے کناری کا کام جھلک رہا ہے۔ عورتوں کے بینوں کو دوسری سمت ملی۔

''ہائے کرماں سڑی! تیرا تو چیلے کپڑے گہنے لتے کا چاؤ بھی ابھی نہ اُترا تھا۔ ہائے رنڈاپے کی چٹی چادر ڈالو سر پر، ہائے لال چوڑا تو بٹہ مار کے توڑو، گلابی پراندہ کھول بال بکھیرو۔ اب ساری حیاتی نہ پہنے گی نہ سجے سنورے گی۔''

عورتوں نے سونے کی چھ چوڑیاں کھینچ اُتاریں۔ کانچ کی چوڑیاں مُٹھی کا دباؤ دے کر توڑیں۔ دُودھیا ٹیوبوں سی کلائیوں پر چوڑیوں کا سنہرا خراشوں میں سے اُبھرنے والے خون کی بوندوں میں چمکنے لگا۔ کانوں کے مگھر (آویزے) کھینچ لیے۔ شفعون کا دوپٹہ اُتار سفید ململ کی چادر سَر پر ڈالی۔ سیاہ بال آندھی سے بکھر گئے۔ مٹھیاں بھر بھر چولہے کی راکھ مانگ میں اُنڈیلی اور لمبے کرب ناک بینوں سے چہار اطراف پھیلے پہاڑی سلسلوں کے سینے شق ہو گئے۔ جننیوں نے بین سے بین ملایا سارے نشیب آہوں، کراہوں سے گونجنے لگے۔

پوٹھوار کے میت بھی پہاڑی علاقوں کے جفاکش افراد کی طرح ہی پُرمشقت اور طویل ہوتے ہیں۔ پورے چالیس دیہاڑے پُھوڑی پڑی رہی۔ ہر روز ادھر سا گری، روات، پنڈی، گوجر خان ادھر جہلم، چکوال، اٹک تک سے مقانیں (تعزیتیں) آتیں اور تین تین گھنٹے جم کر ماتم کیا جاتا۔ منہ سے چادریں ہٹا کر ابھی سوجی ہوئی آنکھیں پونچھتیں کہ پھر کوئی مقان آن پہنچتی۔ رانیں اور سینے پیٹ پیٹ چِھد گئے۔ منہ سر کوٹتے ہوئے اُنگلیاں چبھ چبھ آنکھیں باہر اُبل آئیں۔ آنسو بہا بہا پلکیں جھڑ گئیں۔ بین ڈال ڈال حلق بیٹھ گئے لیکن ماتم تھا کہ چالیس دیہاڑے یوں برپا رہا جیسے انور خان کی خون اُبلتی لاش ابھی سامنے پڑی ہو۔ جس کے منہ ناک سے مغز کے لوتھڑے چھٹتے ہوں۔ دِن بھر چائے کے دیگچے چڑھے رہتے۔ روزانہ دو بکرے ذبح ہوتے۔ گراں کی عورتیں خود دیگیں پکاتیں، لوح پر پک کر سینکڑوں روٹیاں اُترتیں۔ اردگرد کے گراؤں کے مختلف گھرانوں سے باری باری سوکھی روٹی کا سامان بیل گاڑی پر لد کر آتا۔ جمعراتیں ہوتیں، چالیسویں پر بڑا کھانا ہوا اور پھوڑی اُٹھا دی گئی لیکن مقانیں پھر بھی آتی رہیں پھر پھوڑی بچھتی عورتیں چار پانچ گھنٹے پھر مِل کر روز روتیں اور شب بھر ڈونگھے لڑ، کی جننیاں انہی بینوں کی بازگشت سے طویل و

عریض نشیبوں کو سجائے رکھتیں۔ قریب کے گراؤں کی عورتیں دِن میں دو بار ضرور پھوڑی پر آ کر گھٹنوں بیٹھتیں اور ایک دوسری کے گلے لگ حزنیہ شاعری جیسے بین ڈالتیں۔ یہ فی البدیہہ پُرسوز بین سننے والیوں کو آنسوؤں، آہوں، کراہوں میں ڈبو دیتے۔ عدت کے بعد انور خان کی بیوہ اپنے میکے ملنے کو گئی، تبھی پہاڑوں کے سینے دہلا دینے والی خبر نکلی جسے سن کر ڈونگھے لڑ میں بیوہ جننیاں بھی حیرت کی تصویر بنی عورت ذات کی بے وفائی پر چیخنے کرلانے لگیں۔

'انور خان کی بیوہ نے اپنے چچیرے سے نکاح کر لیا۔ شادی سے پہلے ہی اس کے ساتھ ماڑی تھی۔'' اُس روز زرینہ جان کے گھر پھر پھوڑی بچھی پورے آٹھ گراؤں کی عورتیں ململ کے سفید دوپٹے سر پر ڈال کر آئیں اور لمبے لمبے کرب ناک سروں میں بین الاپے۔

''ہائے ظلمی! سارے پوٹھوار میں نہ کبھی سنا نہ تکا، زنانی جس نام لگی اُسی کی ہو مری۔۔۔ ہائے پتہ نہیں انور خانے نے کس حال میں دیکھی کہ آپ ہی کو گولی مار مرا گولی کے لائق تو یہ کنجری تھی۔ ہائے متھے کی کالک۔۔۔ ہائے لُچی، لال کُرتی کی کنجری۔۔۔''

جیسے یہ کالک عورت ذات کے منہ پر مَلی گئی ہو۔ یہ تو وہ وسیب تھا جہاں میاں بیوی کبھی دِن کی روشنی میں بات کرتے نہ دیکھے گئے تھے۔ مرد زنانہ حصے میں کبھی مجبوراً آتے بھی تو ڈیوڑھی میں کھنگورا مار کر پہلے مطلع کرتے۔ سردیوں میں باہر بیٹھک میں سوتے اور گرمیوں میں اُوپر چھتوں پر بستر بچھتے، گھروں کے اندر مردوں کے رہنے کا کوئی رواج ہی نہ تھا۔ بڑے بھاپا جی فوج سے چھٹی پر آتے تو بھی کبھی گھر کے اندر داخل نہ ہوتے۔ اپنے تین بیٹوں اور بیٹی عندلیب کو پیار کرتے بھی شرماتے اور بڑی بھابھی زینت آج بھی اُنھیں دیکھ کر یوں لجا جاتی جیسے شرم کا گھونگھٹ اُٹھے ابھی سہاگ کی پہلی رات ہی گزری ہو۔ پتہ نہیں یہ چار بچے کس خوف، چوری اور جلد بازی کے سربستہ راز تھے یہاں بیویاں شوہروں کی قبروں سے تو لپٹ کر رو لیتیں لیکن جیتے جاگتے شوہر کی طرف دیکھنا بھی بے شرمی کی بات تھا لیکن یہ کشمیرن۔۔۔ ایسا قہر ڈھایا، ایسا ظلم کمایا، کہ ابھی تو زرینہ جان کے بچے کا کفن بھی میلا نہ ہوا تھا۔ ابھی تو رونے والیوں کے آنسو بھی خشک نہ ہوئے

تھے ابھی تو بینوں کے آخری حرفوں کی بازگشت پہاڑوں میں گونجتی تھی ۔ ابھی تو جننیوں کے پر سے نہ تھمے تھے ابھی تو زرینہ جان کے نوحوں سے پہاڑوں کے سینے چھدر ہے تھے جہاں عورت بس اِک نام کی پھلی میں گری سی بند ہو جاتی تھی ۔ اُس رہتل میں کشمیرن کی یہ نقب کیسے لگ گئی ۔ عورتیں سطح مرتفع پوٹھوار کے پہاڑی سلسلوں کی طرح ساکت رہ گئیں ۔

اُن دِنوں گندم کی بالیاں رنگ بدل رہی تھیں ۔ دودھی دانہ سنہرے پردوں میں سکڑ گیا تھا ۔ جنگلی سبزیوں کی بیلیں پہاڑی کیکروں بکائنوں کو چڑھ رہی تھیں ۔ کسوں نشیبوں میں خودرو خربوزے اور تربوز وٹوں کی طرح پڑے تھے ۔ ان دیکھی چوٹیوں سے برفیلے پانی پگھل کر کبھی سبجے کبھی پُرشور اُتر رہے تھے ۔ پگڈنڈیاں آبشاریں بن بہنے لگی تھیں ۔ چشمے اور برساتی ندی نالے بھر گئے ۔ مچھلیاں سطح آب پر مچلنے لگیں ۔ سبز ٹانگوں والے سیر سیر بھر کے مینڈک کناروں پر اُچھلنے پھدکنے لگے ۔ بے منہ سر والی جونکیں بھینسوں کے تھنوں سے چمٹنے اور لہو چوسنے لگیں ۔ چٹانوں سے چپکی سوکھی پھلائیاں اور دھریکیں سرسبز ہو گئی تھیں ۔ پتھروں کی دراڑوں سے پودے پھوٹ نکلے ۔ چٹانوں پر جمی کائی سبز مخمل سی دبیز گھاس بن گئی ۔ بیریوں کو بور لگ گیا ۔ پھلاہیوں کی جڑیں کھود کر چوہنگیں نکال عورتوں نے سالن پکائے ۔ خودرو جنگلی کریلے توری کدو پیلے پیلے پھولوں سے بھری بیلیں کسوں میں پھیلیں اور پگڈنڈیوں ڈھلانوں کا سنگھار بن گئیں ۔

بہار کا موسم رنگ برنگ جنگلی پھولوں میں نکھر کر سارے پہاڑی سلسلوں اور کسّوں پگڈنڈیوں پر بچھ گیا جیسے ہر شئے پر پھولدار چھینٹ کی چادر ڈھک دی گئی ہو ۔ کچے اور پتھریلی سِلوں سے بنے مکانوں کو عورتیں چکنی مٹی میں گوبر مِلا کر لیپنے لگیں تنوروں کو نئے مٹھ لگے اور تپا کر مٹھّیاں پکائی گئیں ۔ میوے کھوپرے ڈال کر گڑ کے شربت میں گندھے سخت آٹے کی یہ روٹیاں رات بھر انگاروں کی ہلکی آنچ پر تنور کے اندر پکتیں اگلی صبح اُتار کر ہر گھر میں دو دو میٹھی روٹیاں تحفتاً بھیجی جاتیں ، بدلے میں اُن گھرانوں سے بھی یہی سوغات آتی ۔

اظہار الحق امتحان دینے پنڈی شہر چلا گیا دو بیگھ میں چھتری کیے کھڑا بیری کا درخت سرخ

موتیوں سے بھراسُو ناہوگیا۔جس پر فاختائیں، چڑیاں گھونسلے بنانے لگیں۔فاطمہ جان ان کی چوں چوں میں، دُختے موسموں میں، بھاپ چھوڑتی دھرتی کے دم میں لگی دِن بھر بیر چنتی۔بیری کے ٹہنوں پہ جھولتے پرندے برہا کے پرسوز گیت چھیڑتے۔چرند پرند خود اپنے ہی وجود میں سے پھوٹ نکلے۔فاطمہ بیری کے گھنیرے سایے میں چھپی پکے بیروں جیسے عنابی آنسو بہاتی، جھولی لالولال بیروں سے بھرتی رہتی۔

آ کھاں کہ نہ آ کھاں پکیاں خان پورے نیاں نا کھاں

لمیاں ڈوراں ماہی نا باز بنیرے تے

کلعام ریلوے اسٹیشن سے گزرتی ریل گاڑیوں کے موسمِ گرما کے اوقات کار شروع ہو چکے تھے۔شکیلہ جان کے دِل کے پنڈولم میں لرزتی سوئیاں آپ ہی آپ نئے نظامِ اوقات کے مطابق وقت تبدیل کر گئی تھیں۔چھک چھک چھک چھک گاڑیاں وجود کی پٹڑیوں پر سے کانٹے بدلتیں۔دِل کی دھخ دھخ میں سیٹیاں بجاتیں۔دھویں دخاتی گزرتی رہیں۔سرخ مٹی اور زرد پتھریلی چوٹیوں پر بس لکیریں چھوڑ جاتیں۔

چوے پر کپڑے دھوتی لڑکیاں آخر میں جب اپنے تن کے کپڑے اُتار کر دھوتیں تو اُنگلیوں میں پڑی منگنی کی چھاپ کو صابن مَل مَل صاف کرتیں۔ہونٹوں سے لگاتیں تو صنوبر خالی اُنگلی ہی چوم لیتی۔۔جس میں پڑی تصوراتی چھاپ کو وہ کتنے برسوں سے مانجھ مانجھ چمکا رہی تھی۔ تبھی اصغر خان کی ہانک اس کے پورے وجود پر چھاپ بن کندہ ہو جاتی۔

''بیبیو چیلا کرو۔ڈنگروں کو پانی پلانا ہے۔'' عورتیں خود کو ڈھکنے لگتیں۔صنوبر کے وجود کے تار جھنجھنا اُٹھتے۔

''لنگھ آوَ۔''

چھی او چھی۔پیاسے جانور پانی پیتے تو جھیل کے کنارے سمٹنے لگتے۔

''چھی او چھی۔''

لڑکیاں پانی پلانے والے نوجوانوں کی ''چھی او چھی'' کی صداؤں کے ساتھ چوے کے

پانیوں میں سے گھڑے ڈبو ڈبو بھرتیں۔ تین تین گھڑے سروں پر ایک ایک کو لہے کی ہڈی پر جمائے سانپ کے لہریے سی پہاڑی پگڈنڈیاں چڑھتیں، اُترتیں۔ بھاری شلواروں اور لمبی قمیصوں والے نوجوان کبھی سر اُٹھا کر اُنھیں نہ دیکھتے۔ جن کے نینوں کی محرابوں میں جلتے دِیئے انھی ناموں کے تیل سے مچ مچاتے تھے لیکن خود اُن تک شاید کوئی سینک ہی نہ پہنچتا تھا، یا شاید دِل کی یہ آگ صرف عورت ذات کی خلقی مجبوری ہے۔ برھا کی ماری بنا چھاپ کی اُنگلی مسلتی فاطمہ بیری کے یاقوت جڑے پیڑ کے سایے میں ہونکتی دھوپ جلاتی سایہ ٹھٹھراتا عجب بے اعتبار اموسم۔

اُن دِنوں گندم کی گاہی ہو رہی تھی سجے ہوئے جیوٹ اور پنجالیوں والے بیلوں کی جوڑیاں اکٹھی ہوئی تھیں۔ موہڑے۔۔۔ گوڑھے، تھلے، بگے، پرتھے، کرپال، پھڈے بیسوؤں گراؤں سے بہترین بیل آئے تھے اور ڈھول اور گھنگھروؤں کی آواز پر پڑ (کھلیان) گھاہ رہے تھے۔ بزرگ سروں پر مشہدی لُنگیاں اور قراقلی ٹوپیاں جمائے پھلاہیوں دھریکوں کی چھاؤں میں بیٹھے بیلوں اور نوجوانوں کو ہلاشیری دیتے تھے۔ بچے اور نوجوان کھڑاؤں اور فوجی بوٹ پہنے کھلیان پر دائروں میں گھومتے تھے۔ ہر گھرانے میں کوئی نہ کوئی فرد فوج میں رہ چکا تھا۔ اس لیے فوجی بندوق، فوجی بوٹ اور جیکٹ ہر گھرانے کا اعزاز تھا۔ ہر گھر کے صفے یعنی بڑے کمرے میں کھونٹیوں یا کیلوں سے سجاوٹوں کی طرح یہ اعزازات سجے رہتے تھے۔

کئی دِن لگا کر گاہی کے لیے یہ چبوترہ بنایا گیا تھا۔ ماشکی پانی کی مشکیں بھر بھر ڈالتا جاتا مرد کسیوں سے مٹی کا ڈھیر ہموار کرتے، عورتیں ہاتھوں سے یا گرمالے سے انھیں لیپتیں۔ اب اسی چبوترے پر بچھے گیہوں کو آنکھوں پر چڑھے کھوپوں والے بیل دائروں میں گھوم گھوم گاہ رہے تھے۔ پنجالیوں کے رسے پکڑے اُن کے مالک منہ سے بیلوں کو سمجھ آنے والی آوازیں نکالتے، اُنھیں مزید تیز چلنے پر اُکسا رہے تھے۔ ڈھول کی آواز اُسی رفتار سے بڑھ رہی تھی۔ گندم کی بالیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ دانے سنہری پردوں سے باہر نکل رہے تھے۔ سٹہ چور چور ہو کر بھوسہ بن رہا تھا۔ سونا رنگ دانوں کے ڈھیر چڑھ رہے تھے تبھی ڈاکیا وہ چٹھی لایا تھا جس نے گراں کے ہر گھر میں صفِ ماتم بچھا

دی تھی۔اُس وقت اناج کی گاہی کرنے والوں کے لیے دوپہر کا کھانا تیار تھا دو بکرے ذبح ہوئے تھے۔عورتیں دس دس کلو والے دیگچے دیسی گھی کی تری والے مرچیلے شوربے کے پکا چکی تھیں۔حلوے کی کڑاہیاں بنا بنا کھجور کے پتوں سے بُنی پھوڑیوں پر اوندھا رہی تھیں۔لسی کی چاٹیاں ٹھنڈا یخ چوے کا پانی ڈال اور نمک کھور کر گھڑونجیوں پر دھری تھیں۔لوح پر پھلکے پک رہے تھے۔مرد کھانا کھا چکے تھے اب عورتوں کی باری تھی کہ سارا میلہ اُجڑ گیا۔اگرچہ پھوڑی تو نہ پڑی لیکن بین ڈالتی آٹھ گراؤں کی عورتیں شکیلہ جان کے گھر میں اکٹھی ہوئیں اور شکیلہ جان کی ماں کے گلے لگ لمبے لمبے بین کھینچے، جیسے لفافے میں بند ہو کر شکیلہ جان کی طلاق نہ آئی ہو بلکہ میّت پہنچی ہو۔

صوبیدار حکم داد اپنی فوجی بندوق کی طرف جھپٹا جیسے کپتان اکبر خان سامنے کھڑا ہو اور ہواؤں، فضاؤں کو گولیوں سے چھیدنے لگا۔لیکن کوئی درندہ یا ڈاکو سامنے ہوتا تو مرتا پھر وہ کارتوسوں والی پیٹی اچکن کے نیچے لگا اور بندوق کندھے پر ڈال کیپٹن اکبر خان کی پلاٹون کوئٹہ چھاؤنی میں پہنچا لیکن وہ تو اپنی پوسٹنگ سعودی عرب کروا کر اپنی نئی نویلی دُلہن اپنے بڑے افسر کی بیٹی کے ہمراہ جا بھی چکا تھا۔جانے سے پہلے طلاق بھجوا گیا تھا اور اپنے ساتھیوں کو پیغام دے گیا تھا کہ میرے پیچھے سے اگر آئیں تو میری طرف سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا اور کہنا کہ میں مجبور تھا۔ اَن پڑھ دیہاتی لڑکی کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا۔اگرچہ اُس کا قصور نہیں لیکن اُسے میرا نام دینے والوں کا قصور ضرور ہے۔اسی لیے پہلے طلاق بھیجی ہے کہ وہ میرے نام پر نہ بیٹھی رہے۔اُس کی کہیں اور شادی کر دیں لیکن کیا یہ اِتنا ہی آسان تھا۔شکیلہ جان جس تسبیح کے دانوں پر عمر بھر اکبر خاناں اکبر خاناں کی پوریں ثبت کرتی رہی۔انتظار والی ریل گاڑی کی چھک چھک پر سدا بجتی رہی۔ گارڈ ڈبے میں لہراتی جھنڈی کی طرح ایک ہی نام پر پھریریاں کھاتی رہی تھی۔ریل گاڑی کی سیٹیوں کی بانسری کی لے سے بندھی انتظار کے زِینے چڑھتی اُترتی رہی تھی۔کوک کی گراری یکدم کیسے ختم ہو سکتی تھی۔وہ اب بھی ہر گاڑی کی آواز کے ساتھ ناہموار زِینے بے اختیار چڑھ جاتی اور لبالب بھری لیکن خالی خولی گاڑیاں دیکھتی، جو اس قصباتی اسٹیشن پر کبھی نہ رُکتی تھیں۔سوائے اس

کے کہ کراس پڑ جائے یا انجن فیل ہو جائے۔لیکن انتظار والی گاڑی کا انجن کبھی فیل نہ ہوا۔وہ دھویں چھوڑتی سیٹیاں بجاتی چھک چھک گزرتی رہی۔عمریں اور صدیاں لد گئیں نہ گاڑیوں نے گزرنا چھوڑا نہ انتظار نے سانس توڑا۔ بنا گنتی کے بنا حساب شمار کے برھا کا گیت دھک دھک بجتا رہا۔

''کدمڑسو کیڑی گڈی توں لہسو۔''

آڑی ترچھی پٹڑیوں کی طرح بدن کی وریدیں دھواں چھوڑتی سنسناتی رہ گئیں، جن پر سے تیز رفتار گاڑیاں زن زتین سن گزرتی چلی جاتی تھیں لیکن کبھی کسی کو بھی کراس نہ پڑا۔ پوٹھوار کے شدید ٹھٹھرے موسموں نے، بہار کے رنگین پھولوں نے، برستی بارشوں، اُترتی آبشاروں، اُبلتے چشموں نے، جھیل کے پانیوں بکائین کے جھنڈ اور ڈونگھے لڑ، کی جننیوں نے کس کس نے شکیلہ جان کے ساتھ مِل کر ایک ہی نام کا برسوں وِردنہ کیا تھا۔سارا جغرافیہ ساری زبانیں سب بولیاں یکدم اپنی ہیئتِ ترکیبی بدل کیسے سکتے تھے۔انتظار کی کہنہ مشق ریاضت کیسے چھوٹ سکتی تھی۔رانجھا رانجھا کردی نی میں آپوں رانجھا ہوئی۔

صوبیدار حکم داد اپنی بارہ بور کی بندوق کھونٹی سے اُتارتے اور ہر گزرتی گاڑی پر فائر کھول دیتے جیسے ہر ڈبے میں اکبر خان چھپا بیٹھا ہو لیکن فائر درمیانی پہاڑی سلسلوں میں بازگشت چھوڑتے بے ہدف رہ جاتے۔اس گاؤں کی تاریخ میں قدرت کی ستم ظریفی کے تو کئی واقعے موجود تھے لیکن بے وفائی اور حکم عدولی کا یہ انوکھا واقعہ تھا۔چلو کشمیرن تو اس خاندان کی تھی ہی نہیں لیکن یہ اکبر خاناں تو اسی مٹی کا جنا پلا تھا جس کی سرشت میں تابع فرمائی، وفا شعاری اور قربانی والا خمیر گندھا تھا۔صوبیدار حکم داد حیران تھے اِن کے خون میں یہ ملاوٹ کیسے ہوگئی۔

زرینہ جان میر حسن کی قبر سے لگی اُس سے پوچھتی تھی:

''ہائے کوئی زنانی ہیڈی وی بے وفا ہوسی، ایسا تو کنجریاں کرتی ہیں۔ہائے لوٹی۔ہو کو لوٹی!''

زرینہ جان بیٹے کی موت کا صدمہ تو شاید جھیل جاتی لیکن کوئی عورت یوں بے وفا بھی ہو سکتی ہے یہ تو اُس کی زندگی کے فلسفے اُس کی دانش کے خمیر ہی سے میل نہ کھاتا تھا۔

شکیلہ جان روز صبح پورے خاندان کے کپڑوں کی پنڈیں سر پر رکھتی اور کس اُتر جاتی اور برساتی جھیل کنارے تھاپے کی دھمک بجتی رہتی۔

''کدمڑسو کیہڑی گڈی توں لہسو۔'' ڈونگھے لڑ، کی جننیاں آواز سے پُرسوز آواز ملاتیں۔

''کدمڑسو کیہڑی گڈی توں لہسو''

پہاڑی سلسلے کے پیچھے ریلوے لائین پر سے گاڑیاں دھڑک دھڑک گزرتی رہتیں۔ ہر گاڑی کی سیٹیوں کے رِدھم میں تھاپے کی دھمک تیز تر ہو جاتی۔۔۔اب کوئی لڑکی اُسے اکبر خان کے نام سے نہ چھیڑتی۔ جیسے اکبر خان نام نہ ہو کوئی دُکھتا ہوا گم پھوڑا ہو جو شکیلہ جان کی جلد پھاڑ کر باہر نکل آیا ہو۔ جس کی کینچوے سی جڑیں سارے وجود میں پھیلی ہوں، جہاں سے بھی چٹکی بھرو پیپ اور لہو مانس اور گند ہاتھ میں آ جائے لیکن جڑیں اندر ہی اندر پھیلتی مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہوں۔

دیگر ویلا (عصر کا وقت) تھا جب ڈاکیا پارسل لے کر آیا۔

گندم کا ڈھیر تیار تھا اب بوریاں بھرنی تھیں۔ دھی دھانیوں کو پنج پنج سیریاں بھر کر دے دی گئی تھیں۔ بیواؤں، یتیموں کمی کاری کا حصہ بھی نکال دیا گیا تھا۔ اب دسترخوان پر سہ پہر کا کھانا سجا تھا۔ آلوانڈوں کا سالن اور شکر بھری رکابیوں میں گرم دیسی گھی کا تار چھوڑ دیا گیا تھا۔ اچار کے مرتبانوں کے ڈھکن اُٹھا دیئے گئے تھے۔ دیسی گھی میں تلے پراٹھے گرم گرم اُتر رہے تھے۔ چائے کے دیگچے اُبل رہے تھے۔ ڈاکیے کو بھی شریکِ طعام کیا گیا۔ دو بٹھل گندم کے بھر کر اس کے جھولے میں ڈالے، تب ڈاکیے نے جھولے میں سے پارسل نکال کر صوبیدار حکم داد کے سامنے کاغذ قلم رکھ دیا۔

''صوبیدار جی! ست ست مبارکاں۔ اللہ کے گھر سے بیٹے نے تحفہ بھیجا ہے۔ مکہ مدینے کی پاک زمین سے آیا پارسل چوم کر وصول کریں۔''

صوبیدار حکم داد کو لگا گندم کے ڈھیر کے سینے میں سے دھوئیں کا غبار نکلا ہے اور آتشیں لاوے کی طرح پوری فضا کو لپیٹ گیا ہے۔ بڑ کے درخت کے سائے تلے بچھی چارپائی پر پڑی فوجی بندوق اُٹھانے کو وہ لپکا تو فوجی بوٹوں تلے گندم کے خشک ناڑ چڑچڑا کر چورا ہو گئے۔

محمد جان نے ڈاکیے سے پارسل جھپٹ کر بغل میں چھپالیا۔ ڈاکیا خطرے کی بو محسوس کر کے قلم کان پر دھر نکل لیا۔

مرد صوبیدار حکم داد کو تو مضبوط گرفت میں جکڑ کر بیٹھک میں لے گئے جو فضاؤں ہواؤں کو واہی تباہی بک رہا تھا اور مردوں کی گرفت سے چھٹ چھٹ انجانے دُشمن پر حملہ آور ہو رہا تھا اور عورتیں چور نظروں سے محمد جان کی بغل میں چھپے پارسل کو حسرت سے دیکھنے لگیں جو مکہ مدینے کی، پاک زمینوں سے آیا تھا۔ چاچی بختو نے آنکھوں سے پوریں مَس کر کے منہ سے پٹاخے بجائے۔ درود شریف کا وِرد کرتے نسوار زدہ دانتوں کے خلا سے پھونکنی سی آہ چھٹی۔

''ہائے کیا پتہ خانہ کعبہ کی خاک کا کوئی ذرہ اُڑ کر اس پر لگا ہو۔۔۔''

محمد جان تو خانہ کعبہ کی سرزمین سے آئے ان ریشمی کپڑوں کو چوم چوم کر عورتوں کو دکھانے لگی، جیسے یہ کعبہ شریف کے غلاف کی پاک کترنیں ہوں اور وہ تصویر بھی جس میں بہو بیٹا کھڑے مسکرا رہے تھے اور عقب میں روضۂ نبوی کے گنبد اور سبز جالیاں ہویدا تھے۔ آٹھ گراؤں کی عورتیں وضو کر کے دونوں ہاتھوں پر چادر کا پلّو لپیٹ کر اور بسم اللہ پڑھ کر تصویر رکھواتیں اور چوم چوم کر آنسوؤں سے پلّو گیلا کر لیتیں پھر آنسوؤں کے دِیپ جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ محمد جان کو مبارک باد پیش کرتیں۔

''محمد جان تو بڑے نصیب والی! یہ شہادت سے بھی بڑا درجہ ہے۔ کرماں آلیے اللہ اللہ کہاں مدینہ پاک جی کہاں خانہ کعبہ شریف جی کہاں خاکِ پا کی چٹکی محمد جان۔۔۔ تو دونوں جہانوں سرخرو ہوئی۔''

''محمد جان تو بخشی گئی یہ مکہ مدینے کا لباس پہنے گی تو ساتوں پانیوں نہا کر پاک ہو جائے گی۔ اللہ ایسا بیٹا ہر کسی کے نصیب میں کر۔۔۔''

شکیلہ جان نے بھی یہ تصویر دونوں ہتھیلیوں پر رکھوا کر تر آنکھوں کی دُھندلاہٹ میں دیکھی جیسے سبز مقدس کپڑے سے ڈھکی رحل پر قرآن پاک رکھ پڑھتی ہو اور ڈرتی ہو کہ کہیں آنسو کا کوئی

گرم قطرہ قرآن پاک کی سطح کو میلا نہ کر دے۔

مسیتی پڑھنی آں قاعدہ

نکی عمراں اِچ پے گیا وعدہ

تے کدوں نکھٹسیں

مسیتی پڑھنی آں قرآن

میرا کڑیاں وچ دھیان

تے سبق نہ آوے۔۔۔

صوبیدار حکم داد بیٹے کا پارسل بھیجنا تو شاید برداشت کر جاتے لیکن یہ دبی گھٹی محمد جان جو پچھلے تیس برس تک صوبیدار حکم داد کے گھنیرے پیڑ تلے چوہنگ سی دبی پڑی رہی اُس کے اندر سے یہ کوئی اَل سی پھوٹ نکلی تھی جو کپتان اکبر خان کی ماں تھی بیٹے کی کمائی پر اِتراتی ہوئی عمر میں پہلی بار گھمنڈ کے جذبے سے سرشار ہوئی۔صوبیدار حکم داد تو بڑھ کر حملہ کرنا، پیچھے ہٹ کر دفاع کرنا جانتا تھا۔ یہ دومونہی سی اُسے ڈس گئی۔ پہلے ہاتھوں کی اُنگلیوں پر رعشہ طاری ہوا پھر آنکھیں پھڑکنے لگیں، پھر لقوہ ہو گیا۔ جب دیسی علاجوں سے لقے کبوتروں کی یخنی سے افاقہ ہوا تو دائیں آنکھ مستقل بند ہوگئی۔زبان میں بھی لکنت آ گئی۔کیا ایک صدمے کی زد میں انسان یوں بھی مصلوب ہو جاتا ہے۔قطرہ قطرہ زندگی سنگلاخ پتھروں پر ٹپکنے لگی۔کاگے بدن کا کھے اُڑانے لگے۔ریل گاڑیوں کی گھڑ گھڑاہٹ پہاڑوں کے بطن میں زلزلے اُٹھاتی ،طوفان مچاتی ساعتیں سنٹھ کر گئی بینائی خالی خولی آسمانوں میں ٹنگی رہ گئی۔

شکیلہ جان کی نظر نہ تو مسجدِ نبوی کے میناروں پر گئی نہ روضۂ مبارک کی سبز جالیوں پر وہ تو اکبر خان کی دُلہن کے سراپے کو ٹکر ٹکر دیکھتی تھی۔جس نے اپنے حسن و نزاکت سے شکیلہ جان کی برسوں جلتی جوت کو اِک سبک سی پھونک سے بجھا دیا تھا۔ نازک خم دار پیر جس مہین سی سینڈل میں سجے تھے اُس میں تو شکیلہ جان کے ہاتھ بھی پورے نہ آتے۔ سنگلاخ چٹانوں، آڑھی ترچھی

پگڈنڈیوں اور تیرسی سیدھی چڑھائیوں اُترائیوں پر دگڑ دگڑ پڑتے ہوئے پیر تو انھی پتھروں کے ہم شکل ہو گئے تھے۔ پھٹی بیائیاں پھیلے ہوئے پنجے، شدید دھوپ اور سخت سردی میں جھلسی ہوئی جلد کھلے مسام، ہر مسام میں سے انتظار کے بجھے دِیئے کا اُٹھتا دھواں، پھٹی پھٹی بے نور آنکھیں، حرام گدھ جن کی پتلیاں نوچ لے گئے تھے اور اب ان ویران گڑھوں میں حسرت کی ٹھنڈی راکھ اُڑتی رہ گئی تھی۔

گراؤں کی لڑکیوں میں عجب سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ وہ تصویر والی اس شہرن کے نازک نازک ہاتھ پیر دیکھتیں، رواہاں کی نازک پھلیوں جیسی اُنگلیوں میں تارسی ہیرے کی مندریاں اُن میں سے تو کسی کی چیچی (چھنگلیا) میں بھی نہ کھبتیں۔ چکی پیستے، مونگ پھلیاں کھودتے، دیگیں مانجتے تین تین گھڑے پانی کے بھر کر میلوں چڑھایاں چڑھتے اور پنڈیں کپڑوں کی کوٹتے گٹے پڑی سیاہ ہتھیلیوں اور سخت گرھوں والے ہاتھ جن میں کسی کے نام کی چھاپ پڑی تھی۔ اتنی کھلی جتنا اس شہرن کے کان کا بالا! بغلی ریلوے لائن پر سے دِن رات گاڑیاں گزرتیں لیکن اُنھوں نے کبھی کسی گاڑی میں پیر بھی نہ رکھا تھا۔ پنڈی چھوڑ ساگری، روات تک نہ دیکھا تھا۔ ان میں سے تو کبھی کوئی بیمار بھی نہ پڑی کہ بہانے سے شہر ہی دیکھ لیتی۔ چوے کا پانی کوئی بیماری لگنے ہی نہ دیتا تھا۔ لگ جائے تو آبِ شفا بھی یہی تھا لیکن وجود کے اندر دھکتے دھواں چھوڑتے روگوں کا علاج اب چوے کی منتوں مرادوں میں نہ رہا تھا۔ دُنیا بہت ترقی کر گئی تھی اور بیماریاں بہت پیچیدہ ہو گئی تھیں۔ لڑکیاں نواری پلنگوں پر دوسوتی کی کڑھائی کی ہوئی چادریں بچھاتے ہوئے ان کی ڈھو میں جڑے شیشوں میں خود کو دیکھنے لگتیں۔ کیل مہاسوں داغ دھبوں سے بھرے چہرے جن کی رونق پہاڑی دھوپ کی لمبی زبانیں چاٹ لے گئی تھیں اور بارشوں کی سلیٹی اُمس ہڑپ کر گئی تھی۔ بے ڈول لباسوں میں چھپے بے شناخت سراپوں نے اصل عمر کو کہیں آگے دھکیل دیا تھا۔ جیسے وہ کبھی سرسوں کے پھولوں اور رواہاں کی پھلیوں جیسی نازک ملوک رہی ہی نہ تھیں۔ وہ ایک دوسری کو تسلی دیتیں۔

''اگر تین تین ٹائم تنور میں باجرے مکئی کی روٹیاں لگانا پڑتیں، اگر گیلی بھاری لکڑیاں کاٹ کر ڈھینگر سر پر رکھ کس چڑھنا پڑتے۔ رات رات بھر بیٹھ کر کسی کے نام کے دِیئے کی لو میں دِل کے

دھاگوں سے سویٹر بنتی اور اُون کے پھندنوں میں تسبیح کے دانوں کی طرح کسی ایک نام کو برسوں جپتی تو پھر ہم دیکھتے اِتنی ہی نازک اِتنی ہی گوری اِتنی ہی حسین دِکھتی گیا۔"

شکیلہ جان کی زندگی کی دھڑکن تو دھڑ دھڑ گزرتی ان گاڑیوں کی آمدورفت سے جڑی تھی اب بھی اس قصباتی ریلوے اسٹیشن سے گزرنے والی ہر گاڑی کا وہ شمار کرتی۔ نان سٹاپ گاڑیوں کے ڈبے اس تیزی سے گزرتے کہ بوگیوں کی پوری لائین بھنبھیری کی طرح گھوم جاتی، جن میں آنکھوں کی پتلیاں ٹنگی رہ جاتیں جنہیں گاڑیوں سے چھٹتا دھواں اور راکھ بے نور کر گئے تھے جن میں زنجیر کے اندھے حلقے خالی خولی پروئے تھے، جب وہ ناہموار زینوں پر کھڑی ہوتی تو سامنے چوٹیوں ڈھلانوں پر گائیں چراتی جھلی اُسے دیکھ کر تالیاں بجاتی۔

"ہندوستان کی قید سے چھٹ آئے ہیں ٹیلی فون آیا ہے جرنیل صاحب نا آج پنڈی اسٹیشن پر گڈئیوں لہسن۔"

اور دائیں ہاتھ قبرستان میں میر حسن کی قبر کے ساتھ زرینہ جان کی کچی قبر بنی تھی۔ لڑکیاں اپنے پڑھے لکھے منگیتروں کے نام سے باندھے منت کے دھاگوں میں بے تحاشا اضافہ کرنے لگیں۔ چوے پر سایہ کیے کھڑی پھلاہی منتوں کی سیاہ ٹاکیوں اور پراندوں کے دھاگوں سے لد گئی۔ فاطمہ نے اظہارالحق کے پاس ہونے کی منت مانی تھی صنوبر نے اصغر خان کے لیے پراندے کے دھاگے کئی بار باندھے تھے۔ کیونکہ وہ پریشان رہتا تھا اُس کی پریشانی کا راز تو اُس روز معلوم ہوا جب اُس نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ اُسے انگلینڈ کا ویزہ مل گیا ہے اور وہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر ولایت جا رہا ہے۔

مونگ پھلی کے کھیتوں پر سوار پُرے کی ہوا نے ایکسپریس ٹرین کی وِسلوں نے یہ خبر ہر سو اُڑا دی کہ فوج میں بھرتی ہونے اور تہ در تہ کھیتوں میں فصل اُگانے والے اِس خاندان کے ایک نوجوان نے اپنے آبائی پیشے سے بغاوت کر دی ہے۔

صوبیدار حکم داد نے رعشہ زدہ ہاتھوں سے کِلی سے ٹنگی اپنی فوجی بندوق اُتاری اور کوٹھے پر

چڑھ کر کئی فائر کھولے اور جب فائروں کی آوازسن کر آٹھ گراؤں کے لوگ اکٹھے ہوئے تو اُنھوں نے اعلان کیا کہ ٹھیک چھ دِن بعد اصغر خان کی شادی صنوبر سے ہو گی۔ پتہ نہیں ڈھولچی کہاں سے جھٹ پٹ نکل آیا جس کی تھاپ پر لڑکوں نے دائرہ بنا لڈی ڈالنا شروع کر دی۔ ہر گھر میں فوجی بندوقیں دیواروں سے سجی ہی تھیں۔ ہوائی فائرنگ میں شادی کی خوشی منائی جانے لگی۔ عورتیں سہرے اور ڈولی کے گیت گانے لگیں۔ سہرے کے گیتوں کی خوشی اور بدائی کے دُکھ مشرقی عورت کی چپ کے انقباض کا کیتھارسس کرتے ہیں شاید، محمد جان گڑ اور مونگ پھلیوں کی پراتیں بھر لائی۔ کمنیانیوں نے گانے کی لڑیاں پروئیں۔

اصغر خان کو تو کچھ سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی نہ مِل سکی۔ اُسی روز تیل ہلدی مل کر مائیوں بیٹھا دیا گیا۔ وہ اتنا ہی سمجھ سکا کہ اُسے ولائیت جانے کی اجازت تو مِل گئی ہے لیکن صنوبر سے نکاح کی شرط پر۔ یہ شرط کوئی ایسی کڑی بھی نہ تھی۔ اُس نے صنوبر کو کبھی کسی بھی نظر سے نہ دیکھا تھا۔ پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ خاندان بھر کی خوشی میں شامل ہو کر وہ بہت خوش تھا اور اپنی شادی میں خود ہی ناچنے لگا تھا۔ پتہ نہیں شادی کی خوشی میں کہ انگلینڈ جانے کی خوشی میں۔

صوبیدار حکم داد بھی خوش تھا اور اُن کا فوجی دماغ ایک جنگی چال کی پوری منصوبہ بندی کر چکا تھا۔ اُنھوں نے اکبر خان کے جرم کو معاف کرتے ہوئے اُسے بھائی کی شادی پر بہت تاکید سے بلایا تھا۔ اگرچہ شکیلہ جان کے طلاق کے کاغذات ملتے ہی پرزے پرزے کر کے وہ برساتی نالے میں بہا چکے تھے پھر بھی شرع کے کسی مسئلے سے بچنے کے لیے وہ گراں کے مؤذن سے فتویٰ لے چکے تھے۔ جیسے ہی اکبر خان گھر میں داخل ہوتا۔ وہ چند مردوں کی مدد سے اُسے قابو کر کے تجدیدِ نکاح کرواتے اور شکیلہ جان اور اکبر خان کو ایک تنہا کمرے میں دھکیل کر باہر سے تالا لگا دیتے اور چابی اپنی صدری میں رکھ لیتے۔ اگلے روز دِن چڑھے ساری برادری کے سامنے تالا کھولتے، چاہے وہ قید سے چھوٹ کر بگٹٹ بھاگتا اور عمر بھر واپس نہ لوٹتا لیکن شکیلہ جان تو سہاگن بن اس گھر میں رہنے کا حق حاصل کر لیتی۔ ایک بار وہ سسرال میں بہو کی حیثیت سے کسی بہانے داخل ہو

جائے۔ پھر چاہے پلٹ کر عمر بھر سہاگ خبر نہ لے۔ اُن کے بس میں ہوتا تو وہ اکبر خان کی تصویر سے ہی شکیلہ کا لڑ باندھ کر گھر لے آتے۔ یہاں پہلیوں کے سرہانے اُن کے مرد تھوڑی بیٹھے رہتے ہیں کبھی عید تہوار کی طرح ہی ملتے ہوں گے۔ لائنس نائیک یوسف خان مثل اپنے نام کے اِتنا خوب رو ہے کہ افسر بھی یوسفِ ثانی کہتے ہیں لیکن محمودہ جان بیچاری سیاہ رنگت اور چیچک زدہ چہرے کے ساتھ کسوں کی ویرانی میں کبھی کسی مسافر کے سامنے آ گئی تھی تو وہ چڑیل چڑیل پکارتا مر گیا تھا لیکن یوسف خان کے تین بچوں کی وہ ماں تھی۔ خود کہتی ہے کہ ہم بستری کے وقت یوسف اُس کا چہرہ کپڑے سے ڈھک دیتا ہے اور ہتھیلیاں رگڑتے ہوئے بین ڈالتی ہے۔

''ہائے ہوکو ٹوٹی! او وچارے وی کے کرن میں تو آپ شیشہ دیکھوں تو ڈر جاتی ہوں پر نصیب جڑا تو یوسفِ ثانی سے۔''

پوٹھوار کی شادی اور مرگ دونوں اِتنے شدید، بھرپور اور ہنگامہ خیز کہ ڈونگھے لڑ میں پوشیدہ بستیاں بسانے والے جنات بھی اس شادی یا ماتم میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اصغر خان کی شادی تو یوں بھی کئی صدمات جھیلے ہوئے اس خاندان کی مدتوں بعد پہلی خوشی تھی۔ رج کے باجا گاجا ہوا۔ عورتوں کے حلق بیٹھ گئے۔ برات کے روز اِشاروں میں باتیں کرتی اور کھڑ کھڑاتے گلوں کے ساتھ گھٹ گھٹ ہنستی رہیں۔ بعد میں کئی ایک کو ٹانسلز (Tonsils) ہو گئے عمر بھر کے لیے آوازیں پھٹ گئیں۔ جنیوں کی ڈھولک کی تھاپ پہاڑوں کی بلند فصیلوں سے ٹکراتی گونجیلی بازگشت نشیبوں کے حلق میں سے قطرہ قطرہ چھٹتی شب بھر پلٹتی رہتی۔

اصغر خان کے گیارہ دوستالے پڑے تھے۔ پوٹھوار میں دوستالہ کسی بھی خاندان کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ جو عمر بھر کا پکا اور گوڑھا رِشتہ بن جاتا ہے۔ ہر دوستالہ بڑھ چڑھ کر ایک دوسرے کی شاہ مات کے ساتھ شادی میں شریک ہوا۔ جیسے ان گیارہ گھروں میں سے ہر ایک میں شادی کا ہنگامہ برپا ہوا ہو، لیکن صوبیدار حکم داد کو جس کا انتظار تھا وہ نہ پہنچا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر ایک بار وہ چلا گیا تو پھر خاندانی دباؤ کے سامنے وہ پھڑ پھڑا بھی نہ سکے گا اور اسی لیے تو اُس نے

شکیلہ جان کو پکی طلاق پھر بھیجی تھی کہ وہ اُمید کے تار سے بندھی کہیں کنواری نہ رہ جائے۔ شاید اس لیے کہ اُس نے کچی عمر سے دھڑکنوں کا شمار کرنا نہ سیکھا تھا۔ قدموں کی چاپ کا اندراج کبھی نہ کیا تھا۔ اس انتظار اور شمار کی ریاضت اُس کے حصے میں نہ آئی تھی۔ ہر گاڑی کے گزرنے کے بعد اگلی گاڑی کے آنے کی گھڑیاں اور پل نہ گنے تھے۔ رات ڈھائی بجے گزرنے والی تیز رو سے پہلے تہجد کی نماز کبھی نہ نیتی تھی۔ دِن بھر گزرنے والی گاڑیوں کی سلامتی کی دُعائیں نہ مانگی تھیں۔ ہر آنے والی گاڑی کی حفاظت کے حصار کے لیے دو نفل نہ پڑھے تھے کہ شاید اکبر خان اسی گاڑی میں سوار ہو۔ جس نام کا تار اس بدن کے ہر ہر ریشے میں گندھا تھا۔ جس نام کے اسپیلنگ وہ دوسوتی چادروں پر کاڑھتی رہی تھی۔ جس نام کے سویٹر وہ اب بھی بنتی تھی۔ وہ نام اسی سوزن اُنھی سلائیوں سے پوروں کے رستے بدن کے ہر ہر خلیے میں کندہ ہو گیا تھا اور وہ نکاح کا بے نام سا بوجھ بھی نہ سہار سکا۔ نکاح کبھی کاغذ کے پرزے سے بھی ٹوٹتا ہے بھلا، یہ نکاح تو نس نس میں پڑھا گیا تھا۔ خون کی روشنائی سے لکھا گیا تھا۔ بھلا اس روانی کو یہ تین حرف کا اٹکاؤ کبھی روک سکتا تھا۔ جس کے انتظار کے رہٹ سے لگے آنکھوں کے بوکے عمر بھر خود کو بھرتے اور اُنڈیلتے رہے۔ وہ نہ آیا البتہ چھوٹے بھائی کے لیے اُس کا بھیجا ہوا تحفہ اور خط دونوں مِل گئے۔ خط میں ایک بار پھر شکیلہ جان کے دوسرے عقد کی تاکید لکھ کر بریت اور سرخروئی حاصل کر لی گئی تھی۔ لیکن یہ خط شادی کے ہنگاموں میں اپنی اہمیت کے مطابق توجہ نہ پا سکا۔ سوائے تائی بختو کے کہ جو کانوں کان خبر دیتی پھری۔

''تیسری طلاق بھی بھیج دی ہے اکبر خانے نے بھلا کس لیے؟ اُس نے کوئی دوہری بار دوہٹی بننا ہے۔ ایک بار جو نام زنانی کے ساتھ جڑ گیا بُرے مقدر کی طرح اُسے کون مٹائے نہ بھیجتا تو جھوٹی تانگ میں عمر تو لنگھ جاتی۔۔۔ چیرا، دو بولوں کا بھار بھی نہ اُٹھا سکا۔''

چوے کے پانیوں میں تڑپتی مچھلیاں ڈوبتی اُبھرتی رہیں۔ پھلاہی سے بندھے پراندوں کے دھاگے اور پلوؤں کی کترنیں بڑھتی رہیں۔ چہار اطراف ایستادہ پہاڑوں کی فصیلوں سے دِن بھر کی آوازیں شب کے سیاہ کھوکھلے بدن سے ٹکراتیں اور پہاڑوں کے مہیب دھانوں میں بازگشت

پلٹتی تو عورتیں انہیں جننیوں کے گیتوں اور بینوں سے تعبیر کرتیں۔شاید اس غولِ بیابانی نے زرینہ جان، جھلی میرن اور شکیلہ جان کے وجود میں گھٹے بینوں اور بطن کے کھکھل میں سسکتی کراتی آہوں کراہوں کو صورت بخش دی تھی۔لیکن کسّوں کے بھنبھار سے حلق سے چھٹتی اور سنگلاخ سینوں کی کھرج سے نکلتی ان چیخوں پکاروں کی طرف کسی کا دھیان نہ جاتا تھا کہ نظروں کا محور تو نئی نویلی دُلہن صنوبر جان تھی۔جو دِن کے وقت بھی اپنے دولہے کو لے کر اندر کوٹھے میں گھس جاتی۔

بڑیوں نے کانوں کی لویں چھوئیں۔

''توبہ توبہ چودھویں صدی۔ دِن دیہاڑے جنے نال اندر وڑی گشنی۔'' (شوہر کو کمرے میں لے کر گھس جاتی ہے۔)

''ہائے ساری عمر کبھی خاوند کی پٹی پر نہ بیٹھے، دِن کی روشنی میں کبھی منہ نہ دیکھا، پتہ نہیں یہ تین چار بچے کیسے ہو گئے۔۔۔''

''نہ بھی ہوتے تو ہم تھوڑی کہتے کہ بچہ چاہیے۔۔۔''

محمد جان سخت ہتھیلیاں آپس میں رگڑتی۔

''ہائے کنجری جا تکے آں ماندا کر چھوڑسی سارا روبک کڈ چھوڑسی۔۔۔'' (بدکار لڑکے کو کمزور کر دے گی۔سارا رس چوس لے گی)

ہائے جلم چمٹ گئی۔۔۔ہائے ہو کو لوٹی۔۔۔''

لڑکیاں صنوبر سے ایسے شرمانے لگیں، جیسے وہ بھی شہرنوں کی طرح ٹیڈی لباس پہن دوپٹہ گلے میں ڈال کر پھر رہی ہو۔

تائی بختو گھٹنے پیٹتی۔

''تکنا، راتیں دونوں کے بیچ منجی (چارپائی) ڈھا سووں گی۔''

''ہائے ہائے ایسی بے شرمی بے غیرتی اس پوٹھوار میں تو پہلے کبھی نہ دیکھی نہ سنی۔۔۔لگتا ہے ترس ترس کر جنا (شوہر) مِلا ہے۔۔۔''

''اصغر خان نے چھٹے روز روانہ ہو جانا تھا۔شاید وہ ان چھ دِنوں کا سارا رس کشید کر لینا چاہتی تھی۔نجانے پھر کتنی لمبی سنٹھ پیاس جھیلنا تھی۔بے اعتباری نے حریص بنا دیا تھا۔

چھٹے روز جب وہ رُخصت ہوا تو صنوبر کی بھوری آنکھیں اور گوری رنگت مکئی کے پکے ہوئے بھٹوں سی لالو لال تھی۔وہ دِن بھر سوکھے باجرے کے سٹوں کو موسل مار مار کوٹتی اور آسمان پر اُڑتے جہازوں کو دیکھتی رہی۔انھی میں سے کوئی ایک ولائت جا رہا تھا۔نجانے کب پلٹے۔

''ہائے کدوں مڑسن کدوں وچھورے مُک سن۔۔۔'' (ہائے کب مڑیں گے کب جدائی کٹے گی)۔

سامنے وسیع و عریض پہاڑی سلسلے سیاہ بادلوں میں ڈھکے تھے،کسوں نشیبوں پر اوندھائے ہوئے آسمان کے سیاہ خیمے میں دھواں اور دھند بھری تھی، جیسے بہت سے تنوروں میں گیلی لکڑیاں دہک رہی ہوں۔ساون کی جھڑی اس زور سے لگی کہ پرال کھینچتے کھینچتے باجرہ، مکئی بھیگ گئے۔جیسے سبھی پہاڑوں، چوٹیوں، کھائیوں، کسوں پر آسمانوں سے پُر زور پرنالے چھٹے ہوں۔اُبلتے ہوئے چشمے اور جھرنے بہہ نکلے ہوں۔جن کا دھانہ آسمان جتنا چوڑا تھا۔جس میں چاندی کے بے شمار تار لٹکتے تھے۔جن میں آب دار موتی پروئے تھے۔ یہ پہاڑوں کی بارش بھی کتنی پرشور، ہنگامہ خیز، زوردار ہے۔میدانوں کے مینہہ جیسی نہیں کہ پیاسی مٹی حلق کھولے سب چوس لے جائے۔گھونٹ بھرنے کی غٹا غٹ بھی سنائی نہ دے یہاں تو بوندوں کے مضراب سے دھرتی کا ہر تار بج اُٹھتا ہے۔ پتھر، چٹانیں، درخت، پتے، شاخیں، شوکارتی ہوئی ہواؤں کے کسے ہوئے ساز جیسے ساتوں سُر چھیڑ دیئے ہوں۔پرشور تانیں اور ترنگیں زمین و آسمان روم روم سے دھڑک اُٹھتے ہیں۔

بارش رُکنے کے بعد بھی پہروں یہ جلترنگ جاری رہتا ہے۔ٹپکتی ہوئی چھتیں، گرتے ہوئے پرنالے، پرشور پانیوں کی چادریں تانے میلوں بلندیوں سے گرتی آبشاریں، جیسے چوڑے دھانے والا کوئی طغیانی دریا جنات کی بستیوں کو تہس نہس کرتا ہوا۔شب بھر جھنیوں کی گونجتی چیخیں کوکیں گرتے اوندھاتے اُبلتے پگڈنڈیاں اُترتے سمندروں پانی......سارے کس دندیاں نشیب

چوٹیاں غوطا گئے، اگلے روز جہاں کہیں بھی پتھروں میں، دراڑوں میں، مٹی کا ذرہ بھر بھی بچ رہا تھا۔ وہیں وہیں کھمبیاں چھتریاں تان کر باہر نکل آئیں، جیسے بارش کا مزا لینے چھاتا تان کر ہوا خوری کو نکلی ہوں۔ چتکبری کھمبیوں کے گرد بیر بہوٹیوں کی سرخ مخمل بچھ گئی۔

تائی بختو نے تیل کا بھرا کڑاھا چڑھایا اور میٹھے پوڑے تلنے لگی۔ پوڑوں کی خوشبو سبھی گھرانوں میں کھلر گئی۔ اُنگلیاں چوستے بچے اکٹھے ہوئے۔

بکلیں لپیٹے عورتیں آٹے اور گڑ کی پراتیں سر پر دھر لائیں۔ آٹے کی پتلی لئی سی بنا چمچے کے ساتھ توے پر کڑکتے گھی میں بلوں کی شکل میں ڈالتیں اور تل کر انتظار میں دراز کی ہوئی کسی چھابی میں اُلٹ دیتیں۔ اس خالص زنانہ ضیافت میں مختار کے سوا کوئی مرد موجود نہ تھا جو چادر سے سر ڈھکے ناک پر اُنگلی جما جما کر باہر کی خبریں سناتا اور چولہے میں لکڑیاں جھونکے جا رہا ہوتا۔ مختار عورتوں کے بیچ باہر کی دُنیا کا واحد رابطہ تھا جو ادھر ساگری، روات، پنڈی، گوجر خان تک ہو آیا تھا۔ لاری اڈا، بازاروں، لال کرتی، راجہ بازار ہوٹلوں، شہر کی رہتل کے متعلق باتیں سناتا تو عورتیں ہنس ہنس پیٹ پکڑ لیتیں۔

''ہو کولوٹی! (ہائے لٹ گئی) یہ شہریے بڑے ہی کمینے، لچے اور چالاک ہوتے ہیں۔ اللہ ان سے بچائے۔ ہر زنانی کے پاس گیدڑ سنگھی ہوتی ہے تبھی تو۔۔۔ اپنے اکبر خانے آں۔۔۔ پھانس لیا۔۔۔ ورنہ اپنی شکیلہ جان۔ اُس شہرن کا کوئی مقابلہ۔۔۔ ہے۔۔۔''

شکیلہ جان دِن بھر مٹھّیاں گھڑ گھڑ چنگیر میں سجاتی رہی تھی اب ہر روٹی کے اُوپر مونگ پھلی کے دانے اور کھوپرے کی گری کی قاشیں سجا کر تنور کی دھیمی دھیمی دہکتی پٹھ پر چپکا رہی تھی۔ جس کے منہ پر اُلٹا گھڑا رکھ کر ڈھانپ دیا تھا جو ساری رات دھیمے دھیمے کوئلوں پر پکیں گی۔ شکیلہ جان کے ارمانوں کی طرح اندر ہی اندر دم پر لگی ہوئی یہ مٹھّیاں۔۔۔ آج اُس نے ان پر نہ اپنی چوڑی رکھ نشانات بنائے تھے نہ انگوٹھی کی چھاپ نہ پوروں کو ثبت کیا تھا۔ یہ کوئی کوئٹہ چھاؤنی تھوڑی جانی تھیں کہ شاید کھانے والے کے اندر ان چھاپوں کی تاثیر بھی چھپ جائے......صنوبر کھمبیاں توڑ لائی اور

تیز مرچ مصالحہ ڈال کر زنانہ ذائقے کا سالن بنایا لیکن کھاتے وقت جی متلا گیا۔ بڑیوں نے تجربے کا فیصلہ دیا۔

''دِن چڑھے ہیں۔ تبھی تو مرچ اچھی لگتی ہے۔''

یہ کھمبیاں بھی نہ بس اِک بارش کے ذرا سے قطرے کی منتظر رہتی ہیں، ادھر قطرہ زندگی مِلا، ادھر سر باہر نکال چھاتے اوڑھ لیے۔ کھمبیاں اور یہ پوٹھوار کی لڑکیاں بس ایک جیسی۔

جھینگر اور مینڈک ٹرٹرانے لگے۔ مچھلیوں کا پونگر برساتی نالوں اور جھیلوں میں بھر گیا۔ سارے کس نشیب جنگلی پھولوں پھلوں اور خودرو سبزیوں سے مہکنے لگے۔ یہ برسات کا موسم بھی ان پہاڑوں میں کتنا شدید اور بھرپور اُترتا ہے۔ گند کے ڈھیر میں سے بھی بہار پھوٹ نکلتی ہے۔ فاطمہ کب سے روہاں کی پھلیاں توڑ توڑ کر چادر کے پلّو میں بھر رہی تھی۔ چند گز پرے بیری تلے بچھی چارپائی پر کتابوں کے ڈھیر میں اظہار الحق دبا تھا۔ فاطمہ کھیت کی مینڈھ ٹاپ کر بیری کے چھتنارے سے باہر باہر بکھری ادھ کچری کھکھڑیاں چننے لگی۔ خربوزے اور تربوز پتھروں پر مار توڑتی اور کچے کچے پھل پٹخ دیتی لیکن اظہار الحق نے کھیتی خراب کرتی اِس چڑیا کو نہ تالی بجا اُڑایا نہ پتھر مار بھگایا۔ ورنہ فصل کریدتی فاختاؤں کو چڑیوں لالیوں کو کھیتی اُجاڑتی بکریوں، لومڑیوں کو وہ پتھر مار، تالی سیٹی بجا ایئر گن چلا ڈراتا رہتا۔ یعنی پڑھنے کے ساتھ ساتھ فصل کی رکھوالی بھی کرتا رہتا لیکن اب کھکھڑیاں بھٹے توڑتی فصل ویران کرتی بیر چنتی اس فاختہ کو، اس چڑی کبوتری کو اُس نے کوئی روڑا گیٹا نہ اُٹھا مارا۔ کوئی سیٹی تالی بجا کر نہ اُڑایا۔ فاطمہ پتھریلی پگڈنڈی پر دھڑ دھڑ پیر بجاتی لڑی میں اُتر گئی اور کہاں نما سفید چٹان کے گلے لگ روئی۔

''ہوکولوٹی! میں گھگھی ہی ہوتی، بکری ہی ہوتی، چڑی کاں ہوتی جو پتھر لگتا تیرے ہاتھ سے چھو کر لگتا۔۔۔ میں بھوری میں موئی۔۔۔ میں ہوں۔۔۔ اسے تُو کیوں تالی سیٹی مار اُڑائے۔''

ڈونگے لڑ میں بھرے پھلاہی اور بڑ کے جنگلوں میں زینت اور اُس کی ماں رحمت جان صابرہ کو ہوکارے مارتی پتھر گیٹے چلاتی تھیں، جیسے پرندوں کے ڈار، بھری فصل اُجاڑ رہے ہوں۔

صابرہ وہاں کیا کرنے گئی تھی جہاں جنات کی بستیاں تھیں، جہاں چڑیلیں شب بھر لچکدار پوٹھواری زبان میں پُرسوز گیت گاتیں اور سریلے بین ڈالتیں، اور پہاڑوں کی طویل گھومتی فصیلوں میں ڈھولک کی تھاپ پڑتی رہتی۔

فاطمہ نے پتھروں اور ہوکاروں کی خفیہ ہوک کوک سے گھبرا کر چٹان کی لمبی گردن کو گلے سے الگ کیا۔ صابرہ گھنے درختوں کی گپھا میں سے نکلی اور اُونچی دندی پر چڑھی اور اظہارالحق کی چارپائی کی پوائنتی بیٹھ کر اُس سے یوں باتیں کرنے لگی جیسے مُدّتوں سے یہیں بیٹھی ہو جب رحمت جان نے اُسے چٹیا سے گھما کر مکئی کے پھلوں پر پھینکا تو کوئی بڑ کے جنگل میں دھڑ دھڑ بھاگا۔

''لچی کنجری! کس خصم کے ساتھ تھی جنوں سے یارانہ کرنے رتھ (جنگل) میں اُتری تھی۔ جنڑاں لوڑنی (مرد ڈھونڈتی)۔۔۔کسی جنّنی کا خصم کرنے گئی تھی؟''

اظہارالحق نے بڑھ کر چھڑایا۔

''کیا ہو گیا ہے چاچی جی! یہ تو بہت دیر سے یہاں میرے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی کیا وہم ہو گیا ہے آپ دونوں کو۔۔ یہ بھلا جنات کی بستی میں کیوں اُترے گی؟''

فاطمہ نے خود دیکھا صابرہ جب دندی (چوٹی) چڑھی تو باوے لہراسب کا پوتا وسیم جو ادھر دینہ کے کسی اسکول میں ماسٹر بھرتی ہوا تھا۔ ڈونگھے لڑ، کی گپھا سے نکل کر چٹا پُر چڑھا۔ ایک بار تو اُس کا جی چاہا چیخ کر کہے یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے خود دیکھا یہ وسیم خانے نال ماڑی ہے لیکن اظہارالحق کو وہ کیسے جھٹلا سکتی تھی اور پھر شاید وہ بھی اظہارالحق کے ساتھ ماڑی ہے جو اُس کی طرف دیکھتا تک نہیں۔ کبھی بولا بھی تو ڈانٹ کر ہی بولا لیکن وہ خود سے آپ ہی آپ اُس کے ساتھ ماڑی ہو گئی ہے۔ اگرچہ پورے گراں میں کسی کو یہ معلوم نہیں کہ وہ اظہارالحق کے نال (ساتھ) ہے۔ ڈونگھے لڑ میں بجھے بڑ کے رتھ پر سوار یہ خبر آٹھ گراؤں میں گھوم گئی۔ ڈونگھے لڑ کی جننیوں نے مقال ڈالی اور بڑی بوڑھیوں کے حقے کی چلم اور کلے میں دبی نسوار کی چٹکی میں جیسے گھول دی۔ صابرہ باوا لہراسب کے پوتے ماسٹر وسیم کے ساتھ ہے۔ ادھلنے (فرار) جا رہی تھی کہ ماں بہن نے

پکڑ لیا۔ پورے گراں کے دس گھرانوں کی عورتیں ایک دوسری سے منہ جوڑے ناک پر دھری اُنگلی کی طرح ششدر رہ گئیں۔ اس پوٹھوار میں تو ایسی بے حیائی نہ دیکھی نہ سنی۔

بات نجانے کتنے پہاڑی سلسلے چڑھتی، کتنے چشموں آبشاروں میں گف ہوتی بھیگتی کتنی مچھلیاں تڑپتیں مینڈک ٹراتے کہ کفتاں (عشاء) کی بانگ سے پہلے پہلے بابالہراسب صابرہ کی ہتھیلی پر روپیہ رکھ گیا اور اس پوٹھوار کی ایک اور تاریخی کہانی بنتے بنتے رہ گئی۔ اُسی روز صنوبر نے اگلی کوٹھری میں غزل جان کو سپیدۂ سحر کے طلوع کے ساتھ جنم دیا۔ اس آس میں پوری رات اُس نے دردزہ کی چیخیں بھی گھونٹ لیں کہ یہ تو وہ تحفہ ہے جسے دیکھنے کو اصغر خان انگلینڈ سے پھر آئے گا۔ کئی روز اُس نے غزل جان کو نظر بھر کر نہ دیکھا کہ اصغر خاناں آ جائے گا تو دونوں مِل کر دیکھیں گے اور طے کریں گے کہ کونسا نقش کس پر گیا ہے۔ پورا چھلا دھمیائیاں والی گھٹی گھٹی کوٹھری کی نیچی چھت پر سے گزرتے ہر جہاز کی آواز کے ساتھ کان اور آنکھیں ٹنگی رہیں۔ دیسی گھی کی تری اور باداموں کی گریوں سے بھری سوجی کی چھاوانی کا پیالہ گھونٹ گھونٹ بھرتے ہوئے اُس نے بے جی سے آخر پوچھ ہی لیا۔

''اصغر خاناں غزل جان کو دیکھنے کب تک پہنچ جائے گا۔''

جواباً جب وہ چیخی ہے تو گراں کے دسیوں گھرانوں نے سنا ہے۔

''نہ جہاز کا ٹکٹ رواٹ کی بس کا ٹکٹ ہے کہ تم چھینک مارو اور وہ کٹوا کر بھاگا چلا آئے۔ ہائے عمر گزر گئی آج تک جنے کا نام زبان پر نہ آیا۔ ساری جوانی صوبیدار فوج میں رہا کبھی نہ ساس سے پوچھا کب چھٹی پر آئے گا۔ ساری عمر شرم کی آنکھ سیدھی نہ اُٹھی۔ ہائے بے حیا۔ اصغر خاناں! جس طراں جنڑا نہیں جا تک اے اساں ۔۔۔'' (جیسے شوہر نہیں بیٹا ہے اس کا۔)

تیز گام دھڑک دھڑک گزر گئی۔ تادیر پٹڑیاں بجتی گونجتی رہیں۔ پتہ نہیں اب یہ گاڑیاں گزرنا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں نہ کبھی کوئی آیا نہ گیا یہ خالی خولی کیوں گزرتی رہتی ہیں۔ اس قصباتی اسٹیشن پر کراس کیوں پڑتے ہیں۔ ایک سوار بھی تو کبھی موقع سے فائدہ اُٹھا کر اُترا نہ چڑھا کس کے انتظار کے ایندھن سے چھک چھک دھوئیں چھوڑتی ہیں یہ پاگل ریل گاڑیاں۔

صنوبر کی نگاہیں تو آسمان کے ترازو میں ٹنگی رہتیں ۔اس گراں پر اوندھائے مٹھی بھر آسمان سے گزرنے والے ہوائی جہازوں میں سے نجانے وہ کونسا ہوگا جو انگلینڈ جا رہا ہوگا۔ جہاں غزل جان کا باپ رہتا ہے۔ جہاں کے ٹھنڈے موسموں میں مچھلی جیسی بے نمک گوریوں کو ٹیکسی کار میں لاتے لے جاتے کیا اُسے کبھی صنوبر کا خیال بھی آیا ہوگا۔اُس نشانی کے متعلق خط میں کچھ لکھتے ہوئے شاید اُسے شرم آتی ہوگی جو محض چھ دِن کے وصل کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں پہاڑوں میں بسنے والوں کے دِل بھی انہی پتھروں سے بنے ہوتے ہیں۔اصغر کا دِل اس بچی کے دیکھنے کو کبھی نہ مچلا۔ کبھی کوئی پارسل غزل جان کے نام کا نہ آیا۔کبھی کوئی منی آرڈر صنوبر کے نام نہ پہنچا۔حالانکہ اب ہر دوسرے مہینے منی آرڈر اور پارسل آنے لگے تھے۔ یہ سب منی آرڈر محمد جان کے نام آتے۔ جنھیں صوبیدار حکم داد اپنے فالج زدہ وجود میں بٹ بٹ کھلی اور جاگتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ دیکھتا یہ سہمی سمٹی مکئی کا دانہ سی محمد جان کس بھٹی میں تپ کر کھل گئی تھی جو اس وقت ان آٹھ دس گراؤں میں سب سے مالدار عورت تھی۔ جسے زندگی میں پہلی بار پیسہ جوڑنے کا عجب نشہ آور مشغلہ ہاتھ آیا تھا۔ انگلینڈ کی کمائی سے جدید طرز کا مکان بنا۔فلش اور ٹونٹیوں والے غسل خانے بنے،موٹر والا کنواں کھدا۔ پورے علاقے میں انگلینڈیوں کی کوٹھی کے نام سے یہ جدید طرز کی عمارت مشہور ہوگئی۔عورتیں ڈھوئے لے کر آئیں۔ بدلے میں محمد جان نے ولائتی سوٹ جھولیوں میں ڈالے۔

بڑی بھابھی زینت اور چھوٹی بہو صنوبر کو تو اچار کے مرتبان کو بھی ہاتھ لگانے کی اجازت نہ تھی۔انگلینڈ کی کمائی نہ آئی تھی تو دونوں ٹائم ہانڈی پکتی تھی۔ دوسرے تیسرے روز دیسی مرغا چڑھتا لیکن اب اگر زینت اور صنوبر جٹھانی دیورانی کبھی اچار کی دوسری پھانک بھی روٹی پر دھر لیتیں تو محمد جان کی چیخم دھاڑ چوے پر پانی بھرتی عورتیں بھی سنتیں اور کانوں کی لویں چھوتیں۔

''ہڈیاں دولتاں نا کے کرنا جے کررج کے روٹی وی نہ کھا سکے بندہ۔'' (اتنی دولتوں کا کیا فائدہ کہ بندہ پیٹ بھر کے روٹی بھی نہ کھا سکے)۔

آخر دونوں جٹھانی دیورانی کھانے کے وقت میکے گھروں میں جا بیٹھتیں۔ڈبوں مرتبانوں

میں پڑے مرچ مصالحے بھیگے موسموں کی اُمس بھری پرانی بساند چھوڑنے لگتے لیکن استعمال نہ ہوتے۔ محمد جان ناک کی پھنک پر شہادت کی پور رکھ کر ناک سے غنغناتی۔

''مرد تو کوئی رہا نہیں گھر میں کس جوگا رِن پکا کے رکھوں۔ ہائے کبھی عورتوں نے اس پوٹھوار میں دودھ چھکے جو اُبال کے رکھوں۔ گھی شکر مرد کھاتے ہیں کس کے لیے روٹیاں چپڑوں...... ڈاکٹر نے دودھ کے ساتھ دوائی بتائی ہے ہائے کیوں پیوں، جیون جوگے پردیس جھیل کر کمائیں اور میں اُجاڑوں نہ کیوں اُجاڑوں۔''

بڑے بھا پا جی فوج کی طرف سے چھ مہینے پہلے مسقط چلے گئے تھے اُن کے منی آرڈر بھی محمد جان کے نام ہی آتے۔ صوبیدار حکم داد اب نام کا حکم داد تھا۔ اپنے فالج زدہ وجود میں پوری کھلی آنکھوں کے ساتھ تبدیل ہوتے رویوں کو دیکھتا۔ پیسہ انسانوں، مزاجوں، عادتوں کو یوں بھی بدل دیتا ہے۔ یہ گھرانہ جو کبھی صوبیدار حکم داد کے نام کی شناخت رکھتا تھا۔ اب ولائتیوں کے نام سے مشہور تھا۔ یہ گراں جہاں بیٹھکیں، اسلحے، بستر، برتن، بچے سب کے سانجھے تھے۔ اب اپنی شناخت چاہنے لگے تھے۔ اب پوٹھوار کے ہر گراں کے نوجوان اس حسرت میں جیتے تھے کہ وہ کونسا جہاز ہوگا جو اُنھیں انگلینڈ یا پھر مشرقِ وسطیٰ کی کسی ریاست میں چھوڑ آئے گا، جہاں وہ فارن کرنسی میں کمائی کریں گے۔ ولائتیوں کی کوٹھی میں میڈ ان انگلینڈ ریڈیو، کیمرے، ٹیلی ویژن، فریج جیسے نوادرات بھرے تھے۔ ہر آنے جانے والوں کے لیے کوٹھی کے تالے کھول کر اس عجائب گھر کی سیر کروائی جاتی اور پھر خزانے کے تالے چڑھا دیئے جاتے۔ ہر ماں دِنوں ایسی اشیاء کے خوابوں میں سونہ پاتی جنھیں استعمال کرنے کا نہ وہ طریقہ جانتی تھی نہ خواہش رکھتی تھی۔ لیکن ولائتیوں کی کوٹھی جیسا بھرا بھکنا ایک مکان ہو۔ جس کے کنڈے تالے لگا کر کنجیاں کھیسے میں ڈال خود کچی کوٹھری میں بیٹھ رکھوالی کریں۔ کسی بہو پوتی کو قریب پھٹکنے نہ دیں۔ فصل کریدتے پرندوں کو اُڑانے والا سانگل ہاتھ میں رکھ چوکیداری کریں، نہ خود چھوئے نہ کسی کو چھونے دے۔ ولائیت والی کمائی پلے میں باندھ سرہانے رکھ سوئے۔ عجب سرور تھا اِس خزانے کی حفاظت میں۔

صنوبر کے بری جہیز کے کپڑے صندوقوں میں پڑے پڑے مسک گئے۔ کسے دکھانے کو پہنے جاتے۔ سلے ہوئے پورے نہ رہے ان سلے چھد گئے۔ گرم چادریں سویٹر اپنی ہی حرارت چھوڑتے کرم خوردہ ہو گئے۔ سرخی اور کریموں کی ڈبیاں خشک ہو کر پیندوں سے چپک گئیں۔ انتظار کے اسفنج نے چہرے اور ہونٹوں کی تازگی خود ہی نچوڑ لی۔

اس قصباتی ریلوے اسٹیشن پر سے گاڑیاں آج بھی گزرتی تھیں۔ نہ تھکیں نہ رُکیں، ہر گزر جانے والی گاڑی اس پہاڑی گاؤں کے قلب کو لرزا جاتی، جہاں صوبے دار حکم داد کی چارپائی بچھی رہتی۔ ایک ہی کروٹ میں پڑے پڑے لاگے لاسے اور زخم جو پیڑا چھوڑتے وہ اس فوجی جسم کی برداشت سے بھی باہر ہو جاتا کہ میجر اکبر خان نے گھات لگا کر جو فائر کھولا تھا۔ جو برسٹ مارا تھا اُس نے پورے وجود کا قیمہ کر دیا تھا۔ لہو اور بوٹیاں باریک باریک ریشوں کی شکل میں اُبل پڑی تھیں لیکن وہ اعضا جن کی فوری موت تکلیف سے نجات کا سبب بنتی ہے وہ بچے رہ گئے تھے۔ اب وہ قطرہ قطرہ بوند بوند گھسڑ گھسڑ رگڑ رگڑ کر مر رہے تھے۔ اکبر خان کی نافرمانی اُن سے کسی فوجی کی پُروقار موت کا اعزاز بھی چھین لے گئی تھی۔

محمد جان زخموں بھری کھال میں لپٹے اس فوجی وجود کو ذرہ ذرہ قطرہ قطرہ مرتے ہوئے دیکھتی تو ناک پر شہادت کی اُنگلی ٹیڑھی کر کے رکھتی۔

''جے کر اُمید ہوئے کہ پیسہ لگا کر بچ رہے گا تو میرا اللہ جانتا ہے لگا گزرتی۔ پر مٹی کی ڈھیری پر روپیہ رکھ پھونکنے کا فائدہ؟ کوئی سوکھا کمایا جاتا ہے۔ برفوں کے مُلک میں ہڈیاں کُھرتی ہیں لہو جم جاتا ہے تو ملکہ کے فوٹو والا نوٹ ہاتھ آتا ہے۔ ہائے میں کوئی ڈائن ہوں جو جیون جوگے کی کمائی روڑھ دوں۔ اِک اِک پیسہ جان سے بڑھ کر سنبھالوں گی۔ آپوں مری کچھاں تاں وی روپے نی نسوار نہ چھکنی کنیاں پیسہ ونجاواں۔ (خود مر جاؤں تو روپے کی نسوار نہیں چھینکتی پیسہ کیوں ضائع کروں۔) بڈھے نے کوئی بچنا ہے۔ ہوکولوٹی۔۔۔''

پوٹھواری زبان کے مخصوص اُتار چڑھاؤ میں لفظوں کی ادائیگی جذبات کی ترجمانی کرتی۔

ریل گاڑیوں کے پہیوں تلے لرزتی سنسناتی پٹڑیوں کی لرزش پہاڑی سلسلوں میں ہوکار بھر جاتی...... گہرے نشیبوں میں سیٹیوں اور کوکوں کی بازگشت بار بار پلٹتی جو جنیوں کے وحشیانہ قہقہوں اور کرب ناک بینوں کو لپیٹ لے جاتی۔ تادیر اس پہاڑی گاؤں کی زمین یوں دہلتی رہتی جیسے اس کے سینے میں ہزاروں قیدیوں کی بیڑیاں اور زنجیریں جھنجھنا اُٹھی ہوں۔ شکیلہ جان صوبیدار حکم داد کے زخموں کو سپرٹ سے دھوتی۔ آئیوڈین کے پھاہے رکھتی، حکم داد کا فوجی وجود درد کی پچھاڑیں کھاتا جیسے شکیلہ جان کے ہاتھ نہ ہوں زہر میں بجھے تیر ہوں۔

''شکیلہ جان! تیرا یہ صبر یہ خدمت ہی تو مجھے مار رہے ہیں۔ شکیلہ جان! تیری یہ خاموشی اندر ہی اندر کنڈلی مارے دُکھ کا ناسور، کنڈیاری کی طرح خشک ہوتا تیرا وجود ہی تو میری موت ہے۔'' صوبیدار بڑبڑاتا رہتا لیکن سوائے شکیلہ جان کے کوئی کچھ نہ سمجھ پاتا۔

تین جنگیں لڑنے اور جانبر رہنے والا یہ سپاہی جب دِل و جان کے اس روگ سے پچھاڑیں کھاتا تو بازگشت ڈونگھے لڑ، کی پتھریلی چٹانوں سے منہ سَر ٹکراتی تو جنیوں کے بین مزید پُرشور ہو جاتے۔

جس روز گھر میں موٹر کار آئی اس رات شکیلہ جان تکیوں کا پہاڑ کمر کے پیچھے رکھ کر صوبیدار حکم داد کے منہ میں نوالے ڈال رہی تھی۔ نوالے کے کچھ ذرے باچھوں سے بہہ نکلتے تھے۔ کچھ اُڑ کر شکیلہ جان کے چہرے پر چپک جاتے تھے۔ وہ رومال سے ذرّے صاف کرتی پانی کا کٹورہ منہ سے لگاتی، اور دِل ہی دِل میں بین ڈالتی۔

''ہائے میں نکھتری نہ جنتی نہ ابا جی کا یہ حال ہوتا۔ ہائے مجھ کرماں سڑی کا روگ کھا گیا ابا جی۔۔۔ ہائے ابا جی۔۔۔ ہائے میں مقدر پٹی مرتی بھی نہیں۔ ہائے ڈونگھے لڑ میں روز جنیوں کے جنازے اُٹھتے ہیں مجھ پچھل پیری کو موت نے بھی نہ قبولا۔''

سامنے نئی کوٹھی کا گیٹ کھلا تھا۔ آٹھ گراؤں کے نوجوان انگلینڈ سے آئی گاڑی کو پوروں سے چھو کر اُس کی ملائمیت محسوس کرتے اور اس کی قیمت کا تخمینہ لگاتے۔ جس کا حساب روپوں میں تو بنتا ہی نہ تھا کیونکہ اب یہاں پاؤنڈز اور ریال زیادہ مروّج ہو رہے تھے۔ محمد جان اندر ہی اندر

کھولتی تھی ۔ جس فرش پر یہ پیر پڑ رہے تھے وہ کوئی سیاہ مٹی سے بنائی ہوئی ہاتھ کی تلن نہ تھی جو ہمیشہ کے پیروں تلے بچھی رہتی ۔ جس گاڑی پر یہ ہاتھ لگ رہے تھے ان کی پچھلی اگلی نسلوں نے کبھی کسی ایسی گاڑی کو نہ چھوا تھا۔ اس کی قیمت کا حساب لگانے کو دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں کم پڑ جاتی تھیں ۔ کبھی پیسہ جوڑنے، گن کے رکھنے کو ملا ہی نہ تھا۔ گنتی کیسے کرنی آئے۔ محمد جان دیکھنے سننے والیوں کو بتا رہی تھی ۔ '' سارے گراں کے میرے (کھیت) بک جائیں تو یہ ایک گاڑی آتی ہے۔ ہائے چڑھنے کے لیے تھوڑی ہے۔ سینت سنبھال کر رکھنے کے لیے ہے۔ اللہ جی نظرِ بد سے بچانا۔ ہائے میں کوئی ڈائین ہوں جو پردیسی کی کمائی لٹادوں، ہوکو! مری گیساں پر پیسہ لائی کے دوائی نہ گنساں ۔''

(مرجاؤں گی پر دوائی پر بھی پیسہ نہ لگاؤں گی ۔)

صوبیدار حکم داد کی نگاہیں گاڑی کی چمچماتی سطح سے چپکی تھیں اور اب پلٹ آنے کی اُن میں سکت نہ رہی تھی، جیسے سورج کی تیز روشنیوں نے پتلیاں جلادی ہوں ۔ شکیلہ جان نوالہ ٹھونستی تھی لیکن ٹیڑھا جبڑا ایک طرف مڑ کر بند آنکھ سے جا لگا تھا اور خوراک کی رالیں سفید داڑھی کو بھگونے لگیں ۔ ولائتیوں کی ولائتی گاڑی کو چندھائی آنکھوں سے دیکھنے والے اب صوبیدار حکم داد کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگے ۔ سنگلاخ پہاڑی چڑھائیوں پر تنومند گھوڑے کی طرح بار برداری کرنے والا یہ فوجی ایک واقعے کی زد میں آ کر موم کی طرح پگھل گیا تھا۔ شاید اللہ کی مرضی یہی تھی کہ اب بزرگوں کی وہ نسل مرجائے جس نے گراں کو اِک عجیب و غریب رسن میں باندھ رکھا تھا، جہاں اپنے الگ الگ وجودوں کی شناخت بھی نہ تھی سب گڈ مڈ ۔ پتہ نہیں کس کا ہاتھ بازو چہرہ کہاں ختم ہوتا تھا اور کہاں دوسرے کا شروع ہوتا تھا۔ جب سے تیرا میرا کی حد شروع ہوئی تھی ۔ بڑے بوڑھے بے کاشت کھیتوں کو بے نور آنکھوں سے دیکھتے، جن میں اب کوئی فصل نہ اُگائی جاتی تھی لیکن جن کی قیمت کا تخمینہ لگانے کو ادھر یورپی طرز کے نئے شہر اسلام آباد سے انوسٹر آنے لگے تھے ۔ ناہموار ڈھلانیں بلند چوٹیاں بنجر زمینیں ریتلے ٹبے سب کو مول لگنے لگا۔ رتھ کٹنے لگے تھے۔ کنالوں میں پھیلے بڑ خشک ہونے لگے جن کی لمبی لمبی جڑوں سے لپٹے چمگادڑ ویران ہو چکے کنوؤں

میں اُتر گئے تھے۔ راہٹ خشک ہونے لگے تھے۔ ٹریکٹر اور موٹریں متعارف ہونے لگی تھیں۔ بختو بنا دانتوں کے جبڑے سے دُھواں اُگلتی، پھونکنی کی طرح دائیں بائیں بازو لہرا لہرا کر بین ڈالنے لگی۔

''ہائے کھانے کو کم تھا پر کبھی کوئی بھوکا نہ رہا۔ جوڑنے کو کچھ نہ تھا لیکن بنا علاج کے کبھی کوئی نہ مرا تھا۔ کوٹھے چھوٹے تھے لیکن دِل بہت بڑے تھے۔'' عورتوں نے صوبیدار حکم داد کی میت کو بنیوں سے سجا دیا تھا۔ جب میجر اکبر خان اپنی بیوی اور دو بچوں کے ہمراہ پہنچا تو صوبیدار حکم داد کو دفن ہوئے چوتھا روز تھا اور اب اُسے یہاں آنے میں کوئی خطرہ درپیش نہ تھا۔ اب وہ صوبیدار حکم داد کی مٹی کی ڈھیری پر پھول بچھا کر بے خوف و خطر فاتحہ پڑھ سکتا تھا۔

پوٹھوار کی عورتیں سروں پر بانہیں گھماتی بین ڈالتی، اُسے اچانک سامنے پا کر اِرد گرد پھیلے پہاڑی سلسلوں کی طرح ساکت و صامت رہ گئیں۔ جیسے زبانیں اپنے ہی دانتوں تلے کٹ کٹا گئی ہوں کہ اُن کے بینوں کے روڑ بجر کے چھٹے اس بدیع الجمال کو کہیں میلا نہ کر دیں۔ کسی کو بھی اُسے بانہوں میں لپٹانے اور گلے سے لگا کر بے اختیار بین کھینچنے کی جرأت نہ ہوئی تھی جیسے ان کے بدبودار لباسوں اور کُھردری جلد کا لمس اُس کے لیے ضرر رساں ہو۔

سفید عربی اسکارف لپیٹے اور سیاہ عبایا پہنے جیسے کعبہ کے گرد طواف کا ساتواں چکر پورا کرتے ہی اِدھر چلی آئی ہو۔ پوٹھوار کی روایت کے مطابق کسی کو اُس کے دونوں گالوں پر بھی ناگوار بوسے دینے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ جیسے کعبہ کے نرم لطیف پاکیزہ غلاف پر پھٹے ہوئے گرد آلود بد رنگ کھردرے ہونٹ ثبت کرتے، اُس کے میلا ہو جانے کا خدشہ ہو یا بے حرمتی کا خوف ہو۔ یکبارگی ایک ہی خیال سبھی کو لپیٹ گیا۔ یہ کعبے کے ریشم کی کامدانی کترن اور شکیلہ جان پوٹھوار کا کوئی وٹہ روڑا۔ اکبر خان کے پیر کی ضرب سے لڑھکتا لڑھکتا دُور نشیب میں غرق۔۔۔۔ ہجوم کے آخری چکر میں شکیلہ جان دھنسی پھنسی بجھے دِئیوں سی کالک بھری آنکھوں سے کعبے کے غلاف کی چمک میں چندھیائی ہوئی، جس کی جلد کو ساون کی اُمس اور پوہ ماگھ کا کہرا چاٹ گیا تھا اور جسم و جاں کو انتظار کی زن زناتی ہوئی ریل گاڑی روندتی کچلتی گزر گئی تھی۔ ریل کی پٹڑی پر دھرا کچلا نچا، وجود

دھونخار ہا تھا جس کا لوہا دخانی انجن کی حرارت سے پگھل کر چڑ مڑا گیا تھا۔

اکبر خان اگلی صبح ہی اُدھر اسلام آباد کے کسی ہوٹل میں چلا گیا تھا شاید شکیلہ جان کے آسیب کو برداشت کرنے کی سکت اس فوجی کے حوصلوں سے سوا تھی۔ آنکھوں کے کالک بھرے دِیئوں میں جو واٹ جلتی تھی وہ اب بھی اپنی ساخت میں برقرار تھی۔ ہڈیوں کے پنجرہ وجود کو جو روگ لگ گیا تھا وہ اُسی کا دیا تھا۔ جو آج بھی تازہ زخم کی طرح دھڑکتا اور لہوا گلتا تھا۔

اکبر خان کے لیے کسی بھی دفاعی یا جارحانہ حکمتِ عملی کے تحت سمجھ میں نہ آتا تھا کہ دھتکار، نفرت، دُوری، لاتعلقی کا کوئی ردِّ عمل ہی ظاہر نہ ہو، ایسے بھوت پریت سایے یا آسیب کا انسانی زندگیوں سے کیا تعلق۔۔۔ وہ منہ کی چوٹ کھا کر سٹپٹا کر لوٹ گیا۔ ''چڑیل بھوتنی آسیب۔'' یہ پوٹھوار کی پاگل عورتیں کب بدلیں گی۔

غزل جان آٹھویں برس میں تھی جب اس کا باپ اصغر خان ولائت سے دو مہینے کی چھٹی پر آیا۔ پورے علاقے کے لڑکے جلوس کی شکل میں اُسے لینے کو ایئر پورٹ پر پہنچے۔ وہ اپنی بھیجی ہوئی ولائتی ری کنڈیشنڈ گاڑی پر پہلے قبرستان گیا اور فاتحہ خوانی کے بعد صوبیدار حکم داد کی قبر کی عالی شان تعمیر کا حکم دیا اور پھر نئی تعمیر شدہ کوٹھی میں یہ قافلہ جا اُترا۔

محمد جان انگلینڈ سے آئے اٹیچی کیس گن گنا کر پہلے ہی اندرونی کوٹھڑی میں رکھ چکی تھی اور چابی پراندے کے دھاگے سے باندھ پھر بیٹے سے ملی تھی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھا دیا تھا کہ تحائف کی تقسیم وہ خود سوچ سمجھ کر کرے گی۔ اب اس گراں میں مشترکہ ملکیت والا نظریہ بدل گیا تھا۔ فوجی بوٹ جیکٹ، لیمپ، لالٹین، ٹارچ، ریڈیو، ترپال، چھتری، دیگچے، بستر، بیگ، بستر بند وغیرہ کے مشترکہ استعمال میں اب جداگانہ ملکیت والا نظریہ پیدا ہو گیا تھا۔

نوجوان خوابوں کے دیس کے قصے سننے کے منتظر تھے۔ جہاں کمرے اور پانی ہر وقت گرم رہتے تھے۔ جہاں ہسپتالوں میں مفت علاج ہوتا تھا۔ جہاں ٹرینیں زیرِ زمین چلتی تھیں اور میمیں مختصر لباس میں لفٹیں چڑھتی اُترتی تھیں اور ہاتھ برابر دھجی لپیٹے خود کو سانولا کرنے کی خواہش میں

دھوپ میں نہاتی تھیں اور جہاں شراب سرِ عام پی جاتی تھی۔ لیکن صنوبر اُس رات کی کوئی بچ رہی کترن ٹٹولتی رہی تھی جو ذرہ سی بھی اُس کے حصے میں نہ آ پائی تھی۔

اصغر خان نوجوانوں کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے تھک کر وہیں جدید تعمیر شدہ کوٹھی میں ہی سو گیا تھا۔ وہ خود جس کمرے میں لیٹی تھی وہ انگلینڈ سے آئے صندوقوں اٹیچی کیسوں سے بھرا تھا اور مبارکباد دینے کے لیے آنے والی خواتین انھیں حیرت اور حسرت سے لتھڑی بینائی میں لپیٹے ہوئے تھیں۔ غزل جان ایک بار ننھے ننھے پیروں کے ساتھ ان سیاہ اور نسواری پہاڑیوں پر چڑھنے کی کوشش کر چکی تھی لیکن بے جی کی ڈانٹ پڑنے کے بعد اب ماں کے وجود میں چھپی سرگوشیوں میں یہ پوچھتے پوچھتے سو گئی تھی۔

''صندوق کب کھلیں گے۔''

اُس کے بس میں ہوتا تو وہ سبھی کو فی الفور کھول کر دیکھ لیتی کہ کیا کسی میں اُس کے لیے کوئی ولائت کی میم آئی ہے۔

محمد جان نے سبھی صندوقوں کی چابیاں پراندے سے کھول کر اب نالے سے باندھ لی تھیں کہ کہیں پراندے سے رات سوتے سمے کوئی کھول کر صندوقوں کی تلاشی لے کر دوبارہ چپکے سے چابی باندھ نہ دے۔ ان صندوقوں کے اندر کیا بند ہے نہ کبھی وہ خود دیکھے گی نہ کسی کو دیکھنے دے گی، جان سے بڑھ کر حفاظت کرے گی۔ یورپ میں اِتنے برس کمائی کرنے والا اصغر خان ویسا ہی پوٹھواریا، لوٹا تھا جیسا کبھی یہاں سے گیا تھا۔ یہاں کی پوٹھواری زبان اور رہتل میں کیا کچھ آمیزنہ ہو گیا تھا۔ انگریزی، اُردو، پنجابی لیکن وہ وہی خالص دیہاتی پوٹھوار کی زبان اور بود و باش لے کر پلٹا تھا جو کبھی یہاں سے لے کر گیا تھا۔ اُس کے لب و لہجہ، عادات، کھانے پہننے کے طور اطوار کسی میں بھی یورپ مخل نہ ہوا تھا۔ یہاں کے پوٹھواری نوجوانوں کے مقابل وہ بہت پینڈو لگ رہا تھا۔ یہاں کے پوٹھوار کے قلب میں تو اسلام آباد جیسا یورپ آن آباد ہوا تھا۔ جس نے جدتوں کو نئی سمتیں فراہم کر دی تھیں لیکن خود ولائت میں رہنے والے پر ولائت نہ کھلا تھا۔ کہتے ہیں ولائیت میں

عورت مرد کے بیچ کوئی شرم نہیں ہوتی، لیکن یہ اصغر خاناں کس ولائیت میں رہا تھا کہ اپنی ہی بیوی سے یوں شرماتا، بدکتا اور بھاگ نکلنے کے رستے دیکھتا، جیسے ڈونگھے لڑ، کی کوئی جنّنی اُسے دبوچ لے گی۔ وقت نے اس گھرانے میں ولائیت کا پیسہ داخل کر دیا تھا تو ولائتی اشیاء اور استعمال نے مزاجوں میں بھی ولائتی رنگ آمیزی کر دی تھی لیکن اجتماعی بود و باش کا رواج ابھی بھی اس گراں میں مروج تھا جو صدیوں سے جاری وساری تھا۔

چاندنی کسوں کے گہرے نشیبوں میں بھرتی مکئی کے کھیتوں اور جھیل کے شفاف پانیوں میں بجھ گئی تھی۔ چاندی کی سیال کترنیں بہہ رہی تھیں، جھیلوں اور چشموں میں چاند پورا اُتر آیا تھا۔ چوٹیوں پر آبشاریں، چوے اور جھیل میں کئی چاند بھیگ رہے تھے، جو خفتہ جذبات کو گرم موم کی طرح پگھلا رہے تھے۔ ڈونگھے لڑ میں آج جنات کی شادی تھی۔ شب بھر ڈھولک بجتی رہی تھی اور صنوبر ولائتی صندوقوں سے بھرے اکیلے کمرے میں انتظار کے دبے قدموں کی آہٹ بن بجتی رہی۔ نو برس کے تنہا محبس میں منہ بند پڑی لاش بو مارنے لگی تھی۔ برف کی سلوں میں لگے زخم گرم آہوں میں پگھلنے لگے تھے۔ خلیہ در خلیہ ٹوٹ پھوٹ جاری تھی۔ سارے عضلات عجب توڑ پھوڑ کا شکار ہو چکے تھے جو پچھلے نو، دس برس رستے رہے تھے لیکن منہ کھولے ہو نکتے ہوئے ان زخموں پر پھاہا رکھنے کو کوئی نہ آیا تھا تو کیا آج بھی نہیں۔۔۔!

انھی دِنوں بڑے بھا پا جی بھی مسقط سے چھٹی پر آ گئے۔ اُن کے استقبال کے لیے نوعمر لڑکوں اور بزرگوں کا قافلہ چکلالہ ایئرپورٹ پر جمع ہوا اور اُنھیں ہاروں پھولوں سے لاد کر انگلینڈ سے لائی گئی گاڑی پر بیٹھا نئی کوٹھی میں لا اُتارا کیونکہ اب وہ حاجی بھی ہو گئے تھے۔

گراں کے بچے کھچے بزرگ مکہ مدینہ کی پاک فضاؤں، گنبدِ خضریٰ کے پُرنور نظاروں کے تذکروں، خانہ کعبہ کے سیاہ جھل مِل غلاف کے کسی ٹکڑے اور خاکِ پاک سے کلمہ طیبہ لکھے کفن کے خواہش مند تھے کہ خود تو حاضری کے قابل نہ ہوئے پر اپنے بچوں کے صدقے وہاں سے آئی کوئی نشانی تو چوم سکیں اور مرنے کے بعد سینے پر اسے سجا بسترِ قبر میں اُتر جائیں، تو اگلی منزلیں کتنی

آسان ہو جائیں گی۔

اردگرد کے گراؤں کے نوجوان عرب ریاستوں کے ویزوں کی خواہش میں بھاپا جی کے پیر ٹانگیں شب بھر دباتے رہے اور زینت بھابی اپنے حصے کی رات کا کوئی کونا ٹٹولتی رہی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ پتہ نہیں یہ تھکن تھی، ملاقاتیوں کی مصروفیت تھی کہ مُدّتوں مجرد زندگیاں بسر کرنے والے دساور سے کمائیاں لانے والے ان مردوں میں عورت کے وجود سے ہی مغائرت پیدا ہوگئی تھی کہ پردیس کے ٹھنڈے موسموں نے مردانہ صلاحیتیں ہی منجمد کر دی تھیں۔ ڈونگھے لڑ میں جنات کے ہاں کوئی مرگ ہوگئی تھی شاید...... لمبے پُرسوز بین، پتھریلی چٹانوں سے ٹکراتے تو جیسے دیگوں کے اندر کفگیر بجتے ہوں۔ یہ جننیاں بھی پوٹھوار کی عورتوں جیسی ہی دِکھتی تھیں۔ ان کے بین اور آہیں کراہیں بھی انھی کی طرح ہی کرب ناک تھیں جو چیختی گونجتی تیز آوازوں میں شب بھر نوحے رُلاتیں رہیں۔ مشترکہ صحن میں سوئی عورتیں منہ کھولے خراٹے لیتی تھیں لیکن چھت پر سوئے مردوں میں کسی ایک کے پہرے پر بیٹھنے کی روایت ابھی بھی باقی تھی۔ اب تو یوں بھی دساور کی بے اَنت کمائیاں آ گئی تھیں۔ ان گراؤں میں بھی ہوس اور آپا دھاپی متعارف ہو رہی تھی۔ بھابھی زینت اور صنوبر اس کڑے پہرے میں رات بھر کروٹیں بدلتی تھیں۔

ہائے لوٹی ہوکو ہائے! برسوں بعد پلٹنے والا اِک بار تو پوچھے کہ پَون پَون صدی کے ایک ایک برس کے کس کوہِ گراں کو سَر پر رکھ کتنی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں عبور کیں۔ کتنے چشموں، آبشاروں میں منہ ناک غوطائے۔ کتنی تیرسی چوٹیاں چڑھیں کتنے اندھے نشیب پاٹے۔ ڈونگھے لڑ، کی جننیاں حال دھائی مچاتی رہیں، شاید اُن کے مرد بھی کسی جدید تعمیر شدہ کوٹھی میں خراٹے بھرتے بے خبر تھے۔ پیاسی پیاس پکارتی رہی، لیکن سب نظریں تو بند اٹیچی کیسوں اور بھرے بٹوؤں کی خیر گی میں حیران تھیں۔ چاندبھری رات میں پکارتی کرلاتی ان چکوروں کی تڑپ پھڑک کون دیکھتا۔

بڑے بھاپا جی کا چھٹی لے کر اور اِتنے پیسے کرائے پر ضائع کر کے آنے کا ایک خاص مقصد تھا۔ اُنھوں نے فیصلہ سنایا خاندان بھر کی کنواری لڑکیوں کی خاندان کے اندر موجود لڑکوں کا

جوڑ دیکھ کر شادیاں کر دی جائیں۔ تین لڑکے تو گھر کے اندر موجود تھے وہ اگر چوں چراں کرتے بھی تو بس صیاد کے پنجرے کے اندر ہی پھڑ پھڑا سکتے تھے۔ دو کے ویزے اصغر خان کے پاس تھے اور ایک کا بڑے بھا پا جی کی جیب میں محفوظ تھا۔

یہ ایک خاموش ڈیل تھی کہ شادی ہماری پسند کی اور ویزے تمہاری پسند کے۔ مسئلہ اظہار الحق کا تھا جو پچھلے پانچ برس سے کراچی میں نوکری کر رہا تھا اور واپس پلٹنا اُسے اب یاد نہ رہا تھا۔ اُس کے نام سے بندھی فاطمہ شاید اُس کے حافظے کے کسی خانے میں گھر نہ بنا سکی تھی، جس نے اظہار الحق کے سویٹروں کے اتنے خانے بنے تھے کہ خود بھی انہی خانوں میں کہیں پروی گئی تھی۔ جو اُس بیری کے پیڑ کی حفاظت میں کنکر پتھر اُٹھائے برسوں سے چڑیاں، گھگھاں، لالیاں اُڑاتی رہی تھی، جس کے سایے میں کبھی اظہار الحق کتابیں پڑھتا تھا اور کھکھڑ یوں سبزیوں کی واڑیوں کی حفاظت کرتا تھا، جہاں اُس کے پیروں کے نشان ذرے ذرے پر ثبت تھے۔ پانچ برس سے فاطمہ ان کُھروں کی شناخت دِل کے نقشِ پا میں چھپائے ایک ایک نشان کا شمار کرتی تھی۔ بنا چھاپ کی اُنگلی میں ایک ہی نام کا چھلا دِن میں ہزاروں بار گھماتی تھی۔ چوے کے پانیوں میں ایک ہی شبیہ بنتی بگڑتی تھی۔ لال مٹی اور چتکبرے پہاڑوں کی فصیلوں کے اندر ایک ہی نام کی بازگشت ٹکراتی تھی، جسے جنات بھی اُس کے ساتھ بار بار دُہراتے تھے۔

''اظہار الحق، اظہار الحق۔'' خود جس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ اَن پڑھ پوٹھوارن آخر خود کو اُس کے نام ہی کیوں وقف کرنے پر تلی ہے۔ اس خاندان کی لڑکیاں بھی وقف کی اِملاک کیوں بن جاتی ہیں۔ درگاہوں کے مجاور جیسے ایک ہی نام پر دھمال ڈالتی ہوئیں۔ حشیش کی بھنگ کوٹتی مست ملنگ سی، ایک ہی ریشم کا تار خود سے لپیٹتی گھٹ کے مر جاتیں۔ خود ہی شہد بناتیں اُسی میں غوطاتیں۔ پتہ نہیں پوٹھوار کی عورتوں کو وفا کی گُھٹی یہاں موجود ہر ٹیلے ٹبے پر بنے مزاروں، درگاہوں اور چڑھاوؤں نے پلائی تھی کہ پیروں مریدوں والے کلچر نے دھونی دھمائی تھی۔

تین شادیاں تو باہر سے لائی گئی ڈالروں اور ریالوں کی کمائی سے دھوم دھام کے ساتھ انجام

پائیں۔اب کی باردوستالےادھر گوجر خان، دینہ، جہلم، اٹک تک سے بینڈ باجوں کے ہمراہ، چاندی کی لڑیوں والے گانوں اور سوسو روپے کے نوٹوں والے ہاروں کے ساتھ دھوم دھام سے پہنچے تھے اور عورتوں کے گیتوں کی لے کے ساتھ ادھر ڈونگھے لڑ، کی جـــنـیـــاں باری دیتی رہی تھیں۔ڈھلانوں نشیبوں میں پھیلے گھنے رَتھ (جنگل) میں شکار کھیلتے اور بلندیوں سے گرتی آبشار سے پانی پیتے بھیڑے، سوّر اور چیتے ان آوازوں سے ڈر کر گپھاؤں میں چھپ جاتے اور ڈھولکی کی بازگشت بھنبھار دہین والے کسوں میں دن رات بجتی رہتی۔ابھی سہاگ پڑے کی خوشبو آنگنوں میں پھیلی تھی۔کلیوں سے ٹنگے سہروں کے پھول ابھی تازہ تھے۔مہندی والے ہاتھ ابھی مہک چھوڑ تے تھے۔شنیل کے سوٹوں پر دبکے کا کام ابھی جھلملاتا تھا۔سونے کے کڑوں کی دمک ابھی گہری سنہری تھی۔ڈونگھے لڑ، کی جـــنـیـــوں کے گیتوں کی لے ابھی نشیلی تھی کہ تینوں دلہوں کو لے کر ہوائی جہاز اجنبی فضاؤں میں اُڑ گئے اور تینوں دُلہنیں انتظار کے بے کنار آسمانوں میں تنی بے انت خوابوں کی قوسِ قزح میں جھولتی رہ گئیں۔

یہ ستر کی دہائی تھی جب پوٹھوار میں سے ہر وہ مرد جو اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکتا تھا ہر وہ بچہ جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔وہ پاسپورٹ بنوا کر بیرونِ مُلک کمائی کرنے چلا گیا تھا۔بڑے بوڑھوں کا خیال تھا۔پوٹھوار مردوں سے ایسے ہی خالی ہوا ہے جیسے کبھی لام کے زمانے میں اُجڑ گیا تھا۔عورتوں اور قریب المرگ بوڑھوں کے سوا چلتا پھرتا کوئی مرد نظر نہ آتا تھا۔جو کنواری تھیں اُن کے بیاہنے کو بر نہ رہا جو منگی تھیں وہ سروں پر جمی سیاہ چادروں میں چاندی کے تار چھپائے انتظار کے بوجھ تلے کمر خمیدہ ہونے لگیں۔جو بیاہی گئی تھیں وہ کوکھ میں نئی دھڑکنیں شمار کرتی فضاؤں میں اُڑتے جہازوں کو گنتیں شاید کوئی جہاز اُسے لے کر لوٹ رہا ہو جو اُس نام کو شکل دے جائے، جسے بچوں نے بس سنا تھا دیکھا کبھی نہ تھا۔جو بے جی کو پیسے بھیجتے تھے اور بے جی چھپا چھپا رکھتی تھیں اور راہ جاتی عورتیں پوچھتی تھیں۔

"'پیو کدوں مُڑسی آ۔'' (تمہارا باپ کب لوٹے گا) اور مائیں بین کے انداز میں ہجر کے گیت گاتیں اور آنسوؤں سے تکیے اور کان بھگوتی تھیں۔

بنا باپ کے یہ بچے اب جوان ہونے لگے تھے۔ سہاگنیں بیواؤں جیسے شب و روز کے
کولہو میں جتی قبل از وقت بوڑھی ہونے لگیں۔ ان پڑھ ماؤں کے بچے ادھر رواٹ، سہالے، گوجر
خان اور پنڈی کے انگریزی سکولوں میں پڑھتے تھے اور ولائتیوں کے بچے کہلاتے تھے۔ ان دنوں
گراں کے گھروں میں نل لگ گئے تھے۔ نئی طرز کے باتھ روم بن گئے تھے۔ لڑی ویران ہوگئی تھی۔
جہاں ہر جھاڑی کے پیچھے بیٹھے بچے مونگ پھلی چباتے اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے
تھے۔ یہ قدرتی لیٹرینیں عورتوں اور مردوں کے لیے الگ الگ مخصوص تھیں لڑی کی سمت کبھی کوئی
مردنہ پھٹکا تھا۔

پتھروں سے اسارے ہوئے مکانات شاندار کوٹھیوں میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ جن کی چھتوں پر پانی کے ٹینک رکھے تھے۔ ٹھنڈے گرم پانی کی ٹونٹیاں لگی تھیں۔ گیزر اور ہیٹر چلتے تھے۔ اب چوے کا پانی کناروں کناروں بہتا تھا لیکن اسے پینے والا کوئی نہ تھا۔ فریج اور کولر کے ٹھنڈے پانی گھروں کے اندر دستیاب تھے۔ کوئی گھڑے بھرنے کی مشقت کیوں کرتا۔ پہاڑوں سے اُترتی چٹانوں سے منہ زور ٹکراتی آبشار ندی بن نشیب میں پُرشور بہتی تھی لیکن کپڑے دھونے کو کوئی عورت سَر پر پنڈ اُٹھا کر پگڈنڈی نہ اُترتی تھی کہ اب تو واشنگ مشین کا رواج ہو چلا تھا۔ دیسی صابن کی جگہ واشنگ پاؤڈر استعمال ہونے لگا تھا۔ مونگ پھلی کے کھیت پہلے بٹائی پر دیئے گئے پھر بٹائی کرنے والے بھی ادھر مسقط اور دبئی میں سیکڑوں منزلہ عمارتوں کی تعمیر کے لیے سمگل ہو گئے۔ کاشتکاری کے طریقے فراموش ہو گئے۔ مونگ پھلی، مکئی، باجرہ، جوار اُگانے والے کھیت سوکھنے لگے۔ مینہہ اب بھی برستے تھے جنھیں کبھی کسان سونے کی بوند کہا کرتے تھے لیکن اب اس سونے کو کٹھالی میں پگھلانے والا کوئی کیمیاگر نہ بچا تھا۔ گندم کی گہائی اور مونگ پھلیوں کی کھدائی کے موسم میں سجنے والے میلے، خواب و خیال ہو گئے تھے۔ رہٹ کے کنویں سوکھ گئے تھے اور ٹنڈیں بے نور آنکھیں کھولے گئے وقتوں کی یاد میں دھول سے اَٹی تھیں۔ گس اور پہاڑ اُترتے چڑھتے رستے کانٹے دار جھاڑیوں سے بھر گئے تھے۔ اب ان پر کون آنے جانے کی مشقت کرتا کہ ہر گھر کے کار پورچ تک

سیاہ کشادہ سینے والی پکی سڑک بنی تھی جس پر امپورٹڈ گاڑیاں فراٹے بھرتی تھیں۔

سولہ سترہ برس کے نوعمر لڑکے سکول چھوڑ کر باہر کے ویزوں کے منتظر، باپ چاچوں کی بھیجی ہوئی کمائی سے بیل باٹم پتلونیں پہن امپورٹڈ گھڑیاں اور عینکیں لگا کر ادھر چاندنی چوک اور راجہ بازار میں، قلمیں بڑھا کر، ون ویلنگ کرتے موٹر بائیک کے سائیلنسر پھاڑ کر ڈن ہل کے دھوئیں چھوڑتے اور ڈالروں اور ریالوں میں ان کی قیمتیں بتاتے تھے۔

یہ علاقہ جہاں کا تقریباً ہر مرد انگریز کے زمانے میں بھی پڑھا لکھا تھا لیکن اب باہر کی کمائی سے پروان چڑھنے والے یہ لڑکے آٹھویں نویں جماعت سے ہی لڑھکنے لگے اور نئے ماڈل کی گاڑیاں فل اسپیڈ میں اسلام آباد کی یورپی طرز کی سڑکوں پر گھماتے ہوئے اپنے ویزوں کا انتظار کرنے لگے۔

اسلام آباد اور پنڈی کی جدید کالونیوں، بلاکوں میں ولائت کی دولت سے ماڈرن کوٹھیاں بن گئی تھیں۔ جو سفارت خانوں اور بیوروکریٹس نے مہنگے کرایوں پر اُٹھا رکھی تھیں اور جن کے کرائے یہ نوعمر لڑکے وصول کرتے اور دِن بھر اس جدید شہر کی مہنگی مارکیٹوں اور ریستورانوں میں بنا محنت کے ہاتھ آئے پیسے کی نمائش کرتے، لیکن رہتے اسی گراں میں تھے جسے چتکبرے پتھروں والے ٹیالے پہاڑوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جن پر بل کھاتی پگڈنڈیوں کے لہریے چڑھتے تھے جو اب قدموں کے لمس کو ترس گئے تھے۔ جن پر خارزار پھیل گئے تھے اور بھوت پریت کی بستیاں سدا سہاگن ہو گنجان ہو گئی تھیں۔

جھلی میرن کے چرانے کو کوئی گائے بھینس نہ رہی کہ گھروں میں تو اب ڈبے کا دودھ استعمال ہوتا تھا۔ وہ دن بھر تھور اور جنگلی جھاڑیوں سے اَٹی پگڈنڈیوں پر لیرو لیر پیروں کے درمٹ مارتی شرم کے گھونگھٹ میں منہ چھپائے ہر ایک کو بتاتی پھرتی تھی۔

''اج ہندوستان نی قید اِچوں چھٹ آ سن، جرنیل صاحبے ناں ٹیلی فون آیا ہے، پیشی ویلے گڈ ئیوں لہسن۔''

اُس روز وہ کلاعام ریلوے اسٹیشن پر اپنے فوجی کی گاڑی کا انتظار جنگلی پھولوں کے گلدستے کی مہکاروں میں لپٹی تادیر کرتی رہی تھی پیشی گزری، دیگر ویلا بھی گزر گیا کفتاں کی بانگ آ گئی۔ آخر جب ناکام لوٹی تو اندھیری رات کسوں میں مہنا منہ بھر چکی تھی۔ ہر سو جنات چھل قدمی کو نکل آئے تھے۔ جن رستوں کو لیرو لیر تلووں سے عمر بھر روندتی رہی تھی وہی سمجھ نہ آئے۔ جب اندھیروں کی پالکی میں سوار یہ کنواری دُلہن اپنے سسرال اُتری تو اسے ڈھونڈنے کے لیے جانے والا کوئی جواں مرد گراں بھر میں موجود نہ تھا۔

مغرب کی اذان کے بعد عورتوں کو یقین ہو چکا تھا کہ جھلی کہیں کھوگئی ہے لیکن کسں اُترنے کی ہمت اب ان عورتوں میں بھی نہ رہی تھی جو تین تین گھڑے اُٹھا، میلے کپڑوں کی پنڈیں سَر پر رکھ تیر سی چڑھائی ایک سانس میں چڑھ جاتی تھیں۔

اگلی صبح ٹیلی فون کر کے ادھر روات سے مزدور بلائے گئے جو دوپہر تک جھلی کی لہولہان لاش ڈھونڈ لائے جس کے ہاتھوں میں ابھی بھی بنفشے کے پھولوں کا گلدستہ جکڑا تھا۔ جسے الگ کرنے کو ہاتھوں کی اُنگلیاں کڑک کڑک توڑنا پڑیں لیکن ابھی بھی گھونگھٹ سَر سے ذرا نہ پھسلا تھا۔ ہونٹ وا تھے۔ جن پر زندگی کا گیت دھرا تھا۔

''ہندوستان نی قیداچوں چھٹ آ سن جرنیل

صاحبے ناں ٹیلی فون آیا ہے۔

باہر کے ویزوں کے منتظر نوعمر لڑکوں اور موت کے ویزوں کے منتظر بزرگوں نے اُس کی نمازِ جنازہ پڑھی تو دس پندرہ افراد سے زیادہ کی جماعت نہ بن سکی تھی۔ البتہ عورتوں کی تعداد اس قدر تھی کہ گھر بھرے تھے۔ جنھوں نے جھلی میرن کا ماتم اس شدت سے کیا جیسے برسوں کی تنہائی، ڈھلتی جوانی کا کرب، بے سمت زندگیوں کا قلق اور تبدیل ہوتے حالات میں پتھرا جانے کا کرود سب مِل کر بینوں اور سینہ کوبی کی شکل میں پھوٹ نکلا ہو۔ دُنیاداری کا ضبط، پوٹھواری عورت کی بھاپ کے دم پر لگی حیا کا اُبال اور تنہا جوانیوں کا اُمس سینے اور رانوں پر پڑتے زوردار دھمکوں میں

خارج ہو رہا تھا۔ یہ موتیں اور ماتم بھی دراصل پوٹھوار کی عورتوں اور جننیوں کے انقباض کا عجب نکاس قدرت نے رکھ دیا تھا، ورنہ محرومیوں کا کچرا حسرتوں کا کوڑا، تقدیر کی بے رحمی کا فضلہ دِل کی شریانوں میں جم کر دماغ کی نسوں میں بھر کر اِک روز پھٹ نکلتا تو بہت جگ ہنسائی ہوتی۔

شکیلہ جان بے ہوش ہو ہو کر گری فاطمہ نے منہ سَر پیٹ پیٹ زخمی کر لیا۔ صنوبر کے پُرسوز بینوں سے بزرگ بھی پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

''ہائے میرن تیرا فوجی ہندوستان کی قید سے چھٹ کر نہ آیا۔ تو آپ ہی اُسے ملنے کو زندگی کی قید سے چھٹ گئی۔ جو اِک بار گیا کب مڑا جو سکھ چین کی گٹھڑی باندھ لے گیا وہ بھار اُٹھائے واپس کب پلٹا۔''

فاطمہ تو ذومعنی بین بھی نہ کر سکتی تھی کہ نہ نکاح نہ منگنی کی اُوٹ سوائے انتظار کے اخلاقی و سماجی دباؤ کے، کوئی قانونی کوئی معاشرتی ربط تو نہ تھا جو اظہار الحق کو کراچی سے کھینچ لاتا جو کراچی گیا وہ کب پلٹا۔ کہتے ہیں چار چوفیرے سمندر پھیل جاتا ہے اور ساری کشتیاں ساحلوں پر پھونک دی جاتی ہیں۔ یہ سمندر بڑے ظالم لاشیں بھی پلٹنے نہیں دیتے۔

شکیلہ جان کے پاس نہ شہید شوہر کی وفا اور کارنامہ، نہ قبر کا تعویذ جس سے لپٹ کر رونے کو سرہانہ تو میسر آ جاتا۔ وہ ٹوٹے ہوئے من والی چکی کو گھوں گھوں گھومتے ہوئے دیکھتی جس نے مُدت ہوئی پیسنا چھوڑ دیا تھا کہ اب آٹے کے تھیلے ادھر پنڈی شہر سے منگوائے جانے لگے تھے۔ تندور کے مٹھ ٹوٹے تھے اور سینے سے لپاٹے (پلستر) اُتر گئے کہ روٹیاں تو اَب گیس کے چولہوں پر پکتی تھیں۔ مرغیوں کے ڈربے پرانی بیٹھوں کی بدبو چھوڑتے تھے لیکن مرغیوں کے پرے مر گئے تھے کیونکہ فارمی گوشت کا رواج ہو چلا تھا۔ چونگیں اور خودرو جنگلی کریلے ڈھونڈ کر لانے والا کوئی نہ رہا تھا۔ مختار بھی ادھر فوج میں بھرتی ہو کے افغانستان کے محاذ پر لڑنے چلا گیا تھا۔

جھلی میرن کے پاس پاگل ہونے کا جواز تھا۔ زرینہ جان کے پاس میر حسن کی قبر کو عمر بھر سنبھالنے کا جواز تھا۔

صنوبر کی ماں کے پاس شہید کے نشانِ جرأت اور وردی والی تصویر کو پہروں دیکھنے اور فخر یہ آنسو بہانے کی پوری آزادی تھی، لیکن شکیلہ اور فاطمہ نامحرموں کا نام بھی زبان پر کیسے لاتیں۔ رونے ماتم کرنے کا کوئی کھلا جواز نہ بچا تھا۔ ہمدردی جتانے، دُکھ بانٹنے کا اخلاقی سہارا بھی نہ رہا تھا اور ان اکیلی رہ جانے والی سہاگنوں کے دُکھ منانے، غم دِکھانے کا حق بھی ہوائی جہازوں میں لد کر اُن سے چھن گیا تھا کہ گودیوں میں کھیلنے والے اُن کے بیتے سہاگ کی نشانیاں ان کے پاس جو تھے۔ جن کے وجود سے جڑی وہ چند راتیں بار بار یاد کرنے کے باوجود اب اپنی جزئیات کی کڑیاں اور ذائقے گم کرتی جارہی تھیں۔ وہ اتنی زرخیز کیوں تھیں کہ بس کوئی چھو کر گزر گیا اور اپنے لمس کی سند چھوڑ گیا۔ جس لمس کا ذائقہ تک محسوسات سے کہیں دُور پرے ہوگیا تھا جو پرانے درد کی طرح اندر ہی اندر ٹیسیں چھوڑتا گند مارتا تھا لیکن نکاسی کے لیے کوئی اخراج نہ بنتا تھا۔ وہ ایک دوسری کے گلے لگ ذو معنی بین ڈالنے لگیں۔

''ہائے رونے کا سواد نہ رہا۔ ماتم کا بھی اب مزا نہ رہا۔ ہائے کیا ویلے تھے۔ چالیس دیہاڑے پھوڑی پڑی رہتی ایک گراں میں مرگ ہوتی۔ ماتم آٹھ گراؤں میں ہوتا۔''

''ہائے لوٹی! آنکھوں کے چوے سوکھ گئے کہ دِلوں کے ٹوبے اہین بن جم گئے۔ ہائے لوٹی کتنا پٹ کلٹا پڑتا۔۔۔

رو رو کر دِل کی آگ آنسوؤں سے بجھتی پیٹ پیٹ جگر ٹھنڈے ہوتے۔ موت ایک ہوتی دُکھ ہزار کھل اُٹھتے۔ کس کس کھر انڈ سے درد چن لیتا یہ ماتم یہ پٹ کلٹا۔ ہائے اب تو مرگ کے بہانے دِل کے دُکھڑے رونے کا رواج بھی نہ رہا تھا۔ اب کوئی اندر کا دوتھڑ کیسے باہر نکالے۔

یہ دُکھ اندر ہی اندر پلٹتے کالے یرقان بننے لگے۔ دِلوں کے روگ لاعلاج مرضوں میں تبدیل ہونے لگے۔ اب کہاں کھل کر روئیں کہ اندر کی لگی بجھ پائے۔ ہائے لوٹی۔ ہوکو چندرا۔۔''

شاید یہ آخری روایتی ماتم تھا جو تمام ہو رہا تھا۔ ہائے کیا کریں گی یہ بندھی گھٹی عورتیں۔۔۔

اب تو رونے کے موقعے بھی ختم ہو گئے تھے۔ بھا پا جی جب مسقط سے وطن واپس آئے تو ادھر گراؤں

میں چپکے چپکے شہر داخل ہو چکا تھا۔ بجلی کے کھمبے اور ٹیلی فون کے تار بچھے تھے۔ ہر سو پھیلی پکی سڑکیں گراؤں کو شہروں سے جوڑ رہی تھیں۔ چوے کا پانی منہا منہ اُبلتا ضائع جا رہا تھا۔ گھروں میں تو واٹر پمپ لگ گئے تھے۔ نوجوان وی سی آر پر ہندوستانی فلمیں دیکھتے تھے اور پیپسیاں پیتے مِلک شیک اور برگر کھاتے تھے۔ مٹھیاں روٹیاں اور پوڑے اب یادداشتوں میں رہ گئے تھے۔

ما بختو، نسوار کی چٹکی نتھنوں سے کھینچتی بین بھرے بازو چار چوفیرے لہراتی۔

''ہائے جینے کا سواد نہ رہا...... کبھی اوس میں بھیگتے گھڑوں میں بھرے چوے کے پانی کا ایک پیالہ پی لو تو دِل جگر ٹھنڈے ہو جاتے تھے۔ ہائے یہ فریج کی بوتلیں تو نرا ساڑا...... ہائے! پٹھ کی بوٹیوں میں چو ہنگیں ڈال دیسی گھی میں بھون کے پکاتی۔ چپڑی تنوری روٹیوں کے ساتھ منہ سے نہ اُترتے۔ ہائے یہ فارمی گوشت کھادوں والی سبزیاں نہ شیریں رہی نہ سواد رہا۔''

پچھلی نسل کی عورتیں بجلی کے پنکھے بند کر کے دستی پنکھے جھلتیں اور گئے موسموں کے ذائقے اور واقعے یاد کر کر رانیں کوٹتیں۔

''ہائے ہائے لوٹی ہوکو۔ گرم ہوا، والے بجلی کے پنکھے۔۔۔''

زمانہ بدل رہا تھا ان پڑھ ماؤں کی بیٹیاں کالجوں میں پڑھ رہی تھیں۔ کوئی وکیل تو کوئی فیشن ڈیزائنر بن رہی تھی۔ اسی کی یہ دھائی پوٹھوار کے ان گراؤں میں ایسے داخل ہوئی تھی جیسے کبھی یہاں گھونٹ گھونٹ بہنے والا برساتی نالہ بارشوں کی رُت میں دھانے کھول کر یوں ڈکرانے لگتا تھا کہ سامنے آنے والی ہر شئے نگلتا چلا جاتا تھا۔ اتنے دھارے بہہ نکلے کہ پرانی نسل تنکوں کے سہارے گم کرتی ڈوبنے لگی۔ صنوبر کی بڑی بیٹی غزل جان تھرڈ ایئر میں پڑھتی تھی اور چھوٹی ابھی دس برس کی تھی کہ تبھی اچانک سب پر یہ اِنکشاف شدت کے ساتھ ہوا کہ اصغر خان کی تو کوئی اولادِ نرینہ ہی نہیں ہے۔ جب کہ صنوبر جان چاندی جیسے بالوں کو سفید چادر میں ڈھکتی ہے تو بے جی محمد جان کی بڑی بہن معلوم ہوتی ہے۔ شاید اس لیے کہ اُس کے پاس رائیگاں انتظار کے بے انتہا دِن گننے کے سوا عمر بھر کوئی مصروفیت ہی نہ رہی تھی۔ کیا اسلام آباد کی یہ کوٹھیاں اور پنڈی کے

شاپنگ پلازے بیٹیوں کے جہیز میں چلے جائیں گے۔ اُنھوں نے اصغر خان کو فون کیا کہ فی الفور تین مہینے کی چھٹی لے کر وطن پہنچے۔ شاید وہ یہ بھول گئے تھے کہ جانوروں، درختوں، جنگلی جھاڑیوں کے بارآور ہونے کی قدرت نے اِک معیاد مقرر کر رکھی ہے، لیکن اس پوٹھوار کی تاریخ کا یہ واقعہ عجب تھا کہ صنوبر جان نے اصغر خان کا استقبال کرنے سے اِنکار کر دیا۔ محمد جان جب اُسے میکے سے لینے کو گئی تو وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔

''بے جی! مجھے معاف کر دو اب یہ بھاڑے کی ماں بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں رہی۔ جس مقصد کے لیے وہ اپنا ٹکٹ اور قیمتی وقت ضائع کر کے آیا ہے جب میں وہ مقصد پورا ہی نہیں کروا سکتی تو اُس سے مِل کر خود کو شرمندہ کیوں کروں۔''

پوری برادری نے دباؤ ڈالا لیکن ساس کی ایک گُھرکی سے لرزنے والی حکم کی رسن سے بندھی یہ کھونٹے کی گائے اڑیل ہوگئی۔ کسی کو سینگ پکڑنے ہی نہ دِیئے۔ ان بیس برسوں میں دو مہینہ اور چھ دِن کی ازدواجی زندگی کی تفصیلات و جزئیات پر وقت کی دھول یوں بکھری تھی کہ کوئی نقش بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔ جس کے نام کی دو بچیاں کوکھ سے جنی تھیں، اب اس پر مسافتوں کی بہت گرد اٹی تھی۔ بیوگی کے خارزار ویرانے پھیلے تھے۔ وہ ان بے آب و گیا بنجر پگڈنڈیوں پر اِتنے سنگلاخ سفر طے کر چکی تھی کہ اب کسی نخلستان کے کھلنے کا احساس ہی مرجھا گیا تھا۔ پوٹھوار کے بارانی قطعات پر تھر کا ریگزار چڑھ بیٹھا تھا۔ جس کی تہ میں سارے بیج سنٹھ تھے ساری ہریالی یرقان گھلے زہریلے پانی چوس لے گئے تھے۔

آٹھ گراؤں کی عورتیں ہکا بکا تھیں اور کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں عورت کے حقوق اور مرد کی حاکمیت پر انقلابی خیالات کا اظہار کرنے لگی تھیں۔ اصغر خان حیران تھا جیسے کسی اجنبی شہر میں آ نکلا ہو۔ وہ صدیوں پرانے ان کسوں پہاڑوں کی نئی حیرتوں میں نقطہ سا سمٹ گیا۔ اب اس نئے سیٹ اَپ میں وہ کس قدر مس فٹ ہو گیا تھا۔ وہ یورپ کی آزادیوں میں بھی اپنے ماضی کی طنابوں میں کسا رہا تھا۔ وہی ماضی جواب قیامت کی چال چل کر سامنے کھڑا منہ چڑھا رہا تھا۔ اب اس کی

یہاں موجودگی کا کوئی جواز نہ رہا تھا۔ اپنے بھیجے گئے ڈالروں اور پاؤنڈوں میں ہی وہ منجمد تھا۔ خود اپنے وجود کے ساتھ یہاں اُس کی مناسبت کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رہی تھی۔ دونوں بچیاں بھی اس اجنبی باپ کے جانے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب رہنا ہی نہیں تو آنے کا مطلب؟ کوئی کام کوئی ضرورت کوئی تعلق واسطہ، برسوں عمروں بعد پھیرا مارنے والے جوگی سے کوئی کیوں رکھے پتہ نہیں پھر کبھی اس بستی سے گزرے کہ نا۔ اب اُس کی معنویت سرد موسموں کی کمائی میں منہ بند ہو گئی تھی۔
وہ منہ کی کھا کر لوٹ گیا۔

نئی پود کی یہ لڑکیاں جنھیں ماؤں کی محرومیوں نے ثمر بار کیا تھا۔ جن کی مشقتوں کے صلے کی آسودگیاں انھی کے مقدر میں آئی تھیں۔ ان کی اذیتوں، صبر وقناعت، بھوک اور بے بسیوں کا بیاج سود کے ساتھ ان لڑکیوں نے وصول کر لیا تھا۔ دُور پردیس میں تنہائی اور بے وطنی کی مشقتیں اور ذِلتیں جوان کے باپوں نے جھیلیں، قانونِ قدرت کے عدل کا انعام اب اس نسل کو عطا ہو گیا تھا جن کی تاریخ پیدائش اُن کے باپوں کی آمد کے یادگار سال سے ذہنوں میں تازہ رہتی تھی۔ اس سال کی یاد میں ان بچوں کی سالگرہیں منانے کا رواج اب ہو چلا تھا۔ اِدھر پنڈی سے کیک اور غبارے لائے جاتے اور انتظار کے سینے پر دھڑکتے ہوئے برسوں کے شمار کے لیے موم بتیاں جلائی جاتیں اور پھر اُنھیں بے معیاد انتظار کی پھونکوں سے بجھا دیا جاتا تھا۔

شکیلہ اور فاطمہ کے پاس تو اس دھول آلود راہ کی نشانیاں بھی نہ تھیں۔ گزری مسافتوں کے کوئی سنگِ میل بھی نہ تھے۔ جن سے عمرِ گزشتہ کا کوئی حساب ممکن ہوتا۔ سارا اردگرد جغرافیہ، ماحول سب تبدیل ہو چکا تھا لیکن دِل کے کھونٹے سے بندھی، گزرے موسموں کے سنٹھ لمحوں کے کھکھل میں سمٹی، یاد کے بجھے چراغوں کے دھویں میں لپٹی وہ کسی یادگار پر موم بتیاں روشن نہ کر سکتی تھیں کہ جن جھرنوں میں یاد کی روپہلی مچھلیاں تڑپتی تھیں اور گم نشانیوں کے ندی نالے بہتے تھے وہاں اب دُھواں اُگلتی فیکٹریاں کھڑی ہو رہی تھیں۔ جن پگڈنڈیوں پر عمر کے ماہ وسال اُترتے چڑھتے تھے وہاں اب تارکول کی سیاہ پکی کشادہ سڑکیں بچھ گئی تھیں۔ اب گزری یادداشتوں کے نقش پا کوئی

کہاں سے ڈھونڈ نکالے۔ جن چوٹیوں پر پھلا ہی اور بکائین کے جنگلوں میں اِکا دُکا دیودار اور کیل کے دراز قد پیڑ آسمانوں کو چھوتے تھے وہاں اب رہائشی کالونیاں تعمیر ہو رہی تھیں۔ چوے کا پانی پمپ لگا کر بوتلوں میں بھر بھر ادھر اسلام آباد کے بڑے بڑے اسٹوروں میں منرل واٹر بن کر بک رہا تھا اور خود اس گراں میں ٹونٹیوں اور فریجوں کا پانی پیا جانے لگا تھا۔

گزرے موسموں میں دس دس کوس کی چڑھائی چڑھ کر عورتیں تین تین گھڑے اُٹھائے یہاں بھرنے کو آتیں اور فجر سے عصر تک واپس چڑھائیاں اُترائیاں عبور کرتی گھر پہنچ پاتیں۔ لیکن یہ اس پانی کی شفا کی تاثیر تھی شاید کہ پھر بھی کبھی نہ تھکتیں۔ بعض اوقات غذا کی کمی اور بیماریوں کا معالجہ کسی غیر مرئی نسخہ ہائے کیمیا سے ہو جاتا ہے لیکن اب صدیوں پرانے اس چشمے کے پانی پر کائی کی تہیں چڑھ آئی تھیں۔ جس میں مینڈک ڈبکیاں لگاتے تھے، جن کی لمبی جاہنگوں سے لپٹے سیاہ جالے پانی میں گھلتے تھے۔ چاروں کناروں پر کائی اور سیاہی کا ملائم پھسلتا استر چڑھ آیا تھا اور پیندے پر سبز مخمل سی کائی کا فرش بچھ گیا تھا۔ جس کا عکس چوے کے شفاف پانیوں کو سمندری پانیوں سا رنگ دیتا تھا۔ ماڈرن کالجوں میں پڑھنے والے اس پانی کو Unhygienic قرار دے چکے تھے۔ اس لیے پائپ کا پانی اور سوڈا واٹر پیتے تھے۔ پانی کے بدلے ہوئے اطوار دیکھ کر پرانی نسل کے لوگ سہمے سہمے رہنے لگے کہ جب پانی اپنی تاثیر بدلتا ہے تو بپھر کر سیلاب ہو جاتا ہے یا پھر سوکھ کر نمک بن جاتا ہے۔ اس وقت زمین اپنی مٹھاس خود ہی چوس لیتی ہے اور جسم و جاں میں تھور بھر جاتا ہے۔ لیکن اب اس تھور کی حفاظت کے لیے چڑھاوؤں اور منتوں مرادوں والا درخت سونا پڑا تھا اور شفایاب پانی کہیں باہر سپلائی ہونے لگا تھا اور زیرِ زمین موجود سارے پانی کھارے تھے۔ پرانی نسل چڑھاووں، منتوں اور شفایاب پانیوں کی قلت کے خوف میں مبتلا ہو کر زرد رو پڑنے لگی۔ اُن کا خیال تھا کہ ہر شئے بکنے کے لیے نہیں ہوتی۔ مثلاً پانی، زمین اور منتوں والے پیڑ۔ ان پچھلی پیڑھیوں کی پرداخت چوے کے میٹھے پانیوں نے کی تھی اور خوف کی حفاظت منتوں مرادوں والے جھنڈوں نے، لیکن اب خوف پھلا ہی کے جھنڈ سے نکل کر خود اُن کے اندر اُتر کر بسنے لگا تھا اور چوے کا پانی کہیں باہر سپلائی

ہونے لگا تھا۔ جس کے بدلے اِتنی زرلی تھی کہ گراؤں کے گھروں کے فرش سونا رنگ ٹائلوں اور بوٹی سینا کے سنگِ مرمر سے سنہرے ہو گئے تھے۔ امپورٹڈ باتھ رُوم گولڈ پلیٹڈ تھے۔ فالس چھتیں سنہری اور آف وائٹ تھیں۔ فرنیچر سنہری ڈیکو پینٹس یا پھر براس جیسی سونا رنگ دھات کے بنے تھے۔ کراکری سنہری دھاریوں والی بون چائنا کی اور کٹلری گولڈ کوٹڈ تھی۔ جیسے ہر شئے پر سونے کا پانی چڑھا ہو کہ زیرِ زمین بہنے والے پانیوں میں سونے کی ڈلیاں گھل گئی ہوں۔ ہر چیز سنہری بھا مارنے لگی تھی۔ سنہری زمین، سنہرا آسمان اور سنہری پانیوں نے یہاں کے باسیوں کو بھی جیسے سونے کی قیمتی دھات میں لپیٹ دیا تھا۔ زرد آنکھیں، زرد چہرے زرد ناخن جیسے کوئی مصری ممیاں، جن پر سونے کا خول چڑھا ہو۔ یہ پرانی نسل زرد رو ہو کر کم یاب ہونے لگی کہ گراں کا گورستان جو پسماندگی کی بے شمار صدیوں میں اِتنا نہ بڑھا تھا جتنا ترقی کے ان چند سنہری برسوں میں پھلا پھولا۔۔ پتہ نہیں یہ زیرِ زمین بہتے پانی زرد رنگ کب سے ہو گئے تھے۔ شاید اس وقت سے جب قناعت کے خمیر میں گندھی اس دھرتی میں زر کے دروازے کھلے کہ مونگ پھلی اور مکئی اُگانے والی زرخیز زمینوں پر فیکٹریاں اور ملیں لگنے لگی تھیں یا شاید تب، جب قیمتی سامان سے جدید گھروں کو بھر کر قفل بند کر دیا گیا تھا اور اجتماعی استعمال کا صدیوں پرانا رواج ذاتی ملکیت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ یا شاید زینت اور صنوبر جیسی کتنی عورتوں کی ناتمام ہجر کی سیاہ راتیں قطرہ قطرہ گھل کر کالا یرقان بن گئی تھیں کہ شکیلہ اور فاطمہ کے بے اَنت انتظار کے بے فیض لمحوں نے اپنا زہر گھول دیا تھا۔

بزرگوں کی یہ پوری نسل جگر کے عارضے میں گھل گھل کر زرد پانی ہو رہی تھی۔ ان لاعلاج بیماریوں کا علاج ادھر اسلام آباد کے جدید ہسپتالوں میں ہوتا تو یہ اور بڑھ جاتیں۔ عجب تماشا ہوا تھا کہ بھوک اور چوے کا آلائشوں بھرا پانی افزائشِ صحت کا باعث تھا لیکن جیسے جیسے خوراک بڑھنے لگی۔ کثرت کے باعث سڑنے لگی اور کھانے والے گھٹنے لگے۔ تب یہ تشخیص ہوئی کہ ان گراؤں کا زیرِ زمین پانی سب یرقان زدہ ہے۔ جس نے ان سنہری بستیوں کے سنہرے گھروں میں رہنے والوں کو بھی زردہ رنگ میں رنگ دیا ہے۔

شکیلہ اور فاطمہ زرد رو چہروں اور بجھی پتلیوں والی مدقوق آنکھوں کے ساتھ کالے یرقان کی گھڑیوں میں منہ بند ہوتی چلی گئی تھیں۔ ہر گٹھڑی کے اندر یاد کی شبیہیں اور بے ثمر ماضی کی ٹیسیں بندھی تھیں۔

کبھی کبھار وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ رکھ چٹختی ہڈیوں کی پوٹلی سَر پر اُٹھا تھور بھری پگڈنڈیوں سے نیچے اُترتیں اور چوے پر کھڑی بکائین پر بندھی دھجیوں اور پراندوں کے سیاہ بوسیدہ ریشوں میں سے اپنی اپنی حسرتوں کی دھجیاں اور کترنیں شناخت کرتیں۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے اَٹی پگڈنڈیوں سے پرے آج بھی تیز رفتار ریل گاڑیاں گزرتی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں؟ اب کس کو سوار ہو کر یہاں آنا تھا؟ اب اس قصباتی اسٹیشن پر کسی کو نہ اُترنا تھا۔ اب تو جہازوں پر سواریاں جاتی تھیں اور واپس آنا بھول جاتی تھیں۔

اظہار الحق ادھر کراچی میں کسی لیڈی ڈاکٹر کا شوہر بن چکا تھا اور اِتنا مصروف ہو چکا تھا کہ اُس کے تینوں بچے شاید ددھیال میں سے کسی کا نام بھی نہ جانتے ہوں گے۔ انگریز کے زمانے کا یہ قصباتی ریلوے اسٹیشن اُن کے لیے تو کہانیوں کے بھوت بنگلے جیسا ہی ہوگا۔ پتہ نہیں یہ گاڑیاں گرم آہوں جیسا دھواں چھوڑتی اور جننیوں جیسی چیخیں، کراہیں مارتی، کیوں گزرتی رہتی تھیں۔ کوئی تو ان سے کہہ دے کہ اب تمہیں تھم جاؤ! تمہاری ہوک کوک سے جن سانسوں کے تار بندھے تھے وہ سانس تھک کر اب ٹوٹ گئے ہیں۔ جن جننیوں کے پُرسوز گیت ہمراہ تال دیتے تھے اُن کے ٹھکانے نئی کالونیوں نے ہتھیا لیے ہیں اور خود وہ اپنے گیتوں، بینوں، چیخوں، ڈھولکوں کے ہمراہ کہیں نقل مکانی کر گئے ہیں۔ یہ نوّے کی دھائی کی شروعات تھی۔ جب پوٹھواری زبان میں انگریزی لفظوں کی آمیزش ہونے لگی تھی۔ لڑکیاں لڑکے امپورٹڈ اشیاء کی قیمتیں ڈالروں اور پاؤنڈوں میں بتانے لگے تھے۔ اور یورپ کے خریداری مراکز کے نام بولنے لگے تھے۔ پھیلتے ہوئے شہر گراؤں کو لپیٹ رہے تھے وہ زمین جو کبھی بس اِتنی سی گندم اُگاتی تھی کہ طلائی زیور کی طرح بوری دو بوری کسی مہمان کی خاطر داری کے لیے سینت سنبھال کر رکھ لی جاتی تھی۔

بس اِتنا باجرہ جوار کہ جس کسی کو پیٹ بھر کھانا میسر آتا وہ امیر کہلاتا۔ بس اتنی سی مونگ پھلی کہ جس کے پکنے پر جوڑا دو جوڑا ششماہی خرید لیا جاتا۔ جسے جھیل کے چلو بھر پانیوں میں نتھار کر پھلاہی کی جھاڑیوں پر پھیلا کر بدن کی گٹھڑیاں اُن کے سوکھنے کے انتظار میں گھٹنوں بندھی رہتیں۔ انتظار تو ان پہاڑوں کے خمیر میں شامل تھا۔ بارش کا انتظار، موسم کے بدلنے کا انتظار فصل پکنے کا انتظار، چھوڑ کے جانے والوں کا انتظار کبھی نہ مڑنے والوں کا انتظار شاید یہ انتظار نسل در نسل جمع ہوتا رہا تھا اور اب موجودہ نسل کو اُن ساری بھوکوں، قحط سالیوں اور لاانتہا انتظاروں کو ڈھیروں منافع لگا کر لوٹا دیا تھا۔ گویا اس پہاڑی گاؤں کے پرکھوں کے سارے بے بس انتظار کی زرِخالص کہیں انشورڈ تھی۔ جو منافع کی بھاری شرح کے ساتھ یکمشت ادا کر دی گئی یہ کٹے پھٹے قطعاتِ اراضی جن کی پال میں لگے، انتظار دُکھ اور خشک سالیوں کے سنٹھ حلق آسمان کی سمت کھلے رہتے اگر تر ہو گئے تو گیہوں کی بالیوں کی لمبی لمبی شاداب زبانیں لہلہانے لگیں۔ نہ برسا تو حلقوم سے سینے تک سب پھونس۔ لیکن اب آسمانوں میں جذب ہونے والے اور زمین کے سینے میں اُتر جانے والے، سارے پانی یوں موسلا دھار برسے کہ پلازوں، کوٹھیوں، ہوٹلوں، فیکٹریوں کی بھرپور فصل سے سارے بنجر لہلہانے لگے۔ یہ پتھر بھی عجب خصلت رکھتے ہیں۔ روڑی بجری بنتے ہیں یا پھر ہیرے موتی بن نادر ہو جاتے ہیں۔ اُن دِنوں غزل جان لاء کی تعلیم حاصل کر رہی تھی جب بڑے بھاپا جی گردوں کے عارضے میں مبتلا ہو کر مسقط سے لوٹے تو اپنے ہمراہ بڑے بیٹے عثمان کا ویزہ بھی لے کر آئے لیکن یہ ویزہ اُسے غزل جان سے شادی کے بعد ہی ملنا تھا۔ عثمان جونویں جماعت میں فیل ہونے کے بعد اسی ویزے کا برسوں سے منتظر تھا۔ اس اِطلاع کی سرشاری کے ساتھ امپورٹڈ ہونڈا اکارڈ اسلام آباد کی ولائتی سڑکوں پر دیوانہ وار دوڑاتا اور نازیہ حسن اور ذوہیب حسن کے فاسٹ میوزک سنتا اور دوستوں کو اپنے ویزے اور شادی کے جشن میں شریک کرتا رہا۔ غزل جان یونیورسٹی سے لوٹی تو اس اِطلاع پر ہنس دی۔ جیسے کسی نے اُس کے تلووں میں گدگدی کر دی ہو جیسے جھلی میرن اپنے قیدی کے چھوٹ آنے کی اِطلاع دیتی تو عورتیں بے اختیار ہنس دیتی تھیں۔

"کیوں بے جی! آپ نے مجھے شکیلہ جان سمجھا کہ فاطمہ پھوپھی یا صنوبر جان۔۔۔ بے جی آپ کو سمجھنے میں تھوڑی غلطی لگ گئی میں غزل جان ہوں۔"

وہ یوں یکدم بول اُٹھی جیسے مختار مردانہ جسامت کے اندر سے زنانہ انداز میں کچھ بھی کہہ دینے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

کیا محبت، قربانی، وفا کا بھی کوئی جواز ہوتا ہے۔ غزل جان کہتی تھی ہاں ہوتا ہے، اندھے جذبے رائیگاں زندگیوں کے نوحے ہیں جنھیں الاپنا حماقت ہے۔ اردگرد پھیلی فیکٹریوں سے سفید دھوئیں کے مرغولے سورج کو دُھندلا رہے تھے۔ بارشیں کئی منزلہ بلند فلیٹوں کے چہرے دھو رہی تھیں۔ جن کے سنگ وخشت نکھر آئے تھے۔

شکیلہ جان فاطمہ جان اور صنوبر جان کو لگا جیسے مُدّتوں پہلے سرزد ہونے والے جرم کی پاداش میں عدالت آج آن لگی ہے۔ وفا اور ایثار کی راکھ پھرولتے کوئی دبی چنگاری پوروں پر چھالے بنا گئی ہے۔ بے مقصد راست جذبے، بے لوث اندھے رویے بے فیض قربانیوں کا جواز طلب کیا گیا ہے تو کیا غلط کیا گیا ہے۔ لیکن محبت کے تابوتوں میں مردہ پڑی یہ ممیاں لرز اگئیں۔

خاندان کی دوسری لڑکیاں بھی کُھل کر ہنسیں۔ نویں جماعت میں سے فیل لڑکا ایک ایڈووکیٹ لڑکی سے شادی کرے گا۔ کیونکہ وہ اُس کا تایازاد ہے اور اس خاندان کی روایت ہے کہ ہر لڑکی اپنے چچیرے، ممیرے، پھپھیرے بھائیوں کی بیوی بنتی ہے۔ چاہے یہ جوڑ کیسا ہی بے جوڑ کیوں نہ ہو لیکن اب زمانہ بدل گیا تھا۔ جس کی تبدیلی لڑکیوں کو بتا گئی تھی کہ اُن کا بھی اِک جوڑ ہے۔ اُن کے آوازے کا بھی جواب آنا چاہیے اور جس کا جواب نہیں آتا تو وہ کوئی غلط گنبد ہوگا۔

ٹیلی فون تو گھر وگھر لگے تھے۔ پل بھر میں غزل جان کی بے باک گفتگو اصغر خان تک پہنچا دی گئی۔ جو انگلستان میں بیٹھے پچھلے پچیس برس میں پاکستان میں تبدیلی کے طوفان کی آواز ہی نہ سن پایا تھا۔ اس گراں میں ڈالروں اور پاؤنڈوں کے ہمراہ خودمختاری اور حوصلے کی جو وبا در آئی تھی اُس سے وہ بے خبر تھا۔

''اُس کی رائے لینے کی ضرورت ہی کیا ہے ہماری روایت ہے کہ بچوں کے مستقبل کے فیصلے بڑے کرتے ہیں۔ یہ کوئی انگلینڈ نہیں وطن ہے۔''

بزرگوں کی مشاورت سے شادی کی تاریخ مقرر ہوگئی اور غزل جان کو اُسی شام تیل ہلدی مل کر مایوں بیٹھا دیا گیا۔ اتنے بہت سے ہاتھوں کے درمیان وہ تیل ہلدی سے لتھڑ پتھڑ ڈیزل کے ڈرم میں گری چڑیا کی طرح پھڑ پھڑاتی رہ گئی اور شگن سارے پورے کر لیے گئے۔

یہ نئے عہد کی لڑکی گانے کا بوجھ اُٹھا کر پندرہ دِن اگلی اندھیری کوٹھری میں کیسے مقید رہ سکتی تھی۔ اُسے یونیورسٹی بھی جانا ہوتا تھا۔ شادی کا جوڑا ابھی خود پسند کرنا تھا۔ زیور بھی نئے ڈیزائن کا بنوانا تھا۔ وہ تیل بٹنے میں لتھڑی مایوں والی اگلی کوٹھری میں کیسے بیٹھ سکتی تھی۔

وہ روز ہی رینٹ اے کار سے ٹیکسی منگوا کر باہر جانے لگی۔ کبھی صنوبر کو ساتھ لے جاتی کبھی اکیلی ہی چل پڑتی۔ بے جی تاسف بھری ہتھیلیاں رگڑتیں۔

''ہوکولوٹی! کڑی جے کر مایوں بیٹھتی تو مہینہ بھر کسی کی نظر نہ پڑتی۔ دِن بھر پیشاب بھی روکے رکھتی۔ باہر نکلتی بھی تو جب سارا گراں سوجاتا تو سہیلیوں کے جھرمٹ میں یہ بڑی سی چادر میں منہ سر لپیٹے ہوئے نکلتی۔ گرمیوں میں بھی صحن میں نہ سوتی کہ کہیں تیل ہلدی کی خوشبو سے کوئی جن پریت مست نہ ہو جائے۔ ہائے کیسی بے حیائی آئی ہے۔ کیا رُوپ چڑھنا اس بدذات کو ساری دیہاڑی تے چناں کھانی رہنی (آوارہ پھرتی ہے۔)''

وہ دِن اس گراں کی تاریخ کے گزشتہ سبھی واقعات سے بڑھ کر لرزا دینے والا روزِ حادثہ تھا کہ جب غزل جان کی مہندی کا جشن گھر میں برپا تھا اور خود وہ گھر میں موجود نہ تھی۔ مرد شادی کے انتظامات میں مصروف تھے۔ کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں بھی حیران تھیں۔ اگر پارلر گئی تھی تو اُن میں سے کسی کو ساتھ کیوں نہ لے گئی جب کہ سبھی نے مہندی کے فنکشن کے لیے اُسی پارلر سے تیار ہونا تھا۔ وہ دانتوں میں اُنگلیاں دابے اُس سے عجیب نفرت اور حسد محسوس کرنے لگی تھیں۔ جیسے ان سب کو ٹھینگا دِکھا کر نمبرون کی ٹرافی وہی لوٹ لے گئی ہو۔

مہمان جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ دُور دراز والے دوستالے آ پہنچے تھے۔ بینڈ باجے
اور جگتوں والے مراثیوں کو بیلیں ملنا شروع ہو چکی تھیں۔ لڑکے والے گھر سے آتش بازی کے
دھویں اُٹھنے لگے تھے۔ شرلیوں کی آگ آسمانوں تک پہنچ رہی تھی۔ عورتوں میں سے کسی کو یہ
جرأت نہ ہو پا رہی تھی کہ مردوں کو غزل جان کی گمشدگی کی اطلاع کریں۔ اگرچہ دو تین لڑکیاں
ٹیکسی منگوا کر چوری چوری بیوٹی پارلر بھی ہو آئی تھیں لیکن وہاں تو وہ سرے سے گئی ہی نہ تھی۔
یونیورسٹی بھی نہ گئی تھی تو پھر گئی کدھر۔ لڑکیاں پچھتاوے کے تاسف میں ایک دوسری کی آنکھوں
میں سے چور ڈھونڈتیں۔ کبھی کسی کے ساتھ بھی تو سنا نہ تھا یونیورسٹی میں بھی کسی کے ساتھ نہ دیکھا۔

شاید اندر ہی اندر۔۔۔

لڑکیاں یونیورسٹی کے کئی لڑکوں کو شک کی سولوں میں پروتی اور آنکھوں کی سوئیاں نکالتی

رہیں۔

بے جی محمد جان بوڑھے حلق کے بیمار سروں میں نیچے نیچے بین کرتی بخار میں بھنتی لحاف کی

قبر میں اُتر گئی۔

''ہائے پتہ ہوتا! کنجری ادھل ونج سی تے کدے نہ پڑھایاں پڑھواتی، ہائے کدے نہ
موٹراں جھٹواتی۔۔۔ ہائے یہ لچیاں مونگ پھلیاں کھودتی مکئی کوٹتی تین تین گھڑے سروں پر لادکس
چڑھتی ہی اچھی، ہائے میموں کے دیس کی کمائی کھا کر اُنھی کی ریس کرنے لگیں۔''

بے جی کے کمزور بینوں کے مرتے ہوئے سُر بڑے بھاپا جی کے کانوں میں بھی پڑ گئے تھے۔
لیکن اب وہ بینڈ باجے والوں کو روکیں کہ چکوال سے اٹک تک سے اکٹھے ہوئے دوستالوں کو واپس
بھیجیں کہ پنڈی سے بلائے گئے خانساموں کو ادھ پکی دیگیں چھوڑ دینے کا حکم دیں۔

مردانہ حصے میں جو جشن برپا تھا اُسے ہونے دیا گیا۔ لڑکے کی رسومات پوری ہوتی رہیں
خود بھی جس کے علم میں نہ تھا کہ اُس کی دلہن تو بھاگ چکی ہے۔

خاندان کی قریبی عورتوں کے سوا کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ مایوں بیٹھی دُلہن اگلی کوٹھری میں

ڈھکی ہوئی نہیں ہے کہیں کو نکل گئی ہے۔

حیرت تو صنوبر جان کے رویے سے تھی جو نہ تو بیٹی کے غلیظ کردار کو تو م رہی تھی۔ نہ اُس کے فرار کے طنابے مختلف مردوں سے جوڑ رہی تھی۔ ایسی پُراسرار ایسی پُرسکون جیسے کسّوں کی ڈھلانوں پر چھتری اوڑھے چتکبری کھمبی ڈھکی چھپی، بھیگی زمینوں کے سینے سے اچانک پھوٹ نکلتی ہے۔

بے.جی محمد جان نے بوڑھے لرزتے ہاتھوں سے اُس کے منہ سَر پر جھانپڑوں کی بارش کر دی۔

''گشتی کنجری بولتی کیوں نہیں نکی کنجری کو کس چکلے میں بٹھا آئی ہے۔''

اُس نے خود پر برستے نہ ہاتھ روکے نہ زبانیں۔ شاید پچھلے بے شمار برس کی اسی سنٹھ چپ میں سے غزل جان کی کونپل پھوٹ نکلی تھی۔

''ڈوری اچ بای کے تکی کٹاں۔ داتری نال تہواڑے ٹوٹے کراں کنجریے! دندیوں ٹھویں۔ لون مرچ بای کے تکی رناں۔''

(کونڈی میں ڈال کر تجھے کوٹوں۔ درانتی سے ٹکڑے کروں اُونچی چوٹی سے گرو، نمک مرچ ڈال کر تجھے پکا ڈالوں۔)

محمد جان مخصوص پوٹھواری زنانہ زبان کی بددُعائیں اور گالیاں دیتی اندر ہی اندر بین اُنڈیل رہی تھی۔ آواز کا کرارا پن اور لہجے کا اعتماد غزل جان اپنے ہمراہ لے کر کہیں فرار ہوگئی تھی۔ گراں کا آسمان آتش بازی کے رنگوں سے لال تھا اور بڑے بھاپا جی کو اس وقت غزل جان کی تلاش سے زیادہ اس تقریب میں عزت بچا لینے کی فکر لگی تھی۔

اُنھوں نے محمد جان کے کان میں فریاد پھونکی۔

''بے جی! کسی طرح عزت بچاؤ کسی بھی لڑکی کو پکڑ کر بیٹھا دو، ڈنگ ٹپاؤ کسی نے گھونگھٹ اُٹھا کر تو دیکھنا نہیں۔''

لیکن اس دھائی میں عجب حادثہ ہوا تھا کہ فاطمہ جان اور شکیلہ جان کی پیڑھی کو یرقان کھا گیا تھا اور نئی نسل یورپ کی کمائی اور اسلام آباد کے ماڈرن تعلیمی اداروں کی پروردہ تھی۔ جس کے

خمیر میں حکم عدولی، خود پرستی اور خود غرضی مل کر گھل گئے تھے۔ یا شاید بھا پا جی اور محمد جان کے مرگ مفاجات جیسے حکم کو ضعف، بیماری اور کہنگی کا دیمک لگ گیا تھا یا شاید شکیلہ فاطمہ صنوبر کی آہ لوٹی تھی کہ پھر لوٹیاں پڑ گئی تھیں۔ بے جی نے دو ہتڑوں سے اپنا ہی منہ سر پیٹ لیا۔

''ہائے ہو کولوٹی! گٹھ گٹھ جیبیں نکل آئی ہیں۔ ناسور نکلے ان کے منہ میں، پیو انگلینڈ گئے ہیں کہ آپ میمیں بن گئی ہیں۔ چوے کا پانی پینا چھوڑا ہے کہ اپنے ہی دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے۔''

''ہائے ایک ہم تھیں کہ رسی پکڑ کر جس کِلے سے چاہا باندھ دیا۔ ہائے لوٹی! آج پیو دادے کی عزت بچانے کو کوئی بذات آگے نہیں آ رہی، ہائے لوٹی! جلماں چمٹن نیں۔ دومونہی لڑے نیں ہائے موتو جو گیاں کسے نی آئی آئے نیں۔''

(انہیں جونکیں لگیں سانپ ڈسے کسی کی موت انھیں آئے۔)

بے بسی گالیوں، بددعاؤں کی صورت میں بہہ نکلی۔ مہندی کے گھلے ہوئے تھال پڑے رہ گئے۔ مہندی چوڑیوں سے سجے چنگیر پھول جھنڈیاں گوٹے کناریاں لڈو مٹھائیوں کے ٹوکرے خود کھانے کو دوڑنے لگے۔ اب گڑ پتاشے بانٹنے اور مائیاں بنانے کا رواج ختم ہو رہا تھا۔ کبھی مایوں کی رسم کے لیے کئی روز یہ مائیاں یعنی میٹھی ٹکیاں بنتی تھیں۔ پورے گراں کی عورتیں اکٹھی ہوتیں کوئی گڑ کا شربت بناتی۔ کوئی اُس شربت سے سخت سا آٹا گوندھتی کوئی بیلنے پر ٹکیاں گھڑتی۔ کچھ ان ٹکیوں کو کڑکتے ہوئے دیسی گھی میں تلتیں۔ جو مایوں کی رسم میں عورتوں میں تقسیم کی جاتی تھیں لیکن اب یہ سب قدیمی رسمیں ولایت کی دولت نے ہڑپ کر لی تھیں۔ اور آج ولائت سے آئی دولت کے یہ سبھی امیرانہ اظہار بے اُجڑی ہوئی اس محفل کا جیسے منہ چڑھاتے تھے۔ شہنائیوں کے حلق گھٹ گئے۔ عورتوں کے گیتوں کے سُر بینوں میں تبدیل ہو گئے۔ محمد جان کی شوگر اِتنی بڑھ گئی کہ بے ہوش ہو ہو گرنے لگی۔ بھا پا جی کے گردے یکبارگی جواب دے گئے۔ شکیلہ اور فاطمہ اپنے ہی وجود میں چھپنے لگیں۔ جیسے اس جرم کا نقشِ پا اُن کے دِلوں تک پہنچتا ہو۔ فجر کی اذان تک سوائے صنوبر جان کے کوئی نہ سویا تھا کہ اصغر خاں کا فون لندن سے کسی آسودہ حادثے کی طرح آ گیا۔

غزل جان بخیر و عافیت لندن پہنچ گئی تھی۔
بھا پا جی گردوں کے ناقابلِ برداشت درد میں چلائے۔
''اسے گدی سے گھسیٹ کر واپس بھیجو۔''
بڑے بھا پا جی ان چند گھنٹوں کے اندر اندر ہی ڈیلسز میں چلے گئے تھے۔
اصغر خان رو دیا
''بھولے سے بھی ایسی بات نہ کیجیے گا بھا پا جی! یہ یورپ ہے اُس کی یہی مہربانی کیا کم ہے کہ اُس نے جس یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے اُس کے ہوسٹل میں پہنچنے سے پہلے ایئرپورٹ سے ہی مجھے فون کر دیا چلیں یہ تسلی تو ہو گئی کہ وہ بخیریت ہے۔''

تیز گام دندناتی ہوئی آہنی پٹڑیوں پر سے گزر گئی۔ جن کی سنسناہٹ سارے پہاڑی سلسلوں میں گونج چھوڑ گئی۔

''غزل جان بھاگ گئی۔''

غزل جان انگلینڈ چلی گئی۔ خود سے اکیلی میموں کے دیس میں۔ جو ننگی پھرتی ہیں اور کئی کئی جنے (مرد) کرتی ہیں۔ یہ صدمہ محمد جان کی جان سے کہیں بڑا تھا۔ وہ گالیوں اور بددُعاؤں کے جھانپڑ حلق سے اُگلتی رہی لیکن کمزور نسیں اور نرگٹ اُنھیں واپس اندر ہی کہیں اُنڈیل دیتے اور وہ شاید انھی میں غوطا کر مر گئی۔ اگر زہر کا یہ ریلا باہر کو مار کر جاتا تو شاید بچ ہی جاتی۔

گھر کی عورتوں کو افسوس تو یہ رہا کہ محمد جان جو پانچ بیٹوں کی ماں تھی اُس کی چارپائی اُٹھانے کو گھر کے مرد بھی پورے نہ ہو سکے اور دوستالوں نے میّت اُٹھایا۔

عورتوں نے بین کھینچا۔

''ہائے ہڈیاں دولتاں ناں کیہ کرنا جے پنجاں پتراں نی مائیوناں جنازہ وی غیراں چایا۔''
(اتنی دولتوں کا کیا فائدہ کہ پانچ بیٹوں کی ماں کا جنازہ غیروں نے اُٹھایا۔)
شکیلہ جان اور فاطمہ جان ایک دوسری کے گلے لگیں تو بدن کے خشک ڈھینگر کے اکتارے

بج اٹھے۔

''ہائے یوں بھی ایسے بھی۔۔۔ہائے کوئی بھی۔۔۔

اس طرح بھی۔کبھی ایسا بھی۔۔۔نہ سوچا۔۔۔نہ دیکھا۔

ہائے لوٹی ہوکولوٹی۔''

وہ سر اور رانیں پیٹتے ہوئے پتہ نہیں کس کا ماتم کر رہی تھیں۔غزل جان کے بھاگ نکلنے کا کہ محمد جان کے مرجانے کا۔اِک عہد کے مٹنے کا کہ اِک نئے عہد کے شروع ہونے کا۔

چہار کھونٹ پہاڑوں میں کسا سمٹا ہوا یہ صدیوں پرانا پہاڑی گاؤں جو بارانی زمین کی سی قناعت اور بے نیازی رکھتا تھا۔گہری کھائیوں کی سی لمبی گہری نیند سویا ہوا......دفعتہً سیلابی لینڈ سلائیڈ کی سی تعمیراتی گھڑگھڑاہٹ سے ہڑبڑا کر جاگا۔اُسی سراسیمگی اور بدحواسی کے ساتھ جو غیر متوقع جھنجھوڑ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔چٹانوں کے چٹخاؤ جیسا تعمیراتی مشینوں کا شور،ڈائنامائیٹ کے دھماکے پہاڑی سیلاب سی سڑکوں کی گھر گھراہٹ غولِ بیابانی سا انسانی ازدھام کہ دُور نیچے کھائیوں میں بسنے والے بھوت پریت آسیب پکارتے پناہیں ڈھونڈنے لگے۔رات بھر کسوں میں بجنے والی ڈھولک اور سوئے ہوؤں کے ہاتھوں پر لگنے والی مہندی کی مصروفیت چھوڑ غول آبادی سے بچنے کی تگ ودو میں دُور میدانوں کے ویرانوں میں اُتر گئے۔کیونکہ چوٹیوں،کھائیوں پہ تن کر کھڑے کیل پھلاہی اور پہاڑی کیکروں کے جنگل کٹنے اور چٹانیں تڑخنے لگی تھیں۔اُنگلی اُنگلی بھر لمبی مونگ پھلی اور سفید دانوں والے بھٹوں کی جگہ بڑے بڑے پلازے،ہوٹل اور محلات کھمبیوں کی طرح سَر نکال چھتنار ہو گئے۔بیج پھینک کر آسمانوں کی سمت بیچارگی سے انتظار میں لگی نگاہیں اب بادلوں سے بھی کہیں بلند ہوتی عمارتوں کی چھتریوں سے اُلجھنے لگیں۔بیوی کی پھانک بھر چوڑیاں رہن رکھ کر لیا ہوا بیج اور گڑ پتی جن پر بڑھتا ہوا سود ہر خشک سالی میں ایک ادھ قطعہ اراضی ہڑپ لیتا اور وہ ساری فصلیں جو پھونس ہو گئی تھیں۔ضائع ہو چکی ساری کھادیں اور بیج نہ برسنے والے سبھی پانی شاید کہیں اندر ہی اندر جمع ہوتے اور پھلتے پھولتے رہے تھے۔آج جب یہ ناہموار اور بے اعتبارے قطعاتِ اراضی

بکے تو سود در سود، پتہ نہیں کتنا بیاج لٹا دیا۔ شاید بھوک، کمزوری، بے بسی، استحصال بھی اِک سرمایہ ہے جو نسل در نسل جمع ہوتا رہتا ہے اور پھر کسی ایک نسل کو اُن ساری بھوکوں، ساری قحط سالیوں اور ساری لاعلاج بیماریوں اور سلب شدہ حقوق کو ڈھیروں منافع لگا کر لوٹا دیتا ہے۔

آسمانوں میں جذب ہونے والے اور زمین کے سینے میں اُتر جانے والے سارے پانی یوں موسلا دھار برسے کہ ہر سو دولت اور سرمائے کی فصلیں لہلہانے لگیں۔ ان پتھروں کی خصلت بھی عجب ہے روڑی بجری بنتے ہیں یا پھر ہیرے موتی اور اب یہ پتھر صدف بن کر بکے تو بستی کو اِفراط کی بدہضمی دے گئے۔ فریجوں میں بھری رہنے والی خوراک سڑنے لگی اور طباق کے طباق بھر بھر گٹروں میں بہائی جانے لگی۔ تب آبشار کے شفاف پانیوں میں زہر بھر گیا۔ وہی آبشار جو کسی خوش گلو کی طرح قہقہے اُچھالتی اور کسی پنہاری کی طرح گاگریں چھلکاتی اُنڈیلتی تھی۔ جس کے گرداگرد ساری ڈھلانوں اترائیوں اور چڑھائیوں کے سبزہ زاروں پر باربی کیو بن گئے تھے۔ جن کے کھانوں کو اس جھیل کے معدنی پانیوں نے ایسا ذائقہ بخشا تھا کہ شہر بھر کے خوش خوراک اس نئی کالونی میں پیٹ اُٹھائے آتے اور ٹھونس ٹھانس واپس لے جاتے۔ پھر بھی اِتنا بچ رہتا کہ قدیمی بستی کی خوراک اُن کے گھروں میں سڑ جاتی کہ اُنھیں بھی انھی ہوٹلوں کی چاٹ لگ چکی تھی۔ تفریط کا منطقی نتیجہ افراط ہے اور افراط کا منقطی نتیجہ کوئی غیر مرئی سا بدہضمی عمل ہے۔ یہ آبشار جس کے ڈھلانی چہرے پر کبھی پستئی رنگ جالے لٹکتے رہتے، نوکیلے پتھروں اور چٹانوں کے تیکھے نقوش پر کائی کی راکھ تہ در تہ جم جاتی۔ جو مخملی سے برادے میں تبدیل ہو کر دبیز سی گھاس میں بدل جاتی۔ پھلاہی اور پیپل کے ننھے منے پودے پتھروں کی دراڑوں میں سے سَر باہر نکال لیتے۔ جو پانیوں کی بوچھاڑ کھاتے اور درخت بنتے تھے۔ لیکن اب ان کے میلے میلے چہروں پر سفید براق سنگِ مرمر کا نقاب چڑھا دیا گیا تھا۔ جس پر سے رنگ برنگ پانی پُرشور ہو کر جھیل میں گرتے رہتے۔ جس کے اطراف کو امپورٹڈ پھولوں، بیلوں اور پتھروں کے ساتھ انتہائی دیدہ زیب ترتیب سے سجایا گیا تھا۔ جس کے شفاف پانیوں میں شفق رنگ قمقمے جلتے بجھتے تھے۔ جس کے گرد سجی کرسیاں قوسِ قزح

کی دھاریاں معلوم ہوتیں یہ وہی جھیل تھی جہاں عورتیں تن کے کپڑے سوکھنے کے انتظار میں کئی دُکھ آنکھوں کے گھڑوں میں بھر بھر بہا دیتی تھیں اور مرد چٹانوں کی اوٹ سے ہنکارا دیتے۔

''کپڑا اے لوڈنگروں کو پانی پلانا ہے۔''

تب صنوبر، فاطمہ، صابرہ، بدن کی گٹھڑیاں گیلے دوپٹوں میں لپیٹے گنگناتیں۔ ''لنگھ آؤ۔''

لیکن اب یہاں سوکھنے کو کوئی کپڑا نہ پھیلتا تھا کہ ہر جھاڑی تو رنگین قمقموں کی لڑیوں میں لپٹی جگمگاتی تھی۔ اب اس گراں کی لڑکیاں مہنگے بوتیکس کے سوٹ خریدتی ہیں جو افراط کی ناتجربہ کاری کے باعث گھر لاتے ہی دِل سے اُتر جاتے ہیں تو اور خرید لاتی ہیں۔ یہ سوٹ واشنگ مشینوں میں دُھلتے اور ڈرائیر میں سوکھتے ہیں کہ اب اس جھیل کو بھرنے کے لیے آسمان کی سمت کوئی نگاہ نہیں اُٹھتی کہ آبشار کے مصنوعی پانی شام بھر یہاں گرتے رہتے ہیں۔ شاید چوے پر کھڑی بکائین سے بندھی ساری دھجیوں اور جھنڈوں کی سب مرادیں یکبارگی پوری ہوگئی تھیں۔ اَن پڑھ ماؤں کی یہ پڑھی لکھی لڑکیاں اب اعلیٰ تعلیم کے لیے اپنے باپوں کی نیشنیلٹی لیے یورپ کی یونیورسٹیوں میں اپلائی کرنے اور گرین کارڈز ہولڈرز بننے لگی تھیں اور ان گراؤں کو چھوڑ رہی تھیں جو یرقان کے مرض میں جکڑا گیا تھا اور پرانی نسل زرد رو ہو کر مر رہی تھی۔ اس پیلا ہٹ کے ماہر معالج درآمد کیے گئے۔ جدید ہسپتال بنے لیکن اس سنہری بستی کی پیلا ہٹ کا علاج نہ ڈھونڈا جا سکا۔ پیلا ہٹ پکنے کی نشانی ہوتی ہے۔ پیلی فصلیں کٹ جاتی ہیں۔ یہ زرد رو انسانی فصل بھی تیزی سے کٹنے لگی جن کے مرقد کی لوحیں بھی طلائی حروف میں لکھی جاتی تھیں۔ اس سجے سجائے قبرستان سے پرے پہاڑی فصیلوں کے ادھر انگریز کے عہد کے اس قصباتی ریلوے اسٹیشن پر اب بھی ریلیں گزرتی ہیں۔ اب بھی زیرِ زمین زلزلے برپا ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ یرقان کی پوٹلیوں میں دوہری تہری بندھی شکیلہ جان، صنوبر جان، فاطمہ جان، صابرہ جان ابھی بھی ریل کی انھی پٹڑیوں کی سنسناتی ہوئی جھنکاروں میں بج اُٹھتی ہیں۔ جیسے وجود کی سبھی ہڈیاں سارے خلیات پا بہ زنجیر ہوں۔ چھک چھک چھک چھن چھک چھن۔ ریل گاڑیاں ہیں کہ گزرتی چلی جاتی ہیں۔

تاج محل

غزل جان پر عجب انکشاف ہوا تھا کہ جیسے وہ جدید صدی کے انگلستان میں تو وارد ہوئی ہو لیکن یورپ کی یہ تیز رفتار ماڈرن صدی اِس رہائشی علاقے کی چوکھٹ کے کہیں باہر ہی ٹھٹھک کر کھڑی رہ گئی ہو۔ جہاں برصغیر کے کئی پرانے شہر آباد تھے۔ لاہور، دِلّی، ڈھاکہ، امرتسر، میرپور اور پنڈی کے کئی گنجان آباد تاریخی محلے۔

برصغیر کی مختلف زبانوں، مذہبوں اور کئی نسلوں نے یہاں خود کو مقید کر رکھا ہو۔ باہر کی ہوا لگنے کے خوف سے اپنے ہی اندر اپنے ہی شیل میں خود کو سمیٹ لیا ہو۔ خود ان کے ملکوں میں تو یہ ماڈرن صدی کم از کم اپنی آدھی رفتار سے تو ضرور داخل ہو چکی تھی، لیکن اِس بتدریج تبدیلی اور ترقی کو یورپی معاشرے میں خود کو ہی ڈھال بنا کر اُنھوں نے ایک فاصلے پر روک رکھا تھا اور روائتوں قدامتوں سے سینچی محبتوں کے بند اور دیواریں اُسار کر اُسے پرے دھکیلا جا رہا تھا۔ وہ روائتیں اور محبتیں جو نئے عہد کے خوف سے نبرد آزما تھیں، جنھیں تقدس کی روئی کے غلافوں میں ڈھکا جاتا تھا۔ کبھی کمیونٹی کے راہنما اصولوں میں، کبھی رفاعی سینٹروں سے، کبھی مذہبی حد بندیوں میں محفوظ کرنے کی کوششیں یہاں جاری تھیں۔ اِس ماڈرن ازم کا خوف تھا کہ اپنی شناخت کے مٹ جانے

کا نفسیاتی دھچکا کہ یورپ میں رہتے ہوئے یورپ کو پیچھے دھکیلنے کے لیے جس انداز سے زور لگایا جا رہا تھا۔ اُس نے عجیب الصورت بنا دیا تھا۔ پیر ڈھلان پر جمائے رکھنے کو اتنا زور لگانا پڑ رہا تھا کہ سر پیروں سے آگے بڑھ آیا تھا۔ کمر کبڑی ہوگئی تھی۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور سانس پھول گئی تھی۔

غزل جان کو تو یہ مداری کا تماشا معلوم ہوتا، جس کا حصہ اب وہ خود بھی بننے جا رہی تھی۔ جس میں بندریا اور ریچھ بس وہی کھیل کھیلنے پر مجبور ہوتے جو سدھانے والے نے انھیں سکھائے تھے۔ مرد ٹیکسیاں چلاتے، پٹرول ڈالتے، ڈش واشنگ کرتے اور صرف ڈالر کی گنتی گن سکتے تھے۔ انگلستان میں بیس پچیس برس گزارنے کے باوجود انگریزی کے دو جملے بھی جیسے سیکھنے ممنوع تھے۔ عورتیں دال کو بھگار لگاتیں، پراٹھے پکاتیں اور بچوں کو اپنی زبان میں مشرقی آداب اور گالیاں سکھاتیں۔ اُنھوں نے اپنی سمت بڑھتے یورپ کو اِس شدت سے روک رکھا تھا کہ جس عہد میں، جس سن میں اپنے اپنے وطنوں سے نکلے، وہی عہد وہی سن وہی دور اُن کے لباس، زبانوں اور طور طریقوں میں آج تک مقید چلا آتا تھا۔ جیسے وہ جس خاص زمانے کے برینڈز ہیں، وہی عہد وہی فیشن وہی ڈیزائن ان پروڈکٹس کی شناخت بنا ہوا ہے۔ ہر ایک پر اپنے سن کے ٹیگ لگے ہیں۔ یہ ساٹھ کی دھائی میں یہاں وارد ہوئے کہ ستر، یا اسّی کی دہائی میں۔ اس دہائی کا پورا کلچر، تعارف اور زمانۂ تخلیق اُن کے چہرے مہرے، لباس، زبان، طرزِ بود و باش میں قید تھا، جسے یورپ کی جدتوں نے کہیں بھی ملوث نہ کیا تھا۔ سوائے اِس مخلوط کلچر کے اثرات کے جو ہندوستان، بنگلہ دیش اور پاکستان کے مختلف علاقوں کے اختلاط نے یہاں پیدا کیے تھے۔ جیسے زمینوں کو تقسیم در تقسیم کرنے اور ایک دوسرے کے لہو سے ہاتھ رنگنے والوں کو جدید یورپ کی طاقتور معاشرت کے خوف نے متحد کر دیا ہو۔ ایک دوسرے کی پناہ میں محفوظ رہنے کے لیے اِس مشترکہ دُشمن کے سامنے صف آرا کر دیا ہو۔

غزل جان کے باپ کی دُکان کے ماتھے پر رومن ہندسوں میں تحریر تھا: رب، رحمٰن، بھگوان، گاڈ اس دُکان کو بھرنے کے لیے دِن رات دیسی ذائقوں والی مٹھائیاں بنانے والی جسیر کور کے وجود میں سے وہ اپنی ماں کی تباہی کی آہٹ سنتی تھی اور اپنے باپ کی قزاقی کا کُھرا ڈھونڈتی تھی

جو مٹھائیوں کے شیرے سے نکلتا ہوا جسبیر کور کے فلیٹ کی سیڑھیوں پر اپنی چپچپاہٹ چھوڑ تا تھا۔ وہی جسبیر کور جو اصغر خان کو پا جی کہہ کر پکارتی تھی اور بیوگی کے تنہا مکان میں رہتی تھی، جہاں نقب زنی کے لیے حالات انتہائی سازگار تھے۔ دونوں ہاتھوں کا پورا زور لگا کر دیسی گھی شکر میں وہ میدہ گوندھتی تو اُس کی گوری کلائیاں جیسے ایک رِدھم میں رقص کرتیں۔ جھومر ڈالتیں، وہ گنگناتی۔

''میری کالی مرغی کھو گئی میرا دل ٹھکانے نا''

جلیبیاں تلتی، گلاب جامنوں کو شیرے میں ڈبوتی، برفی کے ٹکڑے کاٹتی یہ سکھنی کیا اُس کی ماں سے زیادہ خوبصورت ہے؟ صنوبر جان جس کی چمپئی رنگت کو انتظار کا سیاہ ناگ ڈس گیا تھا۔ جس کا زہر غلافی پپوٹوں، شنگرفی ہونٹوں کو نیلاہٹ بن کر چڑھ گیا۔ موتیا رنگ آنکھیں آسمانوں کے نیچے نیچے پرواز بھرتے جہازوں سے آس کی ڈور باندھے، نااُمیدی کے یرقان کی سولی چڑھ گئی تھیں پپوٹے ڈھلک گئے تھے، جن پر پاکستان اور اِنگلستان کے نقشے گڈمڈ تھے۔ ڈیلوں کے نیچے مایوسی کی راکھ سے تھیلیاں سی بھر گئی تھیں۔ ستواں ناک کے دونوں اطراف لمبے انتظار کے بچھو، نے ڈستے رینگتے کئی پگڈنڈیاں بنادی تھیں، جیسے آتش حسن کی بجھی راکھ کہ کوئی پہاڑی چشمہ جس کا سوتا دھوپ کی خشک زبانیں چاٹ گئی ہوں۔ اُجاڑ بنجر کھیتی، جس کے سارے پھل سوکھے نے نگل لیے تھے، اور یہ دیسی گھی اور شیرے میں سنی چٹی اَن پڑھ سکھنی، جس کا چہرہ ملاحت و ملائمیت میں ایسے ہی گندھا تھا جیسے مٹھائیوں کا میدہ جسے دودھ اور مکھن میں وہ گوندھتی تھی۔ غزل جان اِس چکنی چکنی ملاحت کا تار اپنے باپ کے سنٹھ وجود سے جوڑتی رہتی، جس ریشے کے انقطاع نے اُس کی ماں کو قبل از وقت جھریوں اور بیماریوں کی گٹھڑی میں باندھ دیا تھا۔ جس کی آنکھوں کا سارا ارغوانی شربت آنسوؤں کے اوندھائے پیالوں نے بہا دیا تھا۔ چمپئی رنگت کے ملائم ساٹن کو بےلمسی کے کھردرے ہاتھوں نے چڑمڑا دیا تھا۔ ایک یہ جوان بچوں کی بیوہ ماں سکھنی جس میں رنگ، رس، حرارت، زندگی اور تازگی کی ندی ابھی رواں دواں تھی۔ غزل جان اس ندی میں آ آ کر گرنے والے جھرنے کا سراغ، اپنے باپ کے منبع میں ڈھونڈتی تھی۔ مٹھائیوں اور شیرینیوں میں دن رات

لتھڑی آخر یہ اضافی چربی کس لَس کی بھٹی میں پگھل جاتی تھی کہ وہ آج بھی تراشیدہ اور سڈول۔ آخر بیوگی کی تنہائی کے آہنی باٹ کس خفیہ وصل کے گرم ہاتھوں میں پگھل جاتے تھے۔ اُونچے پونی ٹیل کے گھنے مضبوط بال کس طاقت ور فولاد نے نکھار رکھے تھے۔

وہ کہتی تھی یہاں زندگی آرام دہ ہے ماحول پُرسکون ہے۔ غذا خالص ہے آب و ہوا بے آلائش ہے۔ زندگی کو، نوکری کو بیماری، معاش کو تحفظ حاصل ہے۔ اِسی لیے تو ہم جوان اور مصروف ہیں۔ ''یہاں کے تو قبرستان بھی ایسے ہی بے آلائش اور پُرسکون ہیں گڈی! کہ مُردے بھی انجوائے کرتے ہوں گے تو پھر جیوندے جا گدے کیوں نہ مزے میں ہوں گڈی۔۔۔''

اس نے بے فکر کھنکتا پہاڑی جھرنے سا قہقہہ اُنڈیلا تھا، گالوں میں تمتماتا کیلشیم آنکھوں کا مقناطیس، بالوں کا فولاد غزل جان پر ہنہنایا۔

غزل جان اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ سکھنی جھوٹ بولتی ہے۔ اندر کی فضائیں اور دل کا ماحول اگر مزاج اور طلب کے موافق نہ ہو تو باہر کی موافقیت سے صحت، سکون اور جوانی کی ندی بھرپور روانی نہیں بن سکتی، لیکن وہ بضد تھی کہ خارجی موافقیت درون میں موجزن جوار بھاٹے کو پُرسکون کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

''اسی لیے تو یہاں زندگیاں لمبی ہوتی ہیں خودکشیاں کم ہوتی ہیں اور ہسپتال خالی رہتے ہیں گڈی۔''

کاش اِس کی زندگی کا تار بھی کسی انتظار کی سولی سے بندھا ہوتا۔ اِس کے لانبے ہنہناتے پونی ٹیل کو بھی فراق کی اَن گنت راتوں نے بال بال گوندھا ہوتا۔ اُس کی چمکتی آنکھوں کو کسی بے توقیری کے اندھے حوضوں کو عمر بھر تنہا بھرنا مشقت ٹھہرا ہوتا۔ اُس کے تنہا وجود کی ویرانی کو ساس نندوں کے نشتروں، طعنوں سے پور پور چھدنا ہوتا۔ سیکڑوں بل کھاتے رستوں پر، لمبے اُونچے پہاڑی سلسلوں میں اُترتے چڑھتے کڑی دھوپ میں پگھلتے، کپڑوں کی پنڈیں اور تین تین گھڑے سر پر اُٹھا کر اُترنا چڑھنا معمول ٹھہرا ہوتا۔ آتی جاتی ریل گاڑیوں کے اوقات کا پل پل حساب رکھنا ہوتا۔ عمر بھر منتوں

کے جھنڈے باندھتے اور وظیفے کرتے مرادوں کے ستارے کو نااُمیدی کے آسمان میں ٹوٹتے بار بار دیکھا ہوتا، پھر میں پوچھتی یہ حسن جوانی کیسے قائم رہتا ہے۔ برفیلے سخت موسموں کا انقباض بند گھروں کی کھڑکیوں کے شیشے اندھے کر رہا تھا۔ غزل جان نے کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔ برفیلی ہوا کا جھالا اندر برسا، دھڑ دھڑ جلتا ہیٹر جیسے سرد ہو گیا۔ ساتھ والے فلیٹ سے میرپوری لہجہ اُبھرا۔

''آلو آلا پراٹھا کھاسو۔'' (آلو والا پراٹھا کھاؤ گے۔)

اتوار کی چھٹی مناتے بچوں کا شور اُبھرا۔ ''نہ بریڈ تے ایگ کھاساں۔''

کہیں سے پنجابی گالی کان میں پڑی۔

''حرام دیو! اے سؤر دی چربی اے اپنا سوہنا دیسی تے اسلامی کھا جا کھاؤ۔''

اُوپر نیچے دائیں بائیں فلیٹوں میں بسنے والی دادیاں، نانیاں، مائیں، خالائیں، ذہنی اور جسمانی طور پر جیسے وہیں کہیں ٹھہر گئی ہوں۔ جب اُنھوں نے برصغیر کے کسی غریب محلے سے سفر شروع کیا تھا اور ان ولائتی مکانوں میں منتقل ہوئی تھیں جہاں چھوٹا برصغیر آباد تھا۔ جہاں ڈبل روٹی کی جگہ اُلٹے توے پر پھلکے سینکے جاتے۔ سرِ شام پکوڑے سموسے تلے جاتے، دال کو بھگار لگتا، قابلی پلاؤ، بریانی، چنا چاٹ اور شامی کباب کی خوشبوئیں پوری سٹریٹ میں گھوم جاتیں۔ ہر گھر میں کوئی بزرگ موجود ہوتا، جنھیں اولڈ ہاؤسز میں بھیجنے کا خیال کبھی کسی کو نہ آیا تھا، جو بالکنی میں کُرسی بچھا کر اپنے بچوں پوتوں کی واپسی کا انتظار کرتے۔ عورتیں اُون سلائیاں چلاتیں، سویٹر اور کروشیے کے رومال بنتیں۔ مرد اُردو بنگلہ ہندی اخبار رسائل پڑھتے اور اپنی کمیونٹی کے بچوں کی اخلاقیات و معاشرت پر کڑی نظر رکھتے تھے اور اُن چھوٹے بچوں کی نگرانی کرتے جو گھروں کے درمیان بنے پارک کے جھولوں پر یوپی لہجے والی انگریزی اور متروک الفاظ والی پنجابی، پوٹھواری، بنگالی، تیلگو، ہندی، جیسی مادری زبانیں بولتے۔ غزل جان کو ہر گھرانہ ایک بند کا بک معلوم ہوتا۔ جس دور میں جس سن میں جو کوئی یہاں مقید ہوا وہ اُسی دور اُسی عہد کے حصار میں قلعہ بند ہو گیا۔ زمانے کا قافلہ چاہے منزلوں پر منزلیں مارتا، کتنا ہی آگے بڑھ گیا ہو۔ سن وسال کس سُرعت سے گزر گئے ہوں

لیکن اُن پر اُسی عہد کا ٹھپہ لگا تھا۔ وہ سفر کے پہلے ہی پڑاؤ میں منجمد ہو گئے تھے۔ جو کوئی ساٹھ کی دہائی میں نقلِ مکانی کر کے آیا ستر یا اسّی کی دہائی میں اُسی عہد کی تعارفی پروڈکٹ بن کر رہ گیا تھا۔ وہی لباس، وہی زبان، وہی الفاظ اور سوچ جو اِس خاص دہائی میں اپنے اپنے آبائی وطنوں میں وہ چھوڑ آئے تھے لیکن اُن سب کا ست خود میں سمولائے تھے۔ زمانہ چاہے قیامت کی چال چل گیا ہو۔ اُن کے لیے وقت اُسی دہائی میں مقید ہو گیا تھا۔ اب چاہے یورپ کتنا ایڈوانس ہو جائے اُن کے بچے کیسے ہی جدید نصاب والے سکولوں میں پڑھیں۔ کیسے ہی سیلنگ لہجے میں انگریزی بولیں اور ماڈرن صدی کی جدید ایجادات میں پلیں بڑھیں لیکن پہلی مہاجر نسل پر تو ایک کڑی نگرانی موجود رہتی، جو دیسی عہد سے چمٹی اُس خاص دہائی میں قید تھی۔

غزل جان کو لگتا وہ ان یورپی شہریت رکھنے والوں سے زیادہ ماڈرن ہے۔ پنڈی کے قرب و جوار والا وہ گاؤں اس دیسی یورپ سے کہیں آگے نکل گیا ہے۔ اُن تک تو یہ اِطلاع ہی نہ پہنچی تھی کہ پاکستان فیشن اور جدت کی دُنیا میں کتنا آگے بڑھ چکا ہے۔ اُنھوں نے برطانوی آئین سے وفاداری کے معاہدے میں پناہ تو لے لی تھی لیکن کچھوے کی طرح اسی دہائی کے شیل میں خود کو چھپا کر، جیسے اِردگرد کے ماحول کو اپنی دہلیز سے باہر کھڑا کر دیا ہو۔ اپنی قومیّت اور وطنیت کو خیر باد کہہ کر زیادہ شدت سے اُسے اپنا لیا ہو۔ غزل جان پوٹھواری خاندانوں کی زبان پر تمسخر سے ہنستی۔ یہ متروک لفظ اُس نے بی بی جان سے کبھی کبھی سنے تھے جو غزل جان تک پہنچتے پہنچتے اپنا لہجہ اور صوت بالکل تبدیل کر گئے تھے۔ پرانے زمانے کے کپڑوں کے نام اور تراش خراش، نئے عہد کے بچوں کے نام وہاں کتنی منازل اور مراحل طے کر کے تازہ کار ہو گئے تھے۔ وہ ان سب دیسی تبدیلیوں اور ترقیوں سے بے خبر ہی رہ گئے تھے۔ انھیں معلوم ہی نہ ہوا تھا کہ اب فرزانہ رضوانہ، زاہدہ، شاہدہ، ساجدہ وغیرہ متروک ہو چکے ہیں اور دیہی بستیوں کی سمت دھکیل دیئے گئے ہیں۔ پروین نسرین، ثریا، صابرہ، جب وہاں سے ہجرت کر کے آئیں تو یہی فرزانہ، رضوانہ جیسے نام ہی ماڈرن نام تھے۔ وہی اگلی نسلوں کو منتقل ہوتے رہے۔ اُنھیں پتہ ہی نہ چلا تھا کہ پاکستانی معاشرہ ترقی کے مختلف مراحل

سے گزرتا ہوا، واپس عبداللہ، حمزہ، فاطمہ، زینب، خدیجہ کی سمت لوٹ چکا تھا۔ وہ ابھی زاہدہ شاہدہ میں پھنسی ہوئی تھیں۔ وہ اُسی تنگ یا کھلی موری کی شلواروں اور اُونچی نیچی قمیصوں میں مقید تھیں، جو رواج وہ جین اور اسکرٹ والے دیس میں آنے سے پہلے پہنتی تھیں۔ اُنھیں اِطلاع ہی نہ ہو پائی کہ وہاں جین اور شرٹ متعارف ہو چکا ہے۔ مقامی بولیوں اور مادری زبانوں میں کتنے اُردو انگریزی الفاظ دخیل ہو گئے ہیں۔ نئی ایجادوں، مشینوں، ہوٹل کلب، انگریزی اسکول، مخلوط تعلیم نے کیا کیا تبدیلیاں کر ڈالی ہیں۔ وہ اُن سب سے بے خبر ہی تھے۔ اُن کے وطنوں میں کس یورپی اور امریکن لہجے میں انگریزی بولی جانے لگی تھی۔ اپنی بولیوں کو سنبھالنے والوں کے ساتھ عجب واردات ہو گئی تھی۔ وہ انگریزی دانی کے بیچ بستے ہوئے بھی اس حوض میں نہ بھیگے، لیکن جس زبان کو شناخت بنا کر ساتھ لائے تھے وہ وہاں پیچھے چپکے چپکے متروک ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ تو بس اپنے اپنے خول میں چھپے باہر کے خطروں سے آنکھیں موندھے بے خبری کے آہنی حصار میں وطن کی یادوں کے دائرے میں گھومتے رہے۔ یہ یادیں، گوری معاشرت اُس وقت زیادہ شدت سے اُن پر لاگو کر دیتی تھی جب اُن کے بچے جوانی کی دہلیز کو چھوتے اور جدید کالجوں، یونیورسٹیوں میں داخل ہو جاتے۔ تب یہ آبادکار نسل عجب افراتفری کا شکار ہو جاتی، کچھ واپس پلٹ جاتے کچھ مشرق و مغرب کے پاٹوں میں پس جاتے۔ ساتھ والے فلیٹ کی کرایہ دار خاتون نے اپنے بچوں کو ڈانٹا تھا۔

بنڈے کی بند کری چھوڑ (وینڈو Windo کو بند کر دو۔)

میر پور کی یہ پوٹھوارنیں جب انگریزی لفظوں کو پوٹھواری تلفظ میں بولتیں تو غزل جان کو لگتا وہ انگلستان نہیں پوٹھوار کے کسی زیادہ پسماندہ گراں میں آ گئی ہے۔ اُوپر والے فلیٹ میں کڑ ہی کو بگھار لگاتی دادی اماں پوتے کو ڈانٹتیں۔

"خبردار جو کسی گوری کو بافنڈ (بوائے فرینڈ) بنایا۔"

دائیں ہاتھ والے نانا جان اُردو اخبار پڑھتے دوسری بالکنی میں ہندی سماچار کا مطالعہ کرتے دادا جان سے مخاطب تھے۔

''او چندرے گراسری لینے کو چلیں۔''

مہین پولی تھین میں لپٹی دیسی گھی کی مٹھائیوں، موتی چور لڈو، گلاب جامن، برفی بوندی کے تھال شوکیسوں میں رکھتے ہوئے جسبیر کور مسلسل گنگنا رہی تھی۔

میری کالی مرغی کھوگئی میرا دل ٹھکانے نا

شلوار قمیص کے اُوپر گلابی ایپرن پہنے ہاتھوں پر باریک دستانے چڑھائے لمبے پونی ٹیل کو سفید سکارف میں لپیٹے بے فکر، مطمئن۔ مخصوص پنجابی موج میں گنگناتی۔

میری کالی مرغی کھوگئی میرا دل ٹھکانے نا

مرغی کے کھو جانے یا دل کے ٹھکانے نہ ہونے کا کوئی شائبہ تک اُس کے وجود سے نہ پھوٹتا تھا۔

''جھوٹی، دغا باز چورنی! کتنی صفائی سے میری ماں کا رنگ رُوپ سکھ چین چرا لیا۔ بھلا اِس کی کالی مرغی کون چرائے گا۔ یہ تو خود بڑی ڈکیت ہے۔ دوسروں کے دلوں کو ویران کرنے والی قزاق، حسن وجوانی کو مسمار کرنے والی کے اندر دل جیسی کوئی نازک شئے کیا بستی ہے جو کسی حادثے میں ٹھکانے پر نہ رہے۔''

غزل جان اپنے پسندیدہ مشغلے میں مصروف ہوگئی۔ وہ جسبیر کا موازنہ اپنی ماں سے کرنے کے پسندیدہ مشغلے میں خودترسی اور غصے کا کیتھارسس کرنے لگی۔ ظالم ومظلوم کا موازنہ، صیداور صیاد کا موازنہ، وہ قیدی مینا اُس کی آنکھوں کے پنجروں میں پھڑ پھڑائی۔ بھسم ہوئے سنہرے بال، جو اتنے چھدرے ہو چکے تھے کہ سفید سکری بھری جلد بھی نمایاں ہونے لگی تھی۔ سوجے ہوئے پپوٹے، جن کے نیچے لٹکتی گوشت کی گچھا گچھا تھیلیاں، جن میں شاید درد بھرا تھا۔ جوڑوں پر چڑھی چربی کی تہیں، ٹیڑھی پنڈلیاں، پھیلے کولہے، جن کے ناگوار بوجھ تلے، ہوہوکار مچاتی دردیلی ہڈیاں۔ برسوں کی تنہائی میں سنٹھ وجود، جس کا قفل کھولنے والا چابی لگا کر چھوڑ گیا تھا۔ چابی تالے کے اندر ہی زنگ آلود ہو کر ٹوٹ گئی تھی۔ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ تالا کبھی کھلا بھی تھا۔ پٹ کبھی وا بھی ہوا تھا۔ اب

بھی در کھل بھی جائے تو کیا! پرنچی مینا پرواز کرنا تو کب کی بھول چکی۔ اتنی چڑ چڑی کہ مرغیوں، بکریوں، کوّوں اور کتوں سے بھی لڑتی جھگڑتی۔ غصہ ماتھے پر دھرا، مچڑ کر جھریوں کا گچھا بن گیا تھا۔

''میری کالی مرغی کھوگئی میرا دل ٹھکانے نا۔''

اس کی مرغی کھوگئی جھوٹی چورنی کہیں کی۔ ہوئی جو سکھنی ظالم۔۔۔'' کرپان چلانے اور زخمی کرنے والی۔۔۔ قافلوں کے قافلے کاٹنے والی۔ غزل جان نے کچن کے شیشے سے باہر گرتی برف کی بے حس یخ ٹھنڈک اور بھسم کر دینے والی مردنی کا سراغ جسبیر کور کے چست اور پھرتیلے وجود میں لگایا جو اُس کی ماں پر برق بن کر گری تھی، لیکن اسی تکلیف کے ساتھ غزل جان کو اس سکھنی سے مٹھائیاں بنانے کی تربیت حاصل کرنا تھی۔ اِس وقت دونوں ایک ہی کچن میں اپنے اپنے احساسات کو مٹھائیوں کی مختلف ساخت میں، گوندھ، رینده، مروڑ اور تل رہی تھیں۔

غزل جان اندر کے انتشار کو مٹھائیوں کے میدے میں اتنی شدت سے گوندھ رہی تھی کہ شیلف بھی لرزنے لگا تھا اور جسبیر کور جلیبیاں تل رہی تھی، جیسے گھی کی تر تراہٹ ایک ردِھم سے سازینہ بنی ہو۔

''میری کالی مرغی کھوگئی میرا دل ٹھکانے نا''

غزل جان نے آٹے والی پرات اِس زور سے پٹخی کہ ٹھکانے نہ رہنے کی ذہنی عیاشی کرنے والا دل واقعی اُتھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا۔ گنگناہٹ بے ٹھکانہ ہوگئی۔

''توں بور ہوگئی نا۔ جوڑ کوئی نہیں یہاں تیرا۔ نہ باہر نکلے، نہ یونیورسٹی جائے نہ بوائے فرینڈ نہ گرل فرینڈ۔ ہائے بے چاری گڈی۔۔۔''

جسبیر نے گرم گرم شیرے میں جلیبیوں کا چھاننا اُلٹا، جیسے اسی شیرے کی چاشنی زبان پر ٹپکی ہو، جس نے لفظ لفظ کو مٹھاس اور چکنے چکنے قوام سے لتھڑ دیا ہو۔

''پر تو فکر نہ کر میری گڈی آنے والی ہے۔ اِس ویک اینڈ پر ادھر یونیورسٹی میں پڑھتی ہے نا۔ تیرا دل گھبرانے نہ دے گی۔ بس ہنستی رہتی ہے ہر ویلے۔ گاتی ڈینس کرتی۔ کبھی چنتا کو چنتا نہیں

سمجھا اُس نے، اِسی لیے وہ بائیس ورھے کی نہیں بس چودہ ورھے کی گڈی دِکھتی ہے۔سوہنی اتنی نری برفی۔مٹھائیوں میں پلی ہے نا مٹھائی جیسی ہی۔۔۔میٹھی، چکنی، سوادی۔۔۔"

"جیسے آپ ہو گڈی۔۔۔"

غزل جان نے شوکیسوں میں بند مٹھائیوں کے مختلف ذائقوں اور شکلوں کی شبیہ دونوں ماں بیٹی میں تلاش کی۔

"ہاں میرے جیسی ہی ہوگی نا۔جس بیج سے پھوٹے گی اُس کی تاثیر تو آئے گی نا۔"

غزل جان گڈی کو دیکھنا چاہتی تھی۔وہ جس بیج سے پھوٹی ہوگی اُس کی تاثیر تو چغلی کھائے گی نا جیسے جسبیر کور کی تاثیر اُن سیرابیوں کی چغلی کھاتی تھی جن کے منبع کا سراغ غزل جان پہلے ہی متعین کر چکی تھی۔جس کے ہاتھوں میں مٹھائیوں کے خوش ذائقوں کا عجب ہنر تھا۔اس ترپن برس کی بڑھیا کے چہرے پر تیئیس برس کی لڑکی جیسی ملائمت میں شاید ان شیرینیوں اور چکنائیوں کا بھی حصہ رہا ہو، لیکن چربی کا کوئی چھوٹا بڑا باٹ پیٹ اور کولھوں پر چڑھ نہ پایا تھا۔ہلکی پھلکی ٹانگیں سبک قدموں گھومتی رہی۔

"ہاٹ کور کی آنکھیں تو بالکل باپ پر گئی ہیں اور قد بھی۔۔۔"

جوان بڑھیا کی سیاہ چشموں میں آب دار موتی ڈبڈبائے۔

"سورگئی بڑا سندر جوان تھا۔"

"کب مرا۔"

غزل جان نے جیسے بدلے کا پتھر پھینکا ہو۔اُس کی آنکھوں سے بھی زیادہ بڑے آنسو لڑیاں بنانے لگے۔۔۔کیا یہ بھی رو سکتی ہے اُس کے دل کو بھی کسی دُکھ غم نے کبھی چھوا ہوگا۔اِس کے سینے میں بھی کوئی داغ سنبھلا ہوا ہوگا کیا۔کتنے جعلی تھے یہ آنسو۔

"ہوں جھوٹی چورنی۔۔۔"

تیرے جیسی کو کسی ہمدردی کسی پُرسے کی کیا ضرورت ہے۔مر گیا تو کیا ہوگیا کونسا تیرا وجود

پیاس کی شدت میں بنجر ہوا۔لمس کے تر ساؤ میں جوڑ جوڑ سنٹھ ہوا، کونسا چشمہ حیات خشک ہوا۔۔۔

''بس ابھی دو سال پہلے ہی تو۔کرسمس کو تین دن بچے تھے ہائے کیسے کرسمس ٹری سجایا۔

میرے لیے برائیڈل ڈریس لے کر آیا۔۔۔

برائیڈل ڈریس۔۔۔

سورگی بڑا مذاقیا تھا۔۔۔''

وہ بے تحاشا ہنسنے لگی۔

اتنا ہنسی کہ آنکھیں آنسوؤں سے ڈھل کر جلنے لگیں۔''برائیڈل ڈریس۔۔۔میں نے کہا میں کیا وہٹی بنوں گی اور وہ بھی عیسائی وہٹی۔۔۔''

''پر جسبیر سنگھ ایسا ہی تھا۔۔۔مذاقیا۔۔۔''

''کیا جسبیر سنگھ۔''

غزل جان نے اس سکھنی کے مگرمچھ کے آنسوؤں کو سنگین بیزاری سے دیکھا۔ڈرامے باز بے وفا، دغا باز۔۔۔

''ہاں میں جسبیر کور وہ جسبیر سنگھ ہم سکھوں میں بس ایسے ہی ہوتا ہے کور لگا دو تو زنانی سنگھ لگا دو تو مرد۔بس ہم ایسے ہی ہیں کھلے ڈھلے۔موت پر ہنستے زندگی پر روتے ہوئے۔۔۔''

جلیبیوں کے کڑاہے سے اُٹھتی شیرینی بھری بھاپ اُدھیڑ عمر سکھنی کے ملائم گالوں کی شفق کو پسینے میں نہلا رہی تھی، جیسے شنگرفی بھامارتے رس گلے دیسی گھی میں اُبھر ڈوب رہے ہوں۔۔۔

کیا یہ ساری بے موسمی شادابیاں اور رونقیں سورگی جسبیر سنگھ کی یادوں نے بکھیر دی ہیں۔اس عمر اُترتی جوان سکھنی میں چمن سا اُگا دیا ہے۔۔۔

جسبیر سنگھ کی کیفیتوں میں جھلملاتی، روتی، ہنستی جسبیر کور کو وہ حیرت سے دیکھتی رہ گئی۔۔۔اُس شام اپنی بالکونی سے جسبیر کور نے خوشی اور جذبات میں بیٹھے ہوئے گلے کے ساتھ آوازے لگائے،

جیسے جلیبیاں شیرے میں نچڑ رہی ہوں جیسے رس گلے دیسی گھی میں ڈوب رہے ہوں۔

''گجل جان نی گڈی۔ نی گجل جان! ویکھ تے کون آیا تیری اُداسی دُور کرنے، تیری چھنا مکانے ویکھ تے ہاٹ کور آ گئی۔۔۔ میری گڈی آ گئی۔۔۔''

غزل جان نے کھڑکی کا پٹ کھولا۔

ہاٹ کور نے یوں فلائنگ کِس اُچھالا، جیسے بچپن کی بچھڑی ہوئی کوئی سہیلی اچانک مِل گئی ہو۔ وہ ریلنگ سے جھولتے ہوئے اُس سے گلے ملنے کو جیسے ابھی جست بھر دے گی۔

''تسی جی ٹھیک ٹھاک ہو۔ ماما جی نے تہاڈیاں بڑیاں صفتاں کیتیاں سن۔ میں تے آکسفورڈ وچ وی تہاڈیاں گلاں سندی رہی آں۔۔۔''

رس گلوں کی طرح میٹھا میٹھا نچڑتی ہاٹ کور اجنبیت کے سارے فاصلے پھلانگتی مصری کی ڈلی کی طرح گھلنے لگی۔

''کیا رشتہ ہے اس کا مجھ سے کیوں ایسی محبت چھلک رہی ہے، جیسے خون نے خون کو پہچانا ہو۔''

ہاٹ کور پیدا تو انگلستان میں ہوئی تھی۔ اُس کا لباس بھی مغربی طرز کا تھا لیکن جب بولی تو لگا جیسے مشرقی پنجاب کے کسی گاؤں سے ابھی ابھی اُٹھ کر آئی ہے۔

امبر کور وِزٹ ویزہ پر لدھیانہ سے آئی تھی، جس کی مُدّت گزر چکی تھی اور وہ مٹھائیوں کے کارخانے میں روپوش رہتی تھی۔ سوتی بھی اسی کچن میں تھی۔ دُکان کے کاؤنٹر پر آنے سے بھی گریز کرتی وہ بھی گملے میں کِھلے پھول کی طرح جھوم رہی تھی۔

ہاٹ کور کے آنے سے وہ نہال تھی جیسے یورپ کے ان سنگ دل برفیلے اُجاڑ موسموں میں رونق بھر گئی ہو۔

وہ ہاٹ کور سے کھسر پھسر کرتے ہوئے یورپ کا پسندیدہ موضوع بوائے فرینڈز ڈسکس کرتے ہوئے ڈھیروں ڈھیر مٹھائیاں تیار کر ڈالتی، جیسے آنے والے دنوں کی بے یقینی، جوانی کی

بے فعالیت، دن رات اس کچن بند بور زندگی اور شیشوں سے باہر چڑھے تھے، برف کے ٹھنڈے بے حس پہاڑوں کے بوجھ پگھلانے کو یہی ایک گرم موضوع کی ماچس بچی رہ گئی ہو۔ تیلیاں جلا جلا گرمائش پیدا کرنے کی کوشش جاری رہتی۔

غزل جان کے لیے یہ موضوعات ابھی ممنوعات کی ذیل میں تھے، جیسے جین شرٹ پہنتے ہوئے وہ خود کو ننگا ننگا محسوس کرتی تھی۔ شاید یہ احساس آنے والے دنوں میں شیشوں سے باہر جمے برف کے ڈھیروں میں کہیں دب جائے، جنھیں کرینیں اطراف میں جمع کر رہی تھیں۔ ٹنڈ منڈ درختوں کی شاخوں سے برف کا شیشہ یوں لپٹا تھا، جیسے پورا درخت برف کے تودوں سے پھوٹ نکلا ہو۔ یہ رہائشی علاقہ، جو چھوٹا برصغیر معلوم ہوتا تھا۔ یہاں ہندوستان پاکستان بنگلہ دیش چھوٹے چھوٹے سبھی ملک آباد تھے۔ بظاہر کتنا پُرسکون۔

کئی روز سے یہ چھوٹا برصغیر برف میں دھنسا ہیٹر کی حرارتوں سے دسمبر کی یخ بستگیوں کو پگھلا رہا تھا۔ برف کی یہ سفید چادر کرسمس کی نوید میں بچھی تھی۔ ہاٹ کوران برفیلے موسموں میں اپنے مزاج کی گرمی اُنڈیلنے کو اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رات ہی سے کہیں گئی ہوئی تھی۔ جسبیر خوش تھی کہ اُن دونوں کے تعلقات شادی کے لیے سازگار ماحول بنا رہے ہیں اور وہ دونوں کرسمس ٹری پر قمقمے اور پھول لگاتے ہوئے قمقموں کی ہی طرح جلتے بجھتے کرسمس ہالی ڈیز کو خوب روشن اور خوشبودار بنا رہے ہیں۔ شب بھر آسمان نے اتنی روئی دھنکی تھی کہ رستے برف کے ڈھیروں میں گم ہو گئے تھے۔

جسبیر کور آج کارخانے میں نہ جا سکی تھی، ایسی ہنگامی صورتِ حال میں وہ گھر کے باورچی خانے کو ہی کارخانے میں تبدیل کر لینے کا ڈھنگ جانتی تھی۔ وہ صبح سے ہی بڑے بڑے دیگچے، کڑاہے، تھال پرات دھو رہی تھی اور اب میدا گوندھ رہی تھی۔ غزل جان تادیر اپنے فلیٹ کی بالکونی میں سے اُس کے کچن کے شیشوں پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی، جہاں انڈو پاک مٹھائی سنٹر کے لیے مال تیار کرتے ہوئے خوش رنگ تیتری سی پھدک رہی تھی۔ گنگنا رہی تھی۔

کالا شا کالا میرا کالا اے سردار
تے گوریاں نوں پراں کرو
میں آپ تلے دی تار
تے گوریاں نوں پراں کرو

کالا شا کالا۔ یہ کالا شا کالا کون ہے جس نے اُسے اِس عمر میں بھی تلے دی تار بنا رکھا ہے۔ یقیناً وہی جس نے اپنا تانبا سا محلول اُس کی ماں سے خیانت کرتے ہوئے اس سکھنی کے وجود میں حلول کر دیا ہے۔ جس نے اُسے تلے دی تار میں گوندھ دیا ہے۔ کالا شا کالا دہنکائی ہوئی رنگت، پردیس کی برفوں نے جلا دی ہے اور اس دیس میں کالا شاہ کون ہوگا۔ تب غزل جان شیشوں کے باہر برف کے ہلاکت خیز پہاڑی سلسلوں کی ویرانی کو اپنے وجود میں حلول ہوتے ہوئے محسوس کرتی ......نہ پرندے چہچہاتے نہ نباتات نمو پاتے نہ جمادات شناخت ہوتے بس سفید بے جان کفن میں لپٹی ہوئی شہر کی حنوط شدہ لاش......غزل جان کو لگتا وہ اِس میّت کے سرہانے بال کھولے اکیلی ماتم کرتی ہے۔ اِسی لاش پر ہاٹ کورفل بوٹ اور کوٹ، دستانے چڑھائے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے، بھاگتے لپٹتے ایک دوسرے کو برف کے چھینٹے مارتے تو غزل جان کھڑکی بند کر دیتی، بڑبڑاتی ''ماں کی طرح اسے تو لاشوں کی بے حرمتی ورثے میں ملی ہے۔''

غزل جان کا جی چاہا وہ جھپٹا مار کر اپنی ماں کی چرائی ہوئی ساری اچھی چیزیں اُس سے چھین لے جو اُس کے باپ کے وجود میں امانت رکھی گئی تھیں، جنھیں دھوکے سے اس سکھنی نے ہتھیا لیا ہے۔ اُسے اپنی ماں کی یاد ہولا گئی۔

لڑتی جھگڑتی، مرغیوں، بطخوں، بکریوں، کوّوں کو گالیاں اور کوسنے دیتی۔ کپڑوں کی پنڈ سر پر رکھے کس اُترتی۔ چوے سے تین تین گھڑے پانی کے بھر کر لاتی پھر بھی چربی کے باٹ نکلتی اور بی پی کے کئی درجے چڑھا جاتی۔

کبھی ختم نہ ہونے والے انتظار میں، آسمانوں کی وسعتوں میں ٹنگی بجھی راکھ آنکھیں چٹیل

پہاڑی سلسلوں پر سے اُڑان بھرتے کتنے جہاز گزر جاتے۔ جب کبھی یہ جہاز اُترا بھی تو وقت وجود کا کتنا خراج وصول کر چکا ہوتا۔ خالی ہنڈولے میں جھولتی عمر کتنی پہاڑ منزلیں چڑھ چکی ہوتی۔ گھومتا سر، متلاتا جی۔

سب ویران۔ ساری شادابی، تازگی جوانی، نگل لینے والا پیاسا صحرا انتظار۔ اُن چٹیل خشک پہاڑوں سا جنھیں عمر بھر کھودتے رہو تو بھی کبھی کنواں نہیں نکلتا۔ پانی یہاں اتنا گہرا ہے کہ عمریں خشک کنویں کھودنے میں ہی غوطا جاتی ہیں۔ پانی کی اتھاہ نہیں ملتی۔ عجب فطرت ہے اس پوٹھوار کی بھی کہ پتھر لگے، ٹھوکر لگے تو چشمہ پھوٹ نکلے اور کبھی کنواں کھودنے لگو تو عمریں لد جائیں۔ سیکڑوں فٹ نیچے خشک پتھریلی زمین بوند بھی نہ ملے۔ شاید زمین کی اسی تاثیر نے یہاں فطرتیں ساخت کی تھیں کہ شکیلہ جان، صنوبر جان، فاطمہ جان پتھر کی زد میں آئے چشموں کی طرح اُمڈتی رہیں اور اکبر خان، اصغر خان، اظہار الحق کنوؤں کی لمبی کھدائیوں کے پانی کی طرح نایاب ہی رہیں۔ اصغر خان اُسے نوخیز نو بیاہتا چھوڑ کر گیا۔ لوٹا تو آٹھ برس کی بچی کی ماں پژمردہ اور سنجیدہ عورت۔ اگلی بار جوگی والا پھیرا ڈالا تو نوجوان بیٹیوں کی عمر اُتری متفکر ماں۔ وہ اُجاڑ عورت جس کے سارے پھل مرجھا چکے تھے، جن کا مالک ایک آدھ منہ مار کر پال میں لگا گیا تھا اور وہ نمک لگی بھوسے کی تہوں میں دبی، پہلے خوب پکی، خوشبوئیں مہکاریں چوے کے پانیوں اور چٹے پڑ سے اُترتی آبشار میں گھلیں۔ پھر یہ پھل گلنے لگے بو مارنے اور سڑنے لگے۔ مالی کو پال پھرولنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ کتنے میٹھے رسیلے اور قیمتی تھے یہ سارے پھل جو سب ضائع ہوئے۔ وہ تو کسی اور باغیچے کو سینچتا رہا۔

"ارے یہی تو یہ سکھنی۔۔۔"

"کالا شا کالا میرا کالا اے سردار۔۔۔"

فرنس آئل کا بھرا ٹینک کچن کے ہیٹر کو دہکا رہا تھا۔ لمبے بالوں کو سفید ٹوپی سے ڈھکے ہاف سلیوز شرٹ پائجامہ پہنے اور گلابی ایپرن چڑھائے اس سکھنی نے شیشے سے ناک ٹکائی۔ ٹھنڈی سانس کی بھاپ چھٹی اور شیشے پر برف بن جم گئی۔۔۔

”جلدی اندر آ جاتوں کوٹ وی نہیں پایا۔ ہائے ہائے پالا، ہر شئے کھا گیا۔۔۔“
شیشوں سے باہر دیسی کیلنڈروں پر چھپی جیسے کوئی سینری بچھی ہو۔

”برف بھی آگ جیسی تباہی درخت، پھول، پرندے، گھونسلے، سبھی کے لیے موت کا پیغام۔۔۔ گرم کمروں میں رہنے والوں کو کیا خبر کہ اس ٹھنڈ کی ہلاکت کیا ہوتی ہے۔۔۔“

”ہاں ہاں گڈی تو ٹھیک کہتی ہے۔۔۔“

اس سکھنی نے ٹھنڈی آہ بھری کیا اس کے اندر بھی آہیں بستی ہیں تو پھر اس کے چہرے پر ان کا دھواں کبھی کیوں نہیں چھٹتا۔

”ڈھیر ورھے پہلے جب میں یہاں آئی تو بڑا اوکھا ویلا تھا۔ سارے جنے کسی ایک گھر میں ہیٹر جلا کر بیٹھ جاتے۔ افورڈ نہ کر سکتے تھے نا اپنا اپنا ہیٹر۔ ساری سٹریٹ کی لیڈیاں ایک روم میں اور میل دوسرے روم میں۔ باری باری ایک ایک گھر میں، مہینے میں ایک دو بار باری آتی تھی۔ بچت ہو جاتی تھی نا، غیر قانونی جو تھے، چوہوں کی طرح چھپتے پھرتے، پکڑے گئے تو ڈی پورٹ نہ پکڑے گئے تو کیڑے مکوڑوں سے بھی نچلے درجے پر۔۔۔ ہائے ربا کیسے اوکھے ہارڈ، ویلے دیکھے۔۔۔“

یہ سکھنی جو اُس کی ماں کے سارے زیوروں سارے خوشگوار لمحوں سارے حسن جوانی کے خزانے کی ڈکیت تھی کس سکون کے ساتھ اپنے ماضی کو دُہرا رہی تھی۔ چٹی اَن پڑھ برس ہا برس یہاں گزارنے کے باوجود ایک جملہ بھی انگریزی کا نہ بول سکتی تھی۔ پنجابی لہجے میں جو انگریزی لفظ بولتی بھی تھی تو اُسے کیا معلوم یہ پنجابی کے ہیں کہ انگریزی کے چودہ برس۔ کی عمر میں یہاں آئی اور چالیس سال یہیں کھپا دیئے۔ غزل جان نفرت کے تنکلوں میں اُسے پروتی رہی۔

”ہاہا گڈی کیا بتاؤں کیسے کشٹ کاٹے، تیرا ابا جسبیر سنگھ کا سنگی بن گیا۔ ایسی دوستی کم ہی ہوتی ہے جگ میں۔ تجھے تو پتہ ہی ہوگا۔ میں خزان سنگھ کی بیٹی ہوں۔ تیرے باپ کے سنگ اُس گراں میں بچپن کھیلا تھا۔ اُجاڑے پڑے پانچ سات ورھے کی تھی۔ وروں بعد بھی دونوں نے اِک دُوجے کو پہچان لیا۔

''لے سگے بہن بھائی میں کیا پیار ہوگا جو ہم دونوں میں بنا۔ پردیس میں بہن بھائی کا رشتہ جڑا تو حیاتی ایزی ہوگئی۔''

حیرت سے اس انکشاف کو کسی وزنی باٹ کی طرح نگلتی منہ کھولے درد کی شدت سے ڈیلے پھاڑے۔ غزل جان نے سوچا، اگر یہ سچ ہے تو اس کے باپ نے اس حقیقت کو اپنے خاندان کے سامنے کیوں نہ اگلا۔

''پرگڈی! تجھے کیا بتاؤں پردیس ایسا نہ تھا جیسا تجھے ملا ہمیں بڑا اوکھا پردیس ملا۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوتی تو چھپنے کو جگہ نہ ملتی۔ کام پر نہ جاتے تو فاقے پڑتے۔ تیل ختم ہو جاتا چولہے بجھ جاتے لگتا کمبل برف میں لگے ہیں۔

یقین کر پچھتاتے بھی بہت تھے کہ وطن کیوں چھوڑا۔ جتنا ملتا آزادی سے تو ملتا مگر کس منہ سے واپس جاتے۔ وہاں تو ٹہور بنی ہوئی تھی، پچھلوں کی کہ ولائت کی کمائیاں آتی ہیں۔۔۔''

غزل جان کو اپنا گھرانہ یاد آیا جو ولائیتیوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کتنا نام تھا پوٹھوار میں ولائتیوں کے اس خاندان کا، ولائتی گھڑیاں، کمبل، کیمرے، کپڑے، جوتے، ریڈیو، وہ چیزیں جو بڑے شہروں میں بھی بعد میں آئی ہوں گی۔ اِس گراں میں پہلے پہنچی تھیں، لیکن پہنچانے والا یوں چوہوں کی طرح بل بدلتا، فاقے کاٹتا، سردی میں ٹھٹھرتا رہا، کیا یہ سکھنی سچ بول رہی ہے۔ آخر اُس کے باپ نے یہ سب کبھی بتایا کیوں نا شاید اِس نقل مکانی کے جواز کو درست ثابت کرنے کے لیے۔

''بس گڈی یہ پرانی پریت تھی سورگی خزان سنگھ کی محبت جو جالندھر میں رہتے ہوئے بھی مرتے ٹائم تک اسی گراں میں جیتا رہا۔ وہاں کی بولی کبھی نہ چھوڑی وہ بولی جو تیرا باپ بولتا ہے، مجھے لگتا میرا باپ یا باپ کا جنا میرا بھائی آ گیا ہو، جسبیر سنگھ بھی سورگی بڑا خوش ہوتا جب ہم دونوں بہن بھائی یہ بولی بولتے۔''

باہر برف کے بے حس ٹھوس تودوں کو کرینیں اُکھاڑ رہی تھیں۔ غزل جان کو لگا اُس کا وجود ان تودوں میں دبا جا رہا ہے، جیسے کرینوں کے نوکیلے پلڑے اُچھال رہے ہیں۔ کبھی کوئی اپنی

گواہیوں سے یوں بھی منحرف ہوتا ہے۔کبھی نتائج یوں بھی برعکس ہو جاتے ہیں کیا۔۔۔

وہ مشین میں سے کافی اُنڈیلنے لگی۔۔۔مشین کی ٹونٹی سے اُٹھتی بھاپ میں ہاٹ کورا پنے بوائے فرینڈ کے ہمراہ دخل ہونے سے پہلے اپنے قہقہوں کو کال بیل کی جگہ استعمال کرتی تھی۔

جسبیر کور نے جھٹ دروازہ کھولا۔دونوں کے کوٹ برف سے سفید ہو چکے تھے۔ٹوپیاں برف کے گھروندے معلوم ہوتی تھیں۔ناک کی پھنک گال اور ہونٹ برفیلے جھونکوں سے رگڑ کھا کھا کر چھد گئے تھے۔کالر کے اندر دھنسی کچی برف فرش پر پھیلی اور ہیٹر کی گرمی میں فی الفور پگھل گئی۔ جسبیر کور نے دونوں کی حالت پر قہقہے لگائے اور تالیاں بجائیں پھر پٹاخ پٹاخ بوسے دیئے۔

''حرام دے جنے سینو (Snow) میں ہاتھ لیتے رہے ہیں۔سِیک (Sick) ہو گئے تو۔۔۔چلو اُتارو کوٹ اُتارو کافی سِپ (Sip) کرو۔۔۔''

غزل جان کو لگا اس کا وجود منفی ہو گیا ہے۔اِس خاندان کی خوشگواریت کے ریلے میں بہہ گیا ہے۔کسی سر کٹی لاش کی طرح جس کے پاس ہنسنے خوش ہونے کا کوئی دماغ نہیں ہے۔

وہ تینوں مشرقی پنجاب کی ٹھیٹھ بولی میں انگریزی لفظوں کو یوں بھگو رہے تھے، جیسے یہ لفظ بھی ہجرت کر کے یہاں اپنی گاچی مار رہے ہوں، جڑ پکڑ رہے ہوں۔غزل جان کو لگا اُس کا فرنس آئل ختم ہو رہا ہے۔اُس کا ہیٹر بجھ رہا ہے۔وجود کا چولہا ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔اتنے عرصے سے رشک اور غصے عناد کی لکڑیوں سے وہ روشن رہا تھا وہ لکڑیاں سیلی ہو کر یکبارگی دھواں چھوڑنے لگی ہیں۔دم گھونٹنے والا کڑوا دھواں۔وہ فرنس آئل جو انتقامی جذبوں کو بھڑکا رہا تھا اُس کا ٹینک ختم ہو گیا ہے۔ جس میں تیل بھروانے کو اُس کے پاس ڈالر نہیں ہیں اور اب اُسے برف میں لگی رضائی میں رات گزارنا ہو گی شدید سرد موسم نے اُس کا پیٹ خالی کر دیا ہے لیکن وہ کنگلی خوراک خریدنے کی استعداد نہیں رکھتی، شاید وہ اِسی بھوک اور سردی کا شکار ہو جائے اور آج کی رات جاں بر نہ ہو سکے۔جس کی صبح یہاں کرسمس کا تہوار منایا جانے والا تھا۔گرجا گھروں میں گھنٹیاں بجنے والی تھیں اور ایک نئے دن کا آغاز ہونے والا تھا! اُس کا باپ مٹھائیوں کی دُکان بند کر کے، برف سے بھرے تھکے

تھکے بوٹوں کے ساتھ زینے اُوپر چڑھ رہا تھا، جیسے اُس کی ماں سر پر اَن دُھلے کپڑوں کا گٹھڑ اُٹھائے یا دو تین بھرے ہوئے گھڑے رکھے لمبی اترائی چڑھائی بوجھل قدموں اُترتی چڑھتی چڑھتی اُترتی عمر گزار گئی تھی۔

یہ تھکاوٹ اپنے اپنے حسابوں دونوں میں مساوی تقسیم ہوگئی، لیکن المیہ تو یہ ہوا کہ دونوں اس تھکن کے اشتراک سے بے خبر رہے۔ دونوں نہ جان سکے کہ جہاز کی مسافتوں کے درمیان پھیلی طوالتیں دونوں کے وجود میں سیندھ لگاتی رہیں اور دونوں ایک دوسرے کے لٹنے کے حادثہ سے بے خبر اتنے کہ جب اصغر خان بیس برس میں دوسری اور آخری بار گراں لوٹا تو صنوبر جان نے استقبال کرنے سے انکار کر دیا۔ ان طویل پُر ہیجان جوار بھاٹوں نے اُس کے وجود کے چوے میں اتنی کائی بھر دی تھی۔ اتنی ریت جما دی تھی کہ سارا پانی کناروں سے باہر بہہ نکلا تھا۔ چٹے پڑ (سفید چٹان) سے گرتی آبشار نے خود کو اتنا بٹخا تھا۔ ان زوروں اور رفتاروں سے بہایا تھا کہ سفید پڑ، سیاہ کائی زدہ لجلجے جالوں سے لیپ ہو گیا تھا، جسے اب کوئی بھی بارش دھونے پر قادر نہ تھی بلکہ اُس کائی چڑھے وجود کو مزید جالوں اور سیاہیوں میں لپیٹ سکتی تھی۔ کبھی تو اُسے بھی شریکِ غم کیا جاتا وہ رازوں کو صحیفوں کی طرح سینے کی رحل پر رکھ محبت کے ہرے غلاف میں لپیٹ دن رات قرأت کرتی رہتی۔ اس خاندان میں عورتیں کسی رازداری کسی فیصلے کی عملداری میں کبھی شریک ہی نہ ہوسکتی تھیں۔ وہ مرغیوں، بکریوں کو صلواتیں سناتی اور نشیب و فراز چڑھتی اُترتی عمر بھر اپنے ہی آنسوؤں میں غوطائی رہتیں۔

غیر قانونی تارک الوطن پتہ نہیں کہاں کہاں چھپا، برفیلے موسموں میں سے کیسے جانبر ہو سکا۔ کتنے فاقے کتنی تنہائیاں، کتنی ویران سنٹھ راتیں جوان جسم کو کچلتی ہوئی گزر گئیں، اگر صنوبر جان دُکھ میں شریک کی جا سکتی تو وہ اپنے ہی آنسوؤں سے خود کو سدا شاداب رکھتی اور جا کر نہ مڑنے والے کی مجبوریوں میں خود کو باندھے پُرسکون رہتی۔

اگر یہ سکھنی بھی نہیں تو پھر اور کون۔ صرف وجود کی سنٹھ تنہائیاں یا کبھی کبھار کوئی پرا سٹیچوٹ

یا شاید وہ بھی فضول خرچی کے زمرے میں آتا ہوگا۔ جس طرح شراب اور سؤر ممنوع تھا اسی طرح ہر وہ شئے جو ڈالروں کے عوض بکتی وہ حرام قرار پائی۔ ڈالر اُس گراں میں منافع کمانے لگے۔ اسلام آباد کی وہ کوٹھیاں جو سفارت کاروں کو کرائے پر دی جاتیں، لیکن ان کا مالک مٹھائیوں کے شیرے میں لتھڑا دال، کڑھی، مسی روٹی کھاتا۔ دودھ اور بریڈ کی بھی بچت، وجود کی نکاسی کے لیے بھی شاید کوئی مقتایا پھر روزے اور صبر کے باٹ۔ اسی وجہ سے تو وہاں گراں میں مقیم پورا گھرانہ ولائتیوں کا گھرانہ کہلایا۔ بھانجے بھتیجوں نے نئے ماڈل کی گاڑیاں خریدیں، امپورٹڈ گھڑیاں عینکیں بیگ، کپڑے جوتے، اسلام آباد کی پوش سڑکوں پر لمبی ڈرائیو اور مہنگے ریستورانوں میں ہائی ٹی۔ اس ایک فرد کی بدولت پورا خاندان پوٹھوار کے بیسوؤں گراؤں میں کس عزت اور رشک سے دوچار ہوا اور خود وہ۔۔۔ تھکے قدموں بجھی آنکھوں اور پژمردہ چہرے کو جیسے برف کے طوفان نے یخ بستہ لپیٹ دیا ہو۔

''ہاٹ کور آئی ہے۔''

''ہاں اپنے منگیتر کے ساتھ۔''

وہیں سے وہ پلٹ گیا۔

''بڑا کھلا ڈھلا لڑکا ہے یہیں اپنے ہاتھوں میں تو پلا جسبیر سنگھ کا بھتیجا تھا نا۔۔۔
ابھی مِل کر آیا۔''

غزل جان کو دیکھ کر جیسے ٹنڈ منڈ درخت کی برف لپٹی شاخیں جھنجھنائیں، جیسے منہ چڑاتی ٹھینگے دکھاتی ہوں۔

یورپ کے اِس حقوق و فرائض والے معاشرے نے اُسے اتنا تو حق دیا تھا کہ وہ اپنی زندگی کے فیصلے خود اپنی مرضی سے کر سکے، اگر مہندی والی رات دُلہن کی جگہ خالی چھوڑ کر بھاگ نکلنے کا حوصلہ اُسے حاصل تھا تو پھر یخ بستگیوں میں لپٹا یہ مُلک تو حقوقِ نسواں کی دوڑ میں بہت آگے تھا جہاں جذباتی رِشتے اور زبردستی نافذ کیے گئے اپاہج احساسات با آسانی رد کیے جا سکتے تھے۔ پیر تسمہ

پا کے ناگوار بوجھ کو اوندھایا جا سکتا تھا اور برفیلی یخ بستگیوں میں دفنایا جا سکتا تھا۔ کبھی کبھی رات کے کسی پہر یورپ کی کلچرڈ خاموشیوں میں لپٹی یہ ماڈرن سٹریٹ دیسی غراہٹوں سے ان کلچرڈ ہو جاتی۔ کسی مشرقی لڑکی کو اُس کا جھومتا جھامتا بوائے فرینڈ الوداعی کس کر کے چھوڑ جاتا تو کاروکاری کی ریت کا ماتم ،ٹکڑے ٹکڑے کر کے دریا یا نہر میں بہانے کی یادگار ، زندہ زمین میں گاڑنے کا حسرت ناک ماضی ،تا دیر خود کو پیٹتا اور بین ڈالتا رہتا۔

غزل جان چوتھی منزل کی اُس پرانی وضع والی کھڑکی سے نیچے جھانکتی پوری سڑک پر ایک جیسے نقشے کے مکانوں میں ٹوٹتی بکھرتی دیسی معاشرت اپنی بقا کے لیے واویلا ڈال رہی ہوتی۔ اُس وقت کا ماتم جب یہ بچے پیدا ہوئے جب انھیں یہاں کے اسکولوں میں داخل کیا گیا اور جب یہ والدین یہاں منتقل ہوئے۔ یعنی پورا ماضی ساری زندگی بے کار، رد، کالعدم ریاضت۔

عجب لوگ ہیں بہتے پانی کے مینڈک تو بن گئے لیکن جن کو اس دریا کے بیچ جنم دیا ہے۔ اُنھیں اپنی جاہنگوں تلے چھپا کر خشک رکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی پھسل کر دریا میں ڈُبکی لگا بیٹھے تو اُس کی مرگِ ناگہاں کا ماتم کرنے لگتے ہیں۔ جب کہ ماحول اور فطرت کی اِس مجبوری کی ذمہ داری تو خود اُنھی پر عائد ہوتی ہے۔

ساتھ والے مکان میں ہاٹ کور اور بنٹی سنگھ بالکونی میں بیٹھے ایک دوسرے سے جھگڑ رہے تھے۔ ہاٹ کور اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے اُس پر حملہ آور ہوئی۔

جنور دا جنا، گشتی دا پوت، ماں یا۔۔۔'' جنور دا جنا گشتی دا پوت غراتا ہوا اُٹھا۔ جنگلی بھینسے کی طرح حملہ آور ہوا۔ وہ کرسی سے لڑھک گئی دونوں گتھم گتھا، لوٹیں کھانے اور ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے لگے۔ دانتوں سے، ناخنوں سے، تیز پنجوں سے، ایک دوسرے کو اُدھیڑنے لگے، بالکونی کی ریلنگ سے بجتی ٹانگیں اور ایک دوسرے کو لپیٹے بازو فالتو توانائیوں کی زور آزمائی اب اپنے منطقی انہدام کی سمت گامزن تھی۔

غزل جان نے کھڑکی بند کر دی۔ کیا ان برفیلے موسموں میں بھی بے اختیار تپش سلگتی ہے۔

یہاں بھی بدن تپتا اور جوڑ ٹوٹتے ہیں۔ یہاں بھی برف کے بطن سے دُھواں اُٹھتا ہے اور بدن کے بھیتر سے خواہش کا ناگ ہراہراتھوکتا ہے اور کوڑیالے پھن پھیلاتے اور ڈسنے کو کوئی ہدف مانگتے ہیں۔

اُسے اپنی ماں کا صبر سلسلۂ کوہِ پوٹھوار سے زیادہ پُرحجم لگا۔ جس پر اُس گراں کے سبھی کسوں، دندیوں، گگرّوں، آبشاروں اور چوں کے باٹ دھرے تھے کہ بھاپ کی شدت سے ڈھکن کتنا ہی پھڑ پھڑائے لیکن اُڑ کر فضا میں معلق کبھی نہ ہوسکے، لیکن یہاں تو یہ ڈھکن ذراسی حرارت سے ہی دھک دھک کرنے لگتا، بجنے لگتا۔ ہیٹر کی سلاخیں لال چہرہ انگارہ بن چکی تھیں۔ باہر برفوں کے سینے سے دُھواں اُٹھتا تھا۔ اندر ہیٹر کے انگارہ وجود کی حدت جلاتی تھی۔ اُس نے جیکٹ اُتار کر پھینک دی۔ آنکھوں، گالوں اور ہونٹوں کی تپتی ہوئی سرخ سلاخیں...... باہر بالکونی میں آگ پر برف کے جھالے پڑ رہے تھے۔ اور یہ اصغر خان ان برفیلے موسموں میں ٹھٹھرتے کانپتے جتنا فرنس آئل بچا پاتا تھا، ڈرافٹ بنا بنا واپس وطن بھیج دیتا تھا۔ اتنی بچت، اتنی کنجوسی، اتنا انقباض، وجود کی روانی سنٹھ تھی کہ کسی سیرابی کے قابل ہی نہ رہی تھی۔ ان یخ موسموں میں ہیٹر کی گرمی جب میسر آئی تو وجود کا انگارہ ٹھنڈی راکھ میں تبدیل ہو چکا تھا۔ لیکن غزل جان کو تو ورثے میں ہیٹرڈ کمرہ میسر آیا تھا۔ گرم آرام دہ یہ بدن کی الکساہٹ بھی کتنا فساد۔

اُسے مصروفیت ڈھونڈنی چاہیے ورنہ ماضی کے کنویں کی سیاہ دیواروں سے اُلٹی لٹکی چمگادڑ کی طرح دن کی روشنی میں دیکھنے کے قابل نہ رہے گی۔ اُسے اپنی بینائی کو بچانا چاہیے، ورنہ شبیہوں کی دھندلی تاریکیوں میں ہیولوں کو تلاشتی سایوں کی لایعنیت میں معدوم ہو جائے گی۔ وہی مشغلہ جو یہاں آباد پاکستانیوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ مٹتے ہوئے، گم ہوتے، معدوم ہوتے ہیولوں کے بھوت پالنے کا مشغلہ۔ جو شاید اب خود اُنھیں بھی ڈرانے لگے تھے۔ یہ بھوت آدھی رات کو حملہ آور ہوتے اور بقیہ آدھی رات کو اپنی عفریت میں لپیٹ لیتے۔ وہی بھوت جو اُس گراں کے پہاڑی نشیبوں میں شب بھر ڈھولک اور پرات بجا کر مہندیاں مائیوں اور شادیاں رچاتے تھے۔ لگتا ہر پاکستانی کے ساتھ اُس کا بھوت بھی نقل مکانی کر کے یہاں منتقل ہو گیا ہے۔ یہ بھوت اُنھیں حال میں نہیں جینے دیتا۔ اُن کے

قدموں، ذہن اور سوچ کی بریکیں بار بار کھینچ ڈالتا ہے۔ چلتی گاڑی کی زنجیر کی طرح، پہیے پٹڑی پر گھڑگھڑاہٹ کے شور کے ساتھ جامد۔۔۔ ہر گھر پر ایک بھوت پہرا دیتا ہے۔

غزل جان کا بھوت ابھی زچگی کے درد جھیل رہا تھا۔ اُس کی پیدائش کے مراحل انتہائی تکلیف دہ تھے کیونکہ وہ جب وطنوں سے الگ ہوئی تو وطن ساٹھ اور ستر کی دہائی سے آگے نکل گیا تھا۔ نازل اور مسلط کیے گئے بھوت مزاحمتی رویوں سے نبرد آزما تھے۔ کئی ایک طویل کھائیوں، تاریک غاروں میں ہار کے زخم چاٹ رہے تھے۔ اب اُن کی دسترس سے آبادیوں کے ڈونگھے لڑ نکلتے جا رہے تھے۔ وہ غولِ بیابانی ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں یورپ میں جنات بستے ہیں یا صرف برصغیر کے ویرانوں پر ہی اپنی سلطنت قائم رکھے ہوئے ہیں۔ شاید وہ بھی یہاں پبّ کی بوتلوں سے چسکے چسکے پینے کے شوقین ہوں گے، حسیناؤں کے ہاتھ پکڑ کر رقص کرتے ہوں گے۔ نیم برہنہ سن باتھ لیتے ہوں گے، بکنی پہن کر سوئمنگ پول میں ڈائیو لگاتے ہوں گے، یہ جنات جس انسانی بستی کا حصار ہوتے ہیں اُسی کے رسم و رواج میں رنگ جاتے ہیں، جیسے گراں کے کسوں، پہاڑوں کھائیوں میں اِسی گراں واسیوں کی نقل میں شادیاں اور مرگ کی مجالس سجاتے تھے۔ یہاں بھی انھی انسانوں کی ریس کرتے ہوں گے بندر کہیں کے۔

غزل جان کو یہی فرق محسوس ہوتا کہ وہاں وہ انسانوں پر مسلط تھے اور یہاں انسانوں کے تابع، اُسے یورپی معاشرے کا یک نکاتی ایجنڈا سمجھ میں آیا تھا۔ یہاں انسان ہر معاشرت، ہر رواج پر ہی نہیں جنات سے بھی اتم ہے اور یہ سب تو اب اُس کی ذات اور پسند کے تابع ہو گئے ہیں۔ جبکہ وطنوں میں انسان ان سب کے تابع ہے۔

کالج کا بیس منٹ کا رستہ طے کرتے ہوئے ایک روز ساتھ والی خالی سیٹ پر کوئی اچانک آ کر بیٹھ گیا۔ اِس معاشرت کے قوانین کے تحت وہ اُسے اُٹھنے کو نہ کہہ سکتی تھی۔ سوائے یہ احتیاط کہ درمیان میں اپنا ہینڈ بیگ رکھ کر خود کو انتہائی کنارے پر محفوظ کر لے۔

''آپ یقیناً پاکستان سے نا۔۔۔ پاکستانی لڑکیاں ہی اِس قدر Shy ہو سکتی ہیں۔۔۔''

اُس کا جی چاہا چیخ کر کہے میں Shy نہیں ہوں۔ میرے کچھ اصول اور حد بندیاں ہیں جو میری صدیوں پرانی معاشرت نے مجھ تک منتقل کی ہیں، لیکن لگا اس کی مسکراہٹ میں وہ بھوت غصے سے چنگھاڑا تھا جو اُس گراں سے اُٹھ کر غزل جان کے ساتھ ہی یہاں منتقل ہونے کی کوشش میں تھا۔ بد بخت یہاں بھی؟ کیا ضروری ہے کہ ہر عمل ہر لحظہ اسی کے تابع گزارا جائے۔ اُس عفریت کو اپنی سماعتوں اور بصارتوں سے اُس نے دیس نکالا دے دیا۔۔۔ ''دُر دفع'' اور مہندی کی تقریب میں دُلہن کی جگہ خالی چھوڑ کر بھاگنے والی غزل جان پھر پُر اعتماد ہو گئی۔

وہ مزید قریب کھسک آیا تھا، اتنا کہ دُور ہونے کی گنجائش ہی اُس کے پاس نہ رہی تھی۔

اُس کی اُردو کا لہجہ دلّی یا لکھنؤ کا ہو سکتا تھا، لیکن وہ آگرہ سے تھا۔ دِلّی نہ لکھنؤ بلکہ تاج محل والا آگرہ اُس نے کہا تھا۔

''یہ تاج محل عجب تاثیر رکھتا ہے۔ اُس نے اپنے شہر کے باسیوں کو اپنے آسیب کا شکار کر رکھا ہے اور وہ ہے محبت کا آسیب۔۔۔''

غزل جان نے سوچا یعنی بھوت یہ بھی کسی بھوت کے زیرِ سایہ ہے۔

''آگرہ واسیوں کا دل پوری دُنیا کے دلوں سے الگ دھڑکتا ہے۔ اِس دل میں کوئی کھوٹ، کوئی حرص، کوئی مادیت نہیں۔ بس محبت کا جمنا جو تاج کا حصار ہے۔ تاج جس بستی میں رہتا ہے اس مٹی میں تاج کی تاثیر گھلی ہے جو اُن دلوں میں رچی ہے جو تاج نگری میں بسیرا کرتے ہیں۔ دُنیا کا سب سے خوش قسمت شہر آگرہ کہ اُسے محبتوں کی تاج پوشی کا شرف حاصل ہے۔ تاج امرت جل سے سینچا ہوا پریم ندی کا کنول پھول۔''

''شاید اُس کی باتوں کو بھی تاج کی شیریں محبتوں میں گھلے شربت نے سینچا تھا۔ وہ گم صم تکتی رہی۔ سماعتوں میں پریم رس کو انڈیلتی رہی جیسے سامنے خود تاج محل آن کھڑا ہوا ہو۔ اپنی پوری سحر انگیزیوں، عظمتوں اور محبتوں کے ہمراہ جمنا کنارے لہلہاتا، سفید بُراق کنول سا تاج مسکراتا ہوا اُس کی نگاہوں میں ترازو ہو گیا تھا۔ تاج ایسا ہوتا ہے کیا؟ جیسا یہ تاج واسی حسین، پُر وقار، میٹھا،

بصارتوں میں اُترتا ہوا تو پھر کمال ہوتا ہے۔ اُس نے تاج کی جو تصویریں دیکھی تھیں جو تفصیلات پڑھی تھیں۔ اُن میں اتنا سحر، رومان اور زندگی نہ تھی جتنی شادابی، تازگی اور حرارت اس تاج واسی میں چھلکتی تھی۔ جمنا کی روانی کہ تاج کی اسراریت۔۔۔"

اُس کا سٹاپ پہلے تھا وہ سیٹ سے اُٹھا اُس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور چلا گیا۔

وہ وقوعہ کی شدت میں ساکت وصامت رہ گئی۔ یہ عمل یہاں موجود کسی کے لیے بھی قابلِ توجہ تھا نہ ہی قابلِ اعتراض، عجب بات تھی نہ کسی نے کنکھیوں سے دیکھ کر تمسخر کیا نہ اُس کی عزت بچانے کو لپکے نہ عزت بچاتے بچاتے خود اُس پر ٹوٹ پڑے۔ عجب حادثہ ہوا تھا جیسے تاج ازخود اُس پر جھکا ہوا اور اُس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر کے اپنی عظمتوں اور رِفعتوں کے ہمراہ اپنی جگہ پر ایستادہ ہو گیا ہو۔ عظیم اور نایاب لیکن اُس کی پیشانی کندہ ہوگئی تھی۔ مہر بند ہوگئی تھی۔ وہ نام ثبت ہو گیا تھا جسے وہ پوچھ بھی نہ سکی تھی۔ اب تو وہ اُسی نام سے آلودہ ہو چکی تھی۔ وہ جس معاشرے کا حصہ رہی تھی اُس میں تو جو نام ایک بار محسوسات پر کندہ ہو جاتا تو پھر اُسے مٹایا یا تبدیل نہ کیا جا سکتا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں شکیلہ جان، صنوبر جان، فاطمہ جان، زرینہ جان گھوم گئیں اب اُسے باقی ماندہ عمر کیا تاج کے آسیب میں گزارنا تھی۔ اُس گراں کے نشیبوں، کھائیوں میں بھوتوں کے ہمراہ بسنے والے انتظار کا یہ سلسلہ اب تاج سے جڑ گیا تھا کیا؟ اب اُسے پل پل لحظہ لحظہ بھگتنا اور انتظار شمار کرنا تھا۔ اُسے پیشانی کے اس حصے کو جمنا کے پاک پانیوں سے بار بار دھونا تھا، وہ تو اُس گراں کی باسی تھی۔

جہاں پر یت کی ذرا سی پٹڑی پر جھنجھناتی ریل گاڑیوں اور چٹے پڑ پر بال کھولے دھمال ڈالتی آبشار کے پانیوں میں وفا کے تعویذ منڈھے تھے جن پر اب تاج کی سند لگ گئی تھی۔ جس طرح چواپاک کے پانیوں سے عمر بھر دھوتے رہنے سے محبت کی وہ سند مزید نکھرتی چلی جاتی تھی۔

اِک عجب احساس نے اُسے مات دے دی تھی۔ وہ جو تاج کی سرزمین کا پروردہ تھا۔ اُسے کیا معلوم کہ یہ جذبہ پنڈی کے اس گراں کی سُرخ مٹی کے لہو سے، چوے کے شفایاب پانیوں سے، دھریک کے جھنڈ سے، منتوں بھری دُعاؤں سے گچ ہو یورپ کے اِس ٹھنڈے مُلک میں آ

کر غزل جان سے لپٹ گیا ہے پر وہ تو محبتوں کا سند یافتہ ہے۔ تاج کا پروردہ ہے۔ غزل جان عجب احساسِ کمتری کا شکار ہوئی۔ اُسے تو تاج محل جیسی سرشار محبتوں کی سیرابی حاصل تھی لیکن یہ گراں واسن تو ذرا سے چوے ذرا سے گاؤں کو گھیرے پہاڑی حصار میں گمنام۔۔۔ پر یہ گراں واسیں تو جس وجود کا منتر ایک بار خود پر پھونک لیتی ہیں، بس پھر اُسی سحر میں بستی ہیں۔ اُسی من سمندر میں قطرہ قطرہ ہو رُڑھ جاتی ہیں۔ وہ تاج محل کی دھرتی کا باسی کیا جانے کہ تاج دُنیا کے لیے اَمر ہوگا لیکن تاج میں سینچا یہ جذبہ تاج کا مرہونِ منت نہیں ہے۔ یہ کہیں بھی کسی بھی زمین سے پھوٹ نکلتا ہے لیکن اُس نے کہا تھا کہ وہ محبتوں میں مستند ہیں کیونکہ وہ تاج کے پروردہ ہیں۔ یخ راتوں میں حدت بھرے کمرے میں اُس کے ماتھے کا وہ حصہ تپنے لگتا، جہاں محبت کا اوّلین بوسہ ثبت ہوا۔ وہ اُسے چھوتی تو اُنگلیاں جل اُٹھتیں۔ کیا یہ تپش اُن ہونٹوں پر بھی محسوس ہوتی ہوگی وہ بھی اپنی پوروں سے ہونٹوں کی پھانکوں کو مس کرتا ہوگا جن پر اب اُس کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ شکیلہ جان کے ان حرفوں نے پہلی بار معنویت کا عذاب حاصل کر لیا تھا۔

''کدوں آ سو کیڑی گڈی توں لہسو۔''

آسمانوں سے ٹنگی صنوبر جان، فاطمہ جان کی خالی نگاہوں کے سبھی مفاہیم واضح ہونے لگے تھے۔ تاج اُس کے وجود میں سرایت کر رہا تھا۔ بے داغ سنگِ مرمر کی سفید اینٹوں کو اُس کے بھیتر ایک عالیشان محل کی صورت اُسار دیا تھا۔ گنبدوں اور جالیوں میں گندھی اُن محبت اُنگلیوں سے اُس کے دراز بالوں کو گوندھ دیا تھا۔ ایک ایک موئے زُلف پر درج تھا۔ ''تاج، تاج'' پوروں کی تسبیح اِس نام کا ورد اتنی بار پھرول چکی تھی کہ ہر پور کے دانۂ تسبیح پر تاج تاج کندہ تھا۔ پتہ نہیں ہندو تھا کہ مسلمان اِس سے کیا؟ وہ تو تاج تھا۔ تاج محل۔۔۔ مذہب و مُلک سے کہیں بلند، اعلیٰ اور جاوِداں۔۔۔

وہ روزانہ اُسی ریل گاڑی میں سوار ہوتی، جس میں سیکڑوں مسافر سوار ہوتے تھے لیکن اب وہ خالی خولی منزل تک پہنچ جاتی۔ شکیلہ جان کی سرگوشی ہر بھری ہوئی سیٹ میں بدبداتی۔

''ساری گاڑی خالی، کوئی ایک بھی نہیں مسافر۔۔۔ سنم سان۔۔۔'' وہ تاج کی سرشاریوں میں پل پل گندھتی کہ تاج اپنی تمام رعنائیوں تمام تر رونقوں کے ہمراہ اُسے تنہا خالی اور اُجاڑ چھوڑ گیا تھا۔ اتنی لمبی اور پرآسائش ریل گاڑی کو سنسان کر گیا تھا۔ یہ سیکڑوں مسافروں سے بھری ٹرین خالی خولی دِل والی پٹڑی سے گزرتی رہی۔ جب کوئی سوار ہی نہیں ہوتا تو چلتی کیوں ہے۔ ہر گزرتے لمحے میں تاج کی عظمتیں اُس کے وجود میں حلول ہوتی چلی گئیں، جس وجود کو چوے کے پاک پانیوں نے سیراب کیا تھا۔ بیسووَں بار کنگھا کرتے ہوئے ایک ایک بال پر تاج کا فسوں پھونکا تھا۔ کتنی بار یہ جملہ دُہرایا تھا۔

''تاج کب لوٹے گا۔''

اُس کے وجود میں زرینہ جان ٹوٹتی سانسوں میں کراہتی۔

''کدوں مڑسو، کیڑی گڈی توں لہسو۔''

شکیلہ جان کی بے سود ریاضت کو کتنے خشک موسموں نے آکاس بیل میں تبدیل کر دیا تھا جو اُس کے وجود کو لپیٹتی اور نگلتی چلی گئی تھی۔

یہ صدی کا نواں دھیایا تھا۔ اب ریاضتیں ثمر بار ہونا جانتی تھیں۔ وہ آخری مسافر تھا جو سوار ہوا بعض اوقات اتفاقات اس قدر ڈرامائی انداز میں وقوع پذیر ہوتے ہیں کہ معمولات بھی فلم معلوم ہونے لگتے ہیں۔ آج بھی اُس کے ساتھ والی سیٹ خالی تھی۔ آج بھی تاج اِسی انداز میں در آیا تھا اور پیشانی کے اُسی حصے پر گرم نرم لب رکھ دیئے تھے۔ تاج محل بارگاہِ محبت میں اپنی رِفعتوں کے ہمراہ جھکا تھا اور اُس کی پیشانی پر محبت کا گنبد تعمیر کر دیا تھا۔ وہ گنبد جس کی تعمیر میں بیسیوں برس کھپ گئے لیکن لبوں کے معمار نے ایک ہی ضرب میں اسے مکمل کر دیا تھا۔ بے داغ سنگِ مرمر کا پُرشکوہ محل تاج......تاج محل۔ غزل جان کو محسوس ہوا وہ اُس جانور کی مانند ہے جس کے بدن پر اُس کے مالک کا نام جگہ جگہ داغ دیا جاتا ہے۔ اب وہ غزل جان نہ رہی تھی۔ اُس نام میں بے شناخت ہوگئی تھی، جس نام کو وہ بس اتنا جانتی تھی۔ ''تاج'' اُس نے یوں پایاب کیا تھا کہ کسی اور جوگی

چھوڑی ہی نہ تھی، جسے خود ہی اُس نے ایک پکار دے ڈالی تھی۔ ''تاج، تاج محل۔'' پوری کی پوری مفتوح ماتھے پر ثبت ہوا وہ بوسہ پورے بدن نے پہن لیا تھا۔ کتنا خوش رنگ پیراہن ہر ہرا عضا مٹکتا کھنکتا، رنگلی چنریاں ہوا میں پھڑپھڑائیں۔ روم روم پر دو کھلے گرم ہونٹ دھرے تھے، جن سے وہ آلودہ ہو چکی تھی۔ پور پور پر تاج تاج کی گرم سلاخیں گڑھی تھیں۔ اگلے سٹاپ پر وہ اُترا تو اُسے ہاتھ تھام کر ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ نامنظور کرنے کا کیا جواز رہ گیا تھا۔ ہر ہرا حساس نے تو پہلے ہی پسپائی اختیار کر لی تھی۔ یہ بوسہ نہ ہوا منگنی کی انگوٹھی ہو جیسے شادی کا جوڑا ہو۔ نکاح کے دو بول ہوں۔ قیمتی عروسی جوڑا اور طلائی زیورات ہر ہرا حساس انھیں پہنے مٹکتا ہو۔ لال سنہری عروسی چوڑیاں جھنجھناتا ہو، چھن چھن چوڑیاں۔ اُسے مرد کے پیچھے چلنے کی تربیت دی گئی تھی لیکن وہ اُس کا ہاتھ پکڑے ساتھ ساتھ چلا رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔

اے میرے مجازی خدا! مجھے تو آپ کے قدموں پر سر رکھ کر چلنا سکھایا گیا ہے۔ یوں مساوی ہم قدمی شاید ہمارے مذہب میں ممنوع ہو گی۔ میری نگاہیں تو صرف آپ کے قدموں سے لپٹنا چاہتی ہیں، ہر ہر قدم تلے رُندنا چاہتی ہیں۔

''ادھر ایک دوست کا فلیٹ ہے۔ ہم اکثر وِیک اینڈ پر وہاں جمع ہوتے ہیں اور انجوائے کرتے ہیں۔ تم میرا ساتھ دو گی نا۔۔۔''

وہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ نہ سکی کس قسم کی انجوائے منٹ۔ تاج کے رُوبرو تو زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں صرف رونگٹے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ حیرتوں اور محبتوں کی سرشاریوں میں، تسنیم و کوثر سی پاکیزہ نہروں میں سیراب ہوتی ہر ہر درز میں جھلملاتے چراغوں میں نکھرتی گنگ محبت۔

''گھبراؤ نہیں وہاں اور بھی لڑکیاں ہوں گی لیکن تمہارے جیسی خوبصورت شاید ہی کوئی دوسری ہو۔۔۔''

وہ محبت کی کسی ایسی واردات کی گواہ نہ تھی، جو یکدم تمام منزلیں طے کر جائے۔ نگاہیں چار ہونے سے پہلا لفظ بولنے کے بیچ برسوں کا فاصلہ حائل ہوا کرتا ہے۔ پہلا لفظ بولنے سے ہاتھ

پکڑنے تک تو صدیاں بیت جاتی ہیں، بلکہ یہ مرحلہ تو کبھی آ پاتا ہی نہیں، وہ تو اُس عشق کی گواہ تھی جو سینے کی دھڑکنوں کے ساتھ صرف بند لبوں میں تسبیح کے دانوں کی طرح پور پور پھرولا جاتا تھا لیکن اِس دیس کا دستور نرالا تھا۔ وہ دورانِ سفر کئی بار حیرتوں کا شکار ہو چکی تھی جب کوئی اجنبی مرد عورت بس پہلی ہی ملاقات میں کہیں اُٹھ کر چل دیتے یا وہیں سیٹ پر ہی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے۔ وہ پسینے سے گچ شیشے میں دھنستی چلی جاتی۔

''شاید اِسی لیے ابا ہمیں یہاں نہ لاتے تھے۔''

محبت کو احترام کا تعویذ بنا کر گلے میں پہننے کا زمانہ شاید یہاں لد گیا تھا۔ اب محبت فطرت کی روانی کی تابع تھی۔ وہ سوچتی شاید محبت بھی اپنے Fundamental حقوق حاصل کر چکی ہے۔ وہ بھی اب یکطرفہ ٹریک سے اُتر جاتی ہے۔ استحصالی ہاتھوں سے پھسل نکلنے کی چالاکی حاصل کر لیتی ہے۔ جب محبت چالاک ہو جائے تو پھر تاج محل پر کیا گزرتی ہے، لیکن آج وہ خود اسی انقلابی احساس کے ساتھ اُٹھ کر اس اجنبی کے ہمراہ چل دی جیسے وہ مہندی کی تقریب میں دُلہن کی جگہ خالی چھوڑ کر چل پڑی تھی۔

''موڈ ہے نا انجوائے منٹ کا۔۔۔''

وہ اب بھی یہ پوچھ نہ سکی۔

''کیسی انجوائے منٹ۔''

وہ تو مشرقی گائے کھنچتی چلی جا رہی تھی جو بکنے کے بعد اپنے مالک کے ہمراہ ہو لیتی ہے۔ وہ چاہے ذبح کرنے لے جا رہا ہو کہ پالنے پوسنے، کال بیل بجا کر اُس نے کان میں کہا تھا۔

''ویسے یہاں داخل ہونے کا اپنا ایک اصول ہے لیکن پہلی بار آنے والوں کے لیے تھوڑی Concession ہو سکتی ہے لیکن اگلی بار ہرگز نہیں۔۔۔'' اُس کی تپتی لوؤں سے گرم سلاخیں چھوا دی تھیں۔

دروازہ کھلا اور جو منظر غزل جان کی نگاہوں پر طلوع ہوا وہ اُس کے تصوّر کے پاتال میں

بھی نہ سما سکتا تھا۔ وہ سبھی برہنہ تھے۔ لڑکے لڑکیاں بیسیوؤں کی تعداد میں چیختے چلاتے ہیجانی قہقہے لگاتے۔۔۔ کیا تاج بھی۔۔۔!

کہتے ہیں جمنا میں پیوست تاج کی مضبوط بنیادیں کھوکھلی ہو چلی ہیں۔ اُس کے بے داغ شفاف سنگِ مرمر داغ دار ہو رہے ہیں۔ قرب و جوار میں لگی فیکٹریوں کی بھٹیاں اپنی راکھ مل کر اُسے بدرنگ بنا رہی ہیں۔ اُسے انتہا پسندوں سے شدید خطرہ ہے کہ محبت کی اِس یادگار کو منہدم کر دیا جائے گا۔ نفرتوں کی بلی چڑھا دی جائے گی۔ اُسے لگا انتہا پسندوں نے میزائل، بم، ایٹم بم ہر طرح کے اسلحے داغ دیئے ہیں۔ دھس دھس دھڑام تاج کرچی کرچی زمیں بوس، جمنا کنارے خشک اُجاڑ، یہاں کبھی تاج محل بستا تھا جو محبتوں کی یادگار تھا، لیکن اب نہیں تو کبھی نہیں تھا۔ تب پتہ نہیں کیسے اُس بک چکی گائے نے سینگ اکڑا لیے اور رسہ تڑوا کر بھاگی۔ پیچھے منہدم تاج محل کی چنگھاڑ گونجتی رہی، قہقہے لگاتے اُسے بھاگتے دیکھ کر وہ سب انجوائے کر رہے تھے۔

''پاکستانی ہے نا۔''

(پاکستانی) جیسے کوئی گالی۔

اس یورپ کا یہی تو فائدہ ہے کہ کسی نے اُسے پکڑنے یا زبردستی انجوائے کروانے کی کوشش نہ کی تھی۔ سب اُس کے موڈ پر منحصر تھا۔ اچھا نہیں نہ سہی اور سہی۔۔۔ وہ واپس انڈرگراؤنڈ ٹرین میں بیٹھی یوں نڈھال تھی جیسے ان سبھی مادرزاد ننگوں نے مِل کر اُس کا رَیپ کیا ہو۔ تاج محل کی نگری سے آنے والا اس قدر ناواقفِ آدابِ محبت بھی ہو سکتا ہے۔ تاج محل جمنا کی آلودگیوں میں دھنستا چلا گیا۔

داغ دار پیلاہٹ زدہ سنگِ مرمر، کہتے ہیں تاج محل منہدم ہونے والا ہے۔ پتہ نہیں کب نیست و نابود ہو جائے۔ یہ نوادراتِ زمانہ مٹ رہے ہیں۔ منہدم، نیست و نابود، تباہ و برباد، گولی سیدھا بھیجا پھاڑتی نکل گئی، کتنی پرسرعت موت۔ کتنا محروم تھا یہ یورپ۔ محبت کے درمیانی کتنے مراحل لپیٹ دیئے گئے۔ کمان سے چھٹتا ہوا تیر سیدھا ہدف کو چیرتا پھاڑتا بندوق کی نال سے

نکلتی، گولی۔۔۔میٹھی باتیں، گیت، خط، فون ہجر فراق یادیں شعر غزلیں بے شمار رُومانی لمحات کی چاشنی تمام، کالعدم یکبارگی ملاپ اور پھر اپنے اپنے رستے، نہ لمبی پلاننگ نہ جذبات کا استحصال۔ ٹرین میں یونیورسٹی کے کئی لڑکے لڑکیاں سوار تھے۔ ہاتھ ایک دُوجے سے کھیلتے ہوئے۔ وقتی لمحاتی کھیل۔۔۔کوئی طویل المیعاد دُکھ نہیں، کوئی درد چھوڑتا معاہدہ نہیں، جو ناسور بن رستا رہے اور اس گند چھوڑتے مواد کو اُگلا بھی نہ جائے کہ جسم و جاں کا تار اسی نے تو جوڑ رکھا ہے۔

بازگشت گونجتی رہی ''تم میرا ساتھ دو گی نا۔''

تاج گرم آندھیوں میں کرچی کرچی اُڑتا بکھرتا رہا۔ دھڑ دھڑ ملبہ۔ اتنی اعلیٰ شان عمارت چٹکی میں دھڑام۔ منوں ٹنوں ملبہ، نیچے ممتاز محل کی قبر۔۔۔ اِس ملبے کو قبر پر سے ہٹانے کو صدیاں درکار تھیں۔ کیا معلوم قبر بچی ہو کہ۔۔۔ وہ ناکامی اور ہتک کے بستر میں دھنستی رہی، سوال ٹھہر گیا تھا۔

کاش کوئی تو ہو جس کندھے سے لگ کر وہ رو سکے۔ یورپ میں کوئی روتا تو نہ ہو گا کوئی پچھتاتا بھی نہ ہو گا۔ بس پچھلی حماقتوں پر قہقہہ لگا اگلی حماقتوں کی تاک میں چل پڑتا ہو گا، آخر کوئی کیوں روئے کسی اور کا دُکھ کیوں اوڑھے، کیوں پچھتائے کوئی حساب تھوڑی رکھتا ہے۔ کون کس کے لیے گنتی شمار کرتا ہے۔ یہاں مرادیں مانگنے کو جنڈ کہاں۔ پاک چشمے کہاں۔ بازگشت سے گونجتے نشیب کہاں۔۔۔ مل رونے کو جننیاں کہاں......

پچھلے فلیٹ سے غراہٹیں اُبھر رہی تھیں۔

''ایک مسلمان لڑکی، کافر لڑکا۔۔۔ یہ گناہ ہے زنا ہے۔''

ٹھٹھرا ہوا سوال کپکپا رہا تھا۔

''یہ فتویٰ دینے والے آپ کون ہوتے ہیں۔''

منجمد رستوں سے برف کے پہاڑ صاف کرتی کرینیں اِنتہائی خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھیں۔

''آزادیوں کو سلب کرنے کے اچھے طریقے گھڑ رکھے ہیں آپ لوگوں نے ...... مذہب، مشرق، معاشرت انھیں وہیں چھوڑ آیئے جہاں سے پکڑ کر لائے تھے۔ ان عجوبوں کے لیے تو

یہاں کوئی میوزیم بھی نہیں بنا ہے۔ یہ میری زندگی ہے میری اپنی چیز ہے، جیسے چاہوں اسے اِستعمال میں لاؤں۔ آپ سے درخواست نہیں کی تھی کہ مجھے یہاں لا کر پیدا کریں، کرلیا ہے تو آپ کی ملکیت کے حق کو میں رد کرتی ہوں۔ یہ یورپ ہے آپ مجھے میری مرضی کے خلاف کچھ بھی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ دست بردار ہو جائیں مجھ سے۔"

برف گرنے کی رفتار لگاتار ہو گئی تھی۔ اُس نے سوچا پہلے تو رک رک کر وقفے وقفے سے گرتی تھی اب کیا ہو گیا کہ بنا رکے ہی......وہ انتظار کر رہی تھی۔ باپ کے گرجنے کا تھپڑوں کی بارش کا اور بالوں سے گھسیٹتے ہوئے ماں کے چلانے کا ......کلموہی مردود کو پیدا ہوتے ہی گلا دبا کر مار ڈالنے کی حسرت کا، ٹانگیں توڑ کر زمین میں گاڑ دینے کا،لیکن خواہش صرف سسکیاں بھرتی رہی۔ لگتا تھا دونوں ماں باپ دست بردار ہونے کی بجائے منتیں واسطے ڈال ڈال تھک ہار شکست کے آنسو بہا رہے ہیں اور لڑکی تیز میوزک پر ڈانس کر رہی ہے۔ سارے میں بچھی سفید برف کی چادر پر بیٹھے بوڑھے بھوت زاروقطار رو رہے تھے جن کے بین تیز ہواؤں پر سوار بند کھڑکیوں پر دستکیں دے دے کر پلٹ رہے تھے۔

اُس نے سوچا اُس کی عمر تو چوے کے پاک پانیوں سے سیراب ہوئی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اُون سلائیوں سے گنجلک نمونے ڈالتے اور ہر ہر خانے میں وفا اور محبتوں کے تعویذ گوندھتے ہوئے وفا کی دیویوں کو دیکھتے گزری تھی۔ موم موم پگھلتے اور قطرہ قطرہ اُنھی ناموں کی آتش میں بھسم ہوتے ہوئے۔ یہ شکیلہ جان، فاطمہ جان، صنوبر جان، زرینہ جان اور یہ تاج محل اِس نام میں بھی کھوٹ تھا۔ ملاوٹ بھری تھی۔ خالص سونے میں اتنی بڑی ملاوٹ کیا دھوکا دہی کا مقدمہ نہیں بنتا۔ دوسری رات آ پہنچی تھی لیکن پلکیں پچھتاوے اور حیرت کی سولی سے ٹنگی جڑ ہی نہ سکی تھیں، جیسے تاج محل کے منوں ٹنوں بوجھ تلے بٹ بٹ کھلی رہ گئی تھیں۔ جب فون کی گھنٹی بجی تو ابھی وقت کی سولی پر آنکھ لگی ہی تھی۔ ان دیسی لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وطن اور ولائت کے وقت میں کتنا فرق ہے۔ ادھر دن ہے تو سمجھتے ہیں جیسے اُدھر بھی روزِ روشن طلوع ہوا ہوگا۔

وطن سے آنے والے فون ہمیشہ بے وقت ہی بجتے تھے۔ ابھی ٹرایئنکلائیزر نے اپنا اثر شروع کیا ہی تھا کہ فون بیل یوں چیخنے دھاڑنے لگی، جیسے اِس پر آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔

ریسیور تو اُس نے انتہائی غصے سے اُٹھایا تھا لیکن جو اِطلاع دی گئی اُس نے نیند اور غصہ دونوں اُچک لیے تھے۔

بھلا یوں بے آرام کرنے والی یہ بھی کوئی خبر تھی۔

''شکیلہ جان مرگئی۔''

اکبر خان کی منکوحہ جو کنواری ہی طلاق یافتہ ہوگئی تھی۔

جس کا کوئی دوسرا حوالہ تو کبھی بنا ہی نہ تھا، جو آتی جاتی ریل گاڑیوں کی سیٹیوں کا شمار کرتے کرتے خود ایک منحنی سی کوک میں تبدیل ہوگئی تھی۔ انتظار کی پٹڑیوں کی سنسناہٹ میں بجتے بجتے آخری سیٹی بے دم ہوگئی، جس میں سے یہ خبر نکلی تھی ''شکیلہ جان مرگئی۔'' جس روز غزل جان مہندی کی تقریب چھوڑ کر بھاگی تھی۔ اِس کے فرار کی واحد گواہ ہڈیوں کی مٹھ یہ شکیلہ جان ہی تھی۔

برآمدے کے ایک کونے میں کسی بچے کی پلنگیری میں پڑی ہوئی شادی بھرے گھر میں وہ کسے یاد رہ سکتی تھی۔ پرانی پلنگیری جس کے سارے چوکھاٹ ٹوٹ چکے تھے۔ بان جھلنگا بن کر اُلجھ گیا تھا جو فرش پر جھولتا تھا۔ اسی جھولے میں مٹھی بھر شکیلہ جان کہیں ڈھونڈے سے مِل ہی جاتی تھی، سنا تھا وہ قد آور اور حسین تھی، سنا تھا وہ کبھی زندہ اور بھرپور تھی، سنا تھا اُس کی کمر میں سانپ بل کھاتے اور کڑیالے قدموں میں لوٹتے تھے، سنا تھا پھلاہی کے رَتھ اُس کی بال گھٹاؤں پر بچھے تھے، سنا تھا اُس کی آنکھوں کے دیپ انتظار کی واٹ بھڑکاتے چکاچوند مچاتے تھے۔ جو اِک روز بجھ گئے، جب غزل جان نے مڑ کر دیکھا تھا کہ کوئی اس واردات کا گواہ تو نہیں چھوڑے جا رہی تو اُس وقت مسواک سی کلائی پر جھولتا خشک پتہ سا ہاتھ ہلا تھا۔ اُسے حیرت ہوئی تھی وقت کے سنگین پہاڑ تلے صدیوں سے، دبا فالج زدہ ہاتھ جھلنگا کھٹولی میں سے اُٹھا اور اُسے رُخصت کیا تھا۔ حوصلہ دیا تھا وہی حوصلہ جو بے اَنت انتظار میں، ریل گاڑی کی پٹڑیوں کی سنسناہٹ میں عمروں کچلا جاتا رہا تھا۔

نحیف نومولودسی جھریوں زدہ جلد، اُونچی بتیسی پر کھنچ گئی تھی جیسے خوش ہو کہ کسی نے تو بے اَنت انتظار کا سنگین حصار توڑنے کی جرأت کی اور حیران بھی کہ یہ آہنی جنگلہ کیا محض تارِ عنکبوت تھا۔ وہی شکیلہ جان آج مر گئی۔

شکیلہ جان کبھی زندہ بھی تھی کیا۔ اکبر خان کے نام پر دھڑکتی بے نام دھڑکن کا کوئی نام بھی بچا تھا کیا۔

''اکبر خاناں اکبر خاناں'' کی تسبیح پھرولتی پور پور اعصابی تناؤ میں ٹوٹتی بکھرتی۔

چھپ چھپ چٹے پڑ پڑ آنسو بہاتی کہ تقاطر سے سفید سنگِ مرمر کی چٹان میں سیاہ گڑھے بن گئے۔ چوے والی جنڈ پر منتوں کے اتنے دھاگے باندھے کہ پراندہ اُلجھ کر گچھا ہو گیا۔ چوے کے پاک پانیوں میں کسی کا عکس دیکھتے دیکھتے خود مورت سی وہیں ٹھہر گئی۔ وہی عکس جو اُس کی پہنچ کی حدود میں کبھی تھا ہی نا۔ اُسی حصار کو تانے ریشم کے خواب بنتے بنتے خود وجود پر لپیٹتے لپیٹتے آخر دم گھونٹ گئی۔ وہی شکیلہ جان آج جسمانی طور پر بھی مر گئی۔ جب چوے کا پانی باہر سپلائی ہونے لگا، تو پانی کی سطح پر چھپی اُس کی من مورت بھی بگڑنے لگی۔ وہ اپنے ہی وجود میں اُترنے لگی۔ اُٹھے تو بالشت بیٹھے تو مٹھی......مرضوں میں پروئی چھلاسی، چار پائی کی وسعتوں میں گواچ گئی۔ چمچ بھر کھلانے اور گھونٹ بھر پلانے کے لیے اُسے ڈھونڈنے کی تگ و دو کرنا پڑتی۔ تب کسی نے اس مسئلے کا حل سوچا اور اُسے اُٹھا کر کسی بچے کی پلنگیری میں ڈال دیا۔ پلنگیری کے نواڑ ٹوٹنے لگے۔ جھلنگا زمین کو چھونے لگا۔ وہ مٹھی بھر وجود اُٹھنے بیٹھنے کھانے پینے سے لاچار مگر سماعت اور زبان دونوں زندہ۔ گزرتی ریل گاڑیوں کی سنسناہٹ، سماعتوں میں کھلتی آنکھوں میں بھری راکھ میں کوئی بھولی بسری چنگاری، ستارہ سا جل بجھتی اور نام کی مالا کے موتی اپنے ہی گلے میں بکھر جاتے۔

''اکبر خاناں اکبر خاناں۔''

وہی شکیلہ جان آج مر گئی۔ تسبیح کے موتی بکھر گئے۔

یہ اِطلاع اُسے آگے کہیں بھی نہ بڑھانا تھی۔ ٹوٹے ہوئے موتیوں کے بھر بھرے چورے

سے حلق سنٹھ ہو گیا۔ دم گھونٹنے والے اس نوالے کو سینے میں، معدے میں، دھکیلنے کے لیے اُسے پانی کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ اگر یہ اِطلاع وہ اپنی ذات کے اندر ہی مقید رکھتی تو اس سنگینی کی سولی اُس کی چھوٹی سی گردن کو تین گنا دراز کھینچ ڈالتی۔ اتنی لمبی گردن میں سے گزرنے کے لیے اُس کے پاس پانی اور ہوا کہاں۔ باہر تمام ٹنڈ منڈ درخت برف کی قاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ اتنے ہی منجمد جتنی خود غزل جان۔ اس اِطلاع کے قاتل لمحے کو اُسے کہیں آگے بڑھانا تھا ورنہ دم گھونٹ...... سو اُس نے ٹریولنگ ایجنسیز کو فون کرنے شروع کر دیئے۔ کہیں سے تو ایسا ٹکٹ دستیاب ہوسکتا تھا کہ وہ ابھی اسی وقت بیگ اُٹھا کر باہر نکل جائے اور چانس کے انتظار میں ایئرپورٹ کی بھیڑ بھاڑ میں خود کو گم کر دے۔ اَن گنت بجتی ہوئی پٹڑیوں کی سنسناہٹ اور شور کی اُنگلیاں کانوں میں ٹھونس کر انتظار کرتی رہے۔ اگرچہ وہ اگلی صبح ہی پنڈی ایئرپورٹ پر لینڈ کر گئی تھی لیکن اب پوٹھوار میں دو تین مہینے مسلسل ماتم نبھانے کی روایت بھی شکیلہ جان کی باری آتے آتے اُسی کی طرح سکڑ سمٹ گئی تھی۔ وہ ہڈیوں کی مٹھ زمین پر رہتی کہ زیرِ زمین اُس کا مردہ خراب تھوڑی ہونا تھا۔ لیکن ماتم نبھانے ایک دوسری کے گلے لگ لگ لمبے لمبے بین ڈالنے، قل، سوئم، نواں، دسواں، پانچ جمعراتیں، چہلم اور پھر عمر بھر ہر جمعرات پر ختم دلانے کا وقت اور جذباتی لگاؤ بھی شاید ڈالروں میں ہی کہیں سکڑ ٹھٹھر دب گیا تھا۔

پھوڑی اُٹھ چکی تھی۔ عورتیں چارپائیوں اور کرسیوں پر بیٹھی ٹولیوں میں بٹی اپنی اپنی باتوں میں مصروف تھیں، جو شکیلہ جان کی موت سے کہیں اہم اور ضروری تھیں۔ ماتم کی یگانگت اور ارتکاز ولائت کی دولت یا نئی تعلیم کی فراوانی یا پھر نئی زندگی کی مصروفیت یا پتہ نہیں کچھ اور کسی نے تو نگل لیا تھا۔

وہ شکیلہ جان کا ماتم روائتی انداز میں کرنا چاہتی تھی۔ اُس نے پھوڑی بچھوائی اور ہر ہر عورت کے گلے لگ لگ روئی۔ سینے کی وہ گرمی اور بینوں کی وہ رِقت جو اباً سرد ہو چکی تھی لیکن وہ خود یکدم ایسے کرب ناک بین کرنے سیکھ گئی کہ سبھی کو دل سے، جگر سے خون رُلا کے چھوڑا۔

شکیلہ جان کم از کم اِس ماتم کا اِستحقاق تو ضرور رکھتی تھی۔ دوپہر کے کھانے کا وقت آ پہنچا تھا

تبھی اُس کی نگاہ عثمان خان پر پڑی جو عورتوں کے سامنے زردے پلاؤ کی پلیٹیں رکھتے ہوئے اُس سے یوں جھینپ رہا تھا، جیسے اُس کے نکاح سے وہ اُٹھ کر نہ بھاگی ہو بلکہ اِس وقوعہ کی وجوہات کا وہ خود ذمہ دار ٹھہرا ہو۔

غزل جان کو تاج محل کی دھرتی کا باسی یاد آیا۔ ذِلت اور شرمندگی کے احساس نے شکیلہ جان کے ماتم میں جیسے آگ لگا دی تھی۔

کیا تاج محل کی محبتوں کا چلن اِس نشیب تک سفر کر چکا کہ محبت کے تمام مراحل تمام درمیانی کڑیاں تہس نہس کرتے ہوئے صرف آخری منزل کو روند دیا جائے اور وہ بھی انسانی قدموں سے نہیں ہاتھیوں کے پاؤں سے۔۔۔اور ایک یہ عثمان خان۔۔۔شکیلہ جان کے ماتم پٹتے سینے سے عجب ڈاہ نکلی۔

''تاج۔۔۔تاج محل۔''

باری باری سبھی عورتوں کے سامنے کھانے کی پلیٹ رکھتے ہوئے وہ اُس کے سامنے بھی جھکا تھا۔شرمندہ اور احساسِ جرم سے مفتوح، جیسے کہتا ہو تمہارے برابر تعلیم حاصل نہ کر سکنے کا مجھے افسوس ہے۔

ولائت کی کسی یونیورسٹی میں پڑھنے والی برٹش نیشنل لڑکی کا عجب دبدبہ تھا کہ اُس کی فردِ جرم بھی دوسرے ہی اپنے گلے میں لٹکا رہے تھے۔

لڑکیاں اُسے حسرت سے دیکھتیں اور اُس ارضی جنت کے قصے سننا چاہتیں لیکن اُس کی یادداشتیں تو اُس فلیٹ کی دہلیز پر دھری رہ گئی تھیں۔ جہاں داخل ہونے کے لیے بے لباس ہونا شرط تھا، جہاں تاج محل کی سرزمین کا باسی داخل ہو چکا تھا اور اُسے ازلی محبتوں کی تکمیل کے لیے داخل ہونے کی ترغیب دے رہا تھا۔ وہ بھاگ نکلی تھی لیکن احتراموں اور حدود میں لگی روائتی محبتوں کو شاید سرزمینِ دل سے بھی دیس نکالا مل چکا تھا۔ یہ کیسا تاج واسی تھا کہ دل بعد میں جاگتا، جسم پہلے بیدار ہو جاتا۔ شاید جسم کی تسکین کے پیمانوں پر ہی دل خود کو ملوث کرنا سیکھا تھا، جہاں جسم تسکین

سے مطمئن نہ ہوسکتا، وہاں دل کا دروازہ بھی بند ہو جاتا تھا۔

وہ اُنھیں کیا بتاتی کہ وہ یہاں سے بھی بچ کر بھاگی اور وہاں سے بھی بچ کر بھاگ نکلی۔

اس گراں میں عجب تبدیلی آئی تھی کہ ان پڑھ لڑکیوں سے پلو چھڑا بھاگ نکلنے والے لڑکے اب خود ان پڑھ رہنے لگے۔

لڑکیاں ایم۔اے، ایم۔بی۔اے اور لاء جیسی بھاری بھرکم ڈگریاں حاصل کر چکی تھیں، لیکن لڑکے ولائت کی کمائیوں پر اِتراتے، امپورٹڈ گاڑیاں بھگاتے، اِسلام آباد میں تعمیر شدہ بنگلوں کا کرایہ ایمبیسیوں سے ڈالروں میں وصول کرتے اور باقی ہر علم میں چاہے پچھڑ گئے ہوں لیکن پیسہ اور بینک کے معاملات کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ دامنِ کوہ اور شکر پڑیاں جیسی نئی تفریح گاہوں میں گھومتے۔ کڑاہی گوشت اور چرغے اُڑاتے، امپورٹڈ جینز پہنتے، پائینچے موٹے جوگر کے تلووں تلے گھسیٹتے، برگر کھاتے اور ملک شیک پیتے۔ یہ مُلک پکوانوں کی ورائٹی میں کتنی ترقی کر گیا تھا۔ انڈین، عریبین، ترکش، اٹالین اور چائنیز فوڈ کی چینز دیسی ذائقے متروک کر گئی تھی، زندگی تیز ہوئی کہ نا البتہ فاسٹ فوڈز ضرور پسندیدہ ہو گئے۔

جین جیسی بڑی ایجاد بھی پہلی بار انھی ولائتیوں نے اِس علاقے میں متعارف کروائی تھی۔ جس طرح رنگین ٹیلی ویژن، فریج، کوکنگ رینج، ڈش انٹینا، اِسی طرح جین۔ باسہولت پائیدار اور فیشن ایبل لباس وبا کی طرح یہاں پھیل نکلا تھا۔ ان یورپی تراش خراش والے لڑکوں کے ساتھ شادی سے اِنکار کا حوصلہ بھی شاید اِن پڑھی لکھی لڑکیوں کو جدید لباسوں اور پکوانوں کی ایجادوں سے مِلا تھا کہ ملبوسات اور پکوانوں کے تبدیل ہوتے انداز، رویوں کے طور بھی بدل دیا کرتے ہیں۔ یہ لڑکے جو مہنگے ہیئر سیلون سے لمبی قلموں والے بال بنواتے، امپورٹڈ گھڑیاں اور عینکیں لگاتے، بڑی بڑی چمچماتی گاڑیوں پر سوار ہوتے تو ان کے چہروں سے امارت کا زائیدہ رُعب اور خود اعتمادی چھلکتی۔ لیکن جب بولتے تو اس سارے ظاہری ٹیپ ٹاپ کو جیسے کسوں سے گونجتی غول بیابانی کی وحشت میں اُتار دیتے۔ جہالت ان ماڈرن لباسوں، مہنگی گاڑیوں اور بھری جیبوں سے اُمڈ اُمڈ کر سننے

والوں کوششدر کر دیتی۔ ماڈرن اِزم میں گچا گچ جہالت۔۔۔ایسی تو قراقلی اور اچکن پہننے والوں پر بھی کبھی پسماندہ ادوار میں بھی یہاں نہ اُتری تھی۔ کیا ولائت کی کمائی نے دوغلی اور منافقانہ شخصیتیں ساخت کی تھیں۔

منافقت کے پانیوں سے ان کرداروں کو سینچ دیا تھا، جو گندم، مکئی اور مونگ پھلی کے کھیتوں میں بیل کے مرجانے کی صورت میں خود ہل میں جت جاتے تھے اور شہادت کی طلب میں یہ پہاڑیئے فوج کی رجمنٹیں بھر دیتے تھے۔ دیودار جیسی سیدھی اور بے لچک شخصیتوں میں منافقت کے خمیر کا ابھارہ پھڑ پھڑانے لگا، اِدھر بھی اور اُدھر بھی......ولائت کی کمائی بھیجنے والے فرنس آئل بچانے کی تگ و دو میں ایک ہی کمرے کے طویلے میں جانوروں کی طرح برفیلی راتوں میں منجمد ہونے والے عمر بھر سنتے لیکن شاید یہ انگریزی بھی سؤر کی حرام چربی میں ڈھلی تھی کہ بول نہ پاتے۔ شاید وہ سیکھنے کے عمل والے دور سے گزر چکے تھے، لیکن یہاں یہ دیہاتی لڑکیاں فر فر انگریزی بولتیں۔

برگر اور چائنیز کھاتیں روائتی کھانوں اور زبان کا مذاق اُڑاتیں۔ وہاں تیسرے درجے کے شہری مشقت کی سولی پر ٹنگے پینی پینی جوڑتے اور یہاں اُن کے خاندان، معاشرے میں عجب مقام اور عزت پاتے، ولائتیے اور انگلینڈیے کہلاتے اور ان ناموں کے تفاخر میں اِتراتے۔ جیسے کبھی سر کا خطاب پا کر گھرانے باعزت ہو جایا کرتے تھے، جیسے اس گراں میں شہیدوں کے وارث جن کی چھوڑی ہوئی بندوقوں اور ٹوپیوں کو گھرانے کا اعزاز سمجھ کر دیواروں پر سجاوٹوں، تمغوں اور تصویروں کی طرح آراستہ کیا جاتا تھا۔ جو نوجوانوں کے اندر جذبۂ شہادت کو برانگیخت کرتے تھے، لیکن اب یہ تحریکات زنگ آلود ہو چکی تھیں۔ صرف ولائت کی کمائیاں ہی تحرک پیدا کر سکتی تھیں۔ اب اس آرمی بریڈر ایریا سے جینز پہننے اور انگریزی الفاظ کو پوٹھواری لہجے میں غلط سلط ادائیگی کرنے والے ویزوں کے فراق میں جیتے تھے۔ اِس گراں میں پہلی بار یہ حادثہ رُونما ہوا تھا کہ عمریں بڑھنے لگی تھیں اور ہم کفو گھٹنے لگے تھے۔

بر نہ ملنے کا نظریہ بھی پہلی بار اِس گراں میں متعارف ہوا تھا، ورنہ یہاں کی قدیمی ریت کے مطابق ہر پیدا ہونے والی لڑکی لڑکے کا آنول ناڑ کاٹنے کے ساتھ ہی ازدواج طے ہو جاتا تھا۔ یہ بھی پہلی بار وقوعہ ہوا تھا کہ لڑکے بڑھکرا کر بھاگ نہ رہے تھے بلکہ لڑکیاں اُنھیں رد کر چلی تھیں۔ اِس گراں کی صدیوں پرانی اُونگھتی ہوئی ثقافت میں عجب نقب لگی تھی۔ لڑکیاں اتنی ترقی کر گئیں کہ خود اپنی رائے اور فیصلے اُستوار کرنے لگیں لیکن ہوا کیا کہ اِس خود اعتمادی اور خود مختاری میں من کا تاج محل سنسان رہ گیا۔ وہ مخلوط اِداروں میں نئی تعلیم حاصل کر رہی تھیں لیکن رسم و راہ عجب چلی تھی کہ اقرارِ محبت تو کیا جاتا۔ مرنے جینے کی قسمیں بھی کھائی جاتیں چوری چوری محبت نامے بھی لکھے جاتے، فون کالز بھی ہوتیں دو سال آہیں بھری جاتیں۔ عشق و حسن کی تعریف میں غزلیں لکھی جاتیں، کتابوں میں پھول رکھ کر اور احمد فراز کے شعر لکھ کر تبادلے بھی کیے جاتے۔ لیکن یونیورسٹی سے نکلتے ہی ساون کے ابرو باراں سے بھرا سارا مطلع صاف ہو جاتا جیسے کبھی دل کا آسمان کہاسے، سے کبھی ڈھکا ہی نہ تھا۔ طویل رستوں کے داعی ہم سفر ابتدائی منزل میں ہی کہیں بچھڑ جاتے۔ سست رفتار یا تیز رفتار اتنے کہ نگاہوں سے ہی اوجھل ہو جاتے۔

لڑکیاں بے وفائی کے زخم چاٹتی رہتیں اور لڑکے اپنی خالہ زاد چچا زاد کے شوہر کا کردار بخوبی نبھانے لگتے۔ اطاعت شعاری کی حد کر دیتے کہ دل کے آسمان پر چھائے بادلوں کا سراغ وہ کبھی لگا ہی نہ پاتیں۔

یہ گراں جس کی مٹی محض ٹھیکرے کی مانگ کی وفا شعاری میں گندھی تھی۔ اب اپنی تاثیر بدل رہی تھی اگرچہ اب چواپاک کے پانیوں سے سیراب اور منتوں والی جنڈ کی مُرادیں برلانے والے سب مزار بک گئے تھے اور جدید اور مہنگے ریستوران میں تبدیل ہو گئے تھے، چاہے یہ مٹی صدیوں پرانی تاثیر چھوڑ رہی ہو لیکن اس کی زائیدگان یہ لڑکیاں وقت گزاری والی دوستیوں اور فلرٹ کا حصہ نہ بن سکتی تھیں کہ وہ اِس چواپاک سے سیرابی کا شرف تو بہرحال رکھتی تھیں۔ جو دسترس میں تھا وہ معیار سے اُتر چکا تھا جو معیار کی سطح پر تھا وہ دسترس سے نکل گیا تھا۔ اب ریل کی بجتی

پٹڑیوں کی سنسناہٹ دھڑکنیں تیز کرنے کا جواز کھو چکی تھی۔ کسی نام کی تسبیح جپنے کی رُوحانی مصروفیت چھن چکی تھی۔ دُور دیس سے مسافروں کو واپس لانے والے جہازوں کی گنتی میں ٹنگی آنکھیں کسی تلاش سے خالی تھیں۔ تلاش کا تمام ہو جانا کتنی طمانیت! تو پھر یہ کیا کہ مہنگے بوتیکس کے ماڈرن ڈریسز اور پارلرز کے میک اَپ، چواپاک کے گرد پھیلے ریستورانوں کے برگر اور سینڈوچ فرسٹریشن اور انگزائٹی کو بڑھا کیوں رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتیں اور سکون آور ادویات کی عادی ہو جاتیں وہ پڑھ لکھ کر نوکریاں حاصل کر کے خودمختار زندگیاں گزارتے ہوئے کیا اپنی پہلی نسل سے زیادہ بےسکون اور قلاش ہو گئی تھیں۔ وہ نسل جس کو بےکار، فضول، بے فائدہ بہرحال مصروفیت ضرور حاصل تھی۔ انتظار کی مصروفیت، دھڑکنوں کے شمار کی مصروفیت تسبیح پھرولنے کی مصروفیت اُون سلائیوں میں نام گوندھنے کی مصروفیت، وہ صنوبر جان کو بتانا چاہتی تھی کہ وہی یہاں اس مصروفیت میں مبتلا نہ تھی۔ اُسے اکلاپے کے جہنم میں جھونک کر اُڑ جانے والا خود بھی اتنا ہی اکیلا اور تنہا تھا۔

خزان سنگھ کی بیٹی شراکت دار تو ضرور تھی لیکن فرنس آئل بچانے میں، دُکان کا منافع بڑھانے میں، مزدوری بٹانے میں، خوش ذائقہ مٹھائیاں بنانے میں۔ اگر غزل جان خود گواہیوں کا سراغ نہ پالیتی تو وہ بھی اپنی ماں کی طرح کبھی اِس حقیقت کو نہ مانتی کہ اصغر خان پچھلی دو دہائیوں سے زائد عرصہ محض ڈالر بنانے والی مشین کا کردار ادا کرتا رہا ہے۔ لمبی سخت ڈبل روٹی نگلتا کابک میں سوتا۔ ہفتہ وار دو چھٹیوں میں، اوور ٹائم میں ہوٹلوں کے فرش اور پلیٹیں چمکانے سے جوڑ ڈالر وصول ہوئے اُنہی سے اِسلام آباد کی وہ کوٹھیاں تعمیر ہوئی تھیں جو اب یورپی ایمبیسیوں سے ڈالر کما رہی تھیں اور جو ٹیکسیاں ڈرائیو کی تھیں اِس محنت نے گراں میں نئی تعمیر شدہ کوٹھی کے پورچ میں ہنڈا اکارڈ اور ٹیوٹا کرولا کھڑی کر دی تھیں۔

وہ اپنی ماں کو کیسے سمجھاتی کہ خزان سنگھ کی بیٹی مٹھائیاں بنانے کی ماہر تھی لیکن دیسی گھی شکر میں کبھی ملاوٹ نہ کرتی۔ جس طرح اُس کا باپ کبھی ناپ تول میں ڈنڈی نہ مارتا تھا۔ صنوبر جان

کے لیے یہ ناپ تول سمجھنا مشکل تھا۔ ایسے حسابات تو دِلوں کے احراموں میں تبادلہ کیے جاتے ہیں۔ اِس ریاضی کو کسی اتالیق سے نہیں سیکھا جاتا۔ من مندر کے جوتشی خود ہی حساب لگالیا کرتے ہیں، لیکن یہاں سارا حساب اُلٹ پلٹ ہو گیا تھا۔

اگر وہ صنوبر جان سے غصے اور محرومیوں کے شمار کی یہ مصروفیت بھی چھین لے تو اس کھوکھلے تنے کو بے مقصدیت کا دیمک دِنوں میں چاٹ جائے گا۔ بے مقصد مقصدیت بھی کتنی ضروری تھی ان کاٹھ کباڑ عورتوں کے لیے...... جو یادوں کے انبار خانے کی گھٹن، تاریکی، سیلن اور حبس کی عادی ہو چکی تھیں۔ ٹوٹی ہوئی چوکھاٹوں نواروں والے پرانے پلنگ، کنڈے ڈھکنے اُترے صندوق، روئی اُگلتے بوسیدہ لحاف، سرہانے، سوکھے مڑے تڑے چپل زنگ لگی چوٹیں کھائی پتیلیاں رکابیاں۔۔۔ کتنے کاٹھ کباڑ کا شمار ہمہ وقتی مصروفیت۔ وہ اپنی ماں کو کیونکر بے کاری کے جہنم میں دھکیل کر اُس کی عمر بھر کی ریاضت، فلسفۂ حیات، تحرک وتوانائیوں کا سرچشمہ بند کر دیتی۔ حاصل محصول نتائج کو غلط قرار دے دیتی تو کیا وہ مر نہ جاتی، جس کے اندر زندہ رہنے کے لیے یہی غلط فہمیاں اور بے مصرف مصروفیتیں توانائی بھر رہی تھیں۔ شکیلہ جان کی قبر کے سرہانے چیڑ کا چھوٹا سا پودا تن کر کھڑا تھا۔ پتہ نہیں اِس کا بیج یہاں کیسے اُڑ کر پہنچا۔ دیودار تو اُوپر بلندیوں پر ہوا کرتے ہیں ان کوتاہ قد پہاڑی سلسلوں میں تو جنڈ ہکائن، جنگلی کیکر خمیدہ شیشم، چھتنارے بڑ، جن کی لمبی شاخوں تلے پہنچے ہوئے بزرگوں کی قبریں پھیلی ہوتیں۔ پتہ نہیں پوٹھوار کی مٹی اِرادت وعقیدت کے اندھے جذبوں کے پاک پانیوں سے کیوں گندھی تھی۔ ہر پہاڑی کی چوٹی پر ہر برگد کی گھنی چھاؤں تلے ایک مزار موجود تھا جس پر چڑھاوے چڑھانے اور منتیں ماننے والے کبھی کم نہ ہوتے تھے۔ قبروں کے آثار نہ بھی موجود ہوں تو بھی چوٹیوں اور برگد کے پیڑوں کو اِرادت کے واہمے تقدس کی چادریں چڑھاتے رہتے تھے۔ کس قدر دخیل تھے یہاں کی زندگیوں میں یہ مزار اور قبرستان، مرادوں، خواہشوں اور حسرتوں کے سرچشمے پیر فقیر جو مر کر بھی زندوں کے بیچ سدا جیتے رہتے۔ جنات کی بستی جو نشیب میں صدیوں سے آباد تھی۔ اُن کے عقائد بھی اس انسانی بستی سے مستعار تھے۔ وہ بھی انھی مزاروں اور

قبروں پر حاضری دیتے۔ کئی پگڈنڈیوں پر اُن کے چھوٹے چھوٹے نقش پا ثبت ہوتے۔ رات ڈھائی بجے جب کراچی سے آنے والی تیز گام یہاں سے گزرتی تو کئی جناتی مسافر اُس پر سے اُترتے تھے۔ اُن کے انتظار میں سلگتی جنیاں ان پگڈنڈیوں پر گھومر ڈالتیں اور خوشی کے گیت گاتی تھیں۔ گیتوں کی آوازیں پہاڑوں کے سینوں میں بجتی رہتیں، لیکن یہ تو اُن دِنوں کی یادگاریں ہیں جب ولائت کی کمائیاں اور ویزے یہاں متعارف نہ ہوئے تھے۔ قبریں کچی تھیں لیکن اُن پر رونے والے بہت تھے۔ سنگِ مرمر کے کتبے تو نہ لگے تھے لیکن پانی چھڑکنے، روڑ ڈالنے اور فاتحہ پڑھنے والوں سے قبرستان آبادی سے بڑھ بارونق رہتے تھے۔ اب یہاں فاتحہ خوانی کے لیے سات سمندر پار سے کس نے آنا تھا، جن کی کمائیوں سے قبرستان سجے تھے۔ کس کی قبر کا کتبہ زیادہ اُونچا اور زیادہ درد یلے شعروں سے مزین ہوگا۔ یہ فیصلہ کمائیوں کے اعداد وشمار کو متعین کرتا تھا۔

قبرستان کے ہموار قطعہ اراضی سے گزرتا ہوا پیدل رستہ پہاڑی پگڈنڈی کو مرکزی سڑک تک پہنچاتا تھا۔ اُسی پگڈنڈی پر عثمان خان کندھے سے بیگ لٹکائے چلا آتا تھا اور اب اُسے قبرستان کو عبور کرنا تھا کہ اچانک وہ یوں واپس پلٹا جیسے سامنے سے جنگلی بلی نے جھپٹا مار کر آنکھیں نوچ لی ہوں، اور وہ بلبلاتا تڑپتا نشیب میں چھلانگ لگا گیا ہو پتہ نہیں بچا بھی کہ نا۔

غزل جان کو منہ بھر کر ہنسی آئی اور پھر جی بھر کر رونا آیا۔ تاج محل کی دھرتی کے مغالطے میں گندھا محبت کا وہ پہلا تجربہ جب وہ تاج کے رُعب میں اُس بے نام اجنبی کے ہمراہ چل پڑی تھی۔ اُس مکان کی سمت جہاں داخل ہونے کی پہلی شرط برہنگی تھی۔ پہاڑی سلسلے کو پنجرا ایکسپریس لرزاتی ہوئی گزر گئی۔ یہ اِس ریل گاڑی سے اُترا ہوگا جس کے انتظار میں کوئی لمحوں کا شمار نہ کر رہا تھا، لیکن گاڑی اِس قصباتی ریلوے اسٹیشن پر رُکی تھی اور مسافر اُترا بھی تھا۔ کون بے چین تھا اسے دیکھنے کے لیے یونہی بن بلائے ہی اُتر آیا۔ گاڑی وسلیں بجاتی چوٹیوں پر دھوئیں بکھیرتی اور پٹڑیوں کا سینہ دھنکاتی گزر گئی تھی۔ جب یہاں انتظار کے دیپ ہر ہر پتھر کے دِیے میں جلتے تھے تب تو یہ کبھی نہ رکتی تھی، کوئی نہ اُترتا تھا۔ شکیلہ جان شاید اب بھی قبر کی تاریکیوں میں اُن گاڑیوں کی وِسلوں کا شمار

کرتی ہوگی، بیچاری مر کر بھی ان وِسلوں، دھوؤں اور لرزتی پٹڑیوں سے کہیں دُور دفنائی نہ جاسکی یہ انتظار صرف یہاں کی عورتوں کا مقدر ہی کیوں ٹھہرا۔ کبھی ایسا بھی تو ہو کہ کوئی عورت کسی مرد سے نکاح کرے اور پھر کہیں دُور دیس چلی جائے۔ مرد سہاگ کی دو چار راتوں کی شیرینی کو بے انت انتظار کے زہر میں گھولتا رہے، جہازوں کو آسمانوں کی وسعتوں میں تلاش کرتا رہے اور پھر گھل گھل کر مر جائے، لیکن اپنے اکلوتے بچے کی شکل کبھی نہ دیکھ سکے۔ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے سب اُلٹ پھیر ہے۔

عجب خیال آیا تھا غزل جان کو کہ رات کے پھیلتے اندھیروں کے ہمراہ یہ خبر بھی فضاؤں پر چھا گئی۔ پہاڑی بارش کی طرح چوٹیوں، کھائیوں پر برس گئی۔ دھواں چھوڑتی پٹڑیاں جھنجھنا اُٹھیں۔ غزل جان عثمان خان سے شادی کرنے کو تیار ہوگئی تھی۔ اب پوٹھوار کی رسمِ ماتم نے روتے بین ڈالتے منہ سر اور رانیں کوٹتے پیٹتے آخر دم توڑ دیا تھا۔ شکیلہ جان کی پھوڑی سمیٹ لی گئی اِس خاندان کی یہ پہلی شادی تھی جو شکیلہ جان کے چہلم سے پہلے ہی طے پا گئی تھی۔

اُس سے پہلے کہ غزل جان کا فیصلہ کسی اور چانک پنے کا شکار ہو کر تبدیل ہو جائے۔ شادی کی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ حالانکہ اس گراں کی ریت کے مطابق تو جس سال یہاں کوئی موت واقع ہو جاتی اُس سال شادی کی شہنائیاں یہاں کبھی نہ بجتی تھیں۔ پورے سال کے صبر اور انتظار کا بھاری پاٹ کنواریوں کے سینے پر دھر دیا جاتا تھا۔ ماتم چاہے روائتی نہ رہے ہوں لیکن شادیوں میں تو روائتی خرچوں پر کہیں غیر روائتی اضافہ ہو گیا تھا۔ مایوں کی رسم پر بٹنے والی میٹھی ٹکیاں کیک مٹھائیوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ اگلی کوٹھری میں فرش پر سونے والی دُلہن فوم کے گدے پر اب آرام کرتی تھی۔ مہندی لگانے اور دُلہن بنانے کو نائین کی جگہ بیوٹیشن سے بکنگ کروائی گئی تھی۔ صرف دُلہن کے لیے ہی نہیں ساتوں سہیلیوں کے لیے بھی دلہن جیسی تیاری تھی۔ بوتیکس کے مہنگے ڈریسرز میں سے اِس برٹش نیشنل کے لیے عروسی ملبوسات منتخب ہو رہے تھے۔

وہ تلا لچکا، گوٹا کناری نلکیاں، موتی ستارے جنھیں شادی کے جوڑے پر ٹانکتے ٹانکتے خود دُلہن

اور ساتوں سہیلیوں کی پوریں نا کہ سوزن ہو جاتیں اب کسی پور پر کوئی سوئی نہ چبھی تھی ۔عروسی ملبوس کی مینا کاری میں جتنی پوریں چھدتیں، جتنا پسینہ گرتا اُتنی ہی وفا بھی گاڑھی ہو کر اس لباس کے تار و پود میں اُس ایک نام کے موتی کو پرو دیتی ۔جس کی چھاپ اُنگلی میں پڑی ہوتی تھی پر یہ کیسی شادی تھی کہ چھاپ پہنانے کا وقت ہی نہ مِلا تھا۔ یہ کیسا عروسی جوڑا تھا جس پر محنت تو بہت کی گئی لیکن معاوضے کے عوض، محبت کی سوزن سے اِس پر ایک ٹانکا بھی نہ لگا تھا۔

غزل جان نے تو یونہی رسماً دعوت دی تھی لیکن جسبیر کور تو اِس شادی میں شرکت کے لیے جیسے مُدّتوں سے انتظار میں بیٹھی ہی تھی ۔خزان سنگھ کی بیٹی کو سب ذرا ذرا یاد تھا۔ پتھروں سے اُسارا مکان، رتھ میں بہتی جھیل، شفایاب پانیوں سے چھلکتا چوا اور مرادوں کے جھنڈوں سے بھرا جنڈ کا درخت۔۔۔ایک ایک تفصیل اِس کے ہمراہ ہجرت کر کے اُس کے دماغ میں اپنا اپنا گھر بنا چکی تھی۔ بھاپا جی نے پوٹھوار کی گرمی اور پاکستان کے تلخ حالات کا نقشہ اگرچہ پوری سنگینی سے کھینچا تھا لیکن غزل جان کی شادی کے لیے تو وہ سیوواں نالے کی طغیانی سے بھی۔۔۔ تیر کر گزر سکتی تھی ۔یہ گراں جہاں اُس کے بچپن کے چند اِبتدائی سال اِس سے بچھڑ گئے تھے،کبھی گھنے رتھ میں کیسکلی ڈالتے نشیبوں میں، خود رو کھکھڑیاں اور ہندوانے پتھر مار توڑتے،کبھی پتھروں چٹانوں سے اُترتی آبشاروں میں چھینٹے اُڑا اُڑا کر نہاتے ۔ جہاں چٹان کی اوٹ سے بازگشت پہاڑوں کے سینوں میں گونج جاتی، ”چیلا کری کنو“ (دوپٹہ اوڑھ لو) تن کے کپڑے دھوتی عورتیں خود کو چادروں میں چھپا لیتیں۔جانور ڈھلانی جھیل کے پانیوں کو مزید کم کر دیتے۔چھی او چھی۔۔۔اُس گراں میں بچھڑ گیا ایک ایک دن اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ دل کے مکان میں شاد و آباد تھا۔

جب اس سکھنی کا صنوبر جان سے ٹکراؤ ہو گا۔مٹھائیوں کے شیرے سے سینچی ہوئی گھی مکھن سے گندھی ہوئی، تر و تازہ آدھی صدی سے زائد برس کی یہ بوڑھیا جس پر یورپ کا رنگ و رُوپ اور صحت و جوانی ٹوٹ کر چھائی تھی ۔لیکن یہ بات صنوبر جان کیونکر مانتی وہ تو اِس سب کا سراغ اپنی چرائی ہوئی اشیاء سے ہی لگائے گی نا یہ عجب حادثہ ہو گا ۔وہ پہلے سے زیادہ بوڑھی بیمار اور موت کے قریب

ہوجائے گی۔غزل جان حیران و پریشان تھی وہ تفکرات کا گھڑا اُٹھائے نشیب اُترتی چلی گئی۔

کہیں کہیں کوئی ناشپاتی یا سیب کا درخت اُگ آیا تھا۔پہاڑی خارِ مغیلاں میں پنپتے ہوئے سیب ناشپاتیاں ۔۔۔! جن کی مزاج آشنا زمین تو اُوپر کہیں تھی، پتہ نہیں یہ رستہ بھٹک کر ان گرم مرطوب سطح مرتفع پوٹھوار میں کیسے اُتر آئے تھے۔وہ کچا سیب توڑ کر چبانے لگی، کڑوا ذائقہ زبان پر گھل گیا۔اِس پہاڑ کی چوٹی پر پھوپھی خدیجہ کا پرانا گھر تھا۔گراں کا یہ واحد گھر تھا جہاں ولائت کی کمائی نہ پہنچی تھی، کیونکہ پھوپھی بے اولاد تھی ۔۔بے ساخت پتھروں سے چنا ہوا اور گارے سے لپا ہوا گھر جسے انگور کی بیل ڈھانپے ہوئے تھی۔وہ انگور کا گچھا دونوں ہاتھوں کی پلیٹ میں دھر لائی۔

''غزل جان سناؤنی ہے کہ خزان سنگھ کی بیٹی تیری شادی میں آ رہی ہے۔۔۔ ہوکو ہائے ماڑی تے سہیلی سی۔'' اس نے کڑوا گودا فضا میں اُچھال دیا۔زبان کی نوک منہ میں گھمائی۔

''ابھی پک نہیں ہے پھوپھی۔''

''نہ پک کیسا میں نے تو سنا پرسوں جہاز اُترے گا چکلالے ہوائی اڈے پر۔۔۔''

تیز جھولے نے سمبل کی آوارہ روئی کے بُرادوں کو پوری فضا میں بکھیر دیا جیسے سفید سفید تتلیاں پھولوں کو سونگھتی پھر رہی ہوں، جن کے زخمی پروں پر روئی کے پھاہے دھرے ہوں۔

ڈھلان پر ولائت کی کمائیوں سے لدے ہوئے گھر کے باہر زبیدہ جان نے بیرونی گیٹ کو تالا لگایا اور دو چار بار کھینچ کر دیکھا۔

''آئے سو بسم اللہ شادی میں مہمان نہ آئیں گے تو کون آئے گا جــنــیــوں سے تو اب پوٹھوارنوں نے حقہ پانی بند کر رکھا ہے ورنہ ہماری ہر شادی غمی پر سب سے پہلے پہنچتی تھیں۔''

غزل جان نے سوچا اب اِس گراں میں بھی تالوں کا رواج ہو چلا ہے زبیدہ خالہ کسی جن کو رکھوالی پر کیوں نہیں بٹھا دیتی۔

غزل جان نے دوزانو ہو کر پگڈنڈی پر چھتری بنائے کھڑی کھمبی کو ہلایا۔حیرت کی بات ہے کہ راہ پر اُگی ہونے کے باوجود اُسے کسی نے نہ کھودا تھا۔شاید اب جنگلی کھمبیاں پسندیدہ نہ رہی

تھیں اب ولائتی مشروم چائنز کھانوں میں اِستعمال ہوتے تھے۔

''توڑلی چلو اچھا کیا کوئی اور توڑ لے جاتا۔ دِنوں سے حفاظت کر رہی تھی کہ ذرا بڑی ہو لے۔۔۔تو پھر۔۔۔ادھر بکریاں، جنگلی خرگوش کچھ نہیں چھوڑتے سب چر جاتے ہیں۔''

''خالہ آپ پکالو میں نے تو یونہی اُکھیڑلی پھینک دوں گی مجھے پسند نہیں ہے۔۔۔''

چٹے پڑ سے اُترتی آبشار میں پتہ نہیں کن بلندیوں سے پگھل کر برف چور گر رہا تھا۔سفید جھاگ اِک شور کے ساتھ ڈھلان میں بچھے گول پتھروں پر جیسے دھمال ڈالتا ہو۔

''توبہ توبہ اللہ کی نعمت کیوں پھینکو گی دولت زیادہ آئی ہے نا پھر یہ کیا کہ پسند نہیں۔جھلی یہ لفظ عورت ذات نہیں بولتی وہ کیا اور اُس کی پسند کیا۔پسند کا اختیار اللہ جی نے صرف مرد کو دیا ہے۔ عورت کبھی پسند کا کھاتی ہنڈاتی نہیں جو مرد دے اُسی پر سوسو بار صبر شکر کرتی ہے۔''

خالہ زبیدہ نے ایک ہاتھ سے سر پر دھرے گھڑے کو سنبھالا اور دوسرے سے کھمبی جھپٹ لی اور چوے کی سمت نکلتی پگڈنڈی پر مضبوط قدموں سے چڑھائی چڑھنے لگی۔جس پر اب شاید خالہ زبیدہ اور چرواہے ہی چلتے ہوں گے کیونکہ ہر سمت تارکول کی چمچماتی سڑکیں بچھ گئی تھیں۔

''خالہ! سارے گراں میں ٹونٹیاں اور ٹینکیاں بھری ہیں فریج اور کولر آگ لگائے ختم نہیں ہوتے تم یہ گھڑا اُٹھا کر کہاں چل پڑتی ہو۔۔۔''

غزل جان نے گھڑے کے گلے میں ہاتھ ڈال کر اپنے سر پر رکھ لیا۔بوجھ سے گردن جھک گئی۔

''نہ جھلی! اکیلی جان بھلا کیوں موٹر چلاؤں۔دو دو موٹریں جیون جوگے لگوا گئے ہیں، پر بجلی کا بل کہیں تھوڑا، یقین کر بلب بھی نہیں جلاتی، دیوا بالی کنی آں (دیا جلا لیتی ہوں)۔سوسو بار مظفر جیون جوگا تاکیدیں کر گیا بھئی آپاں جی بائی کنیا کرو۔پر کیوں جلاؤں تھوڑی محنت، تھوڑا پردیس جھیلتے ہیں تو چار چھلڑ جوڑتے ہیں یقین کر کٹوی کدے نہیں چاڑھی۔(ہانڈی کبھی نہیں بنائی)

لسّی میں نمک مرچ گھول کر چپہ روٹی کھا لیتی ہوں ہور بجھ (اور سنو) مظفر آیا تو کہنے لگا

آپاں جی ڈاکٹر کول گھو (پاس چلو) سینہ جلتا ہے ناہر و یلے جس طرح بھانبھڑ بلیں اندر کہیں۔ پرتوبہ ماہڑی توبہ بساں اچ پیر نہ دھریا کدے شہر نہ تکیا نال پنڈی چھوڑ کدے رواتاں تائیں نہ گئی آں۔ ہن بڈھاویلا کیئیاں گھاں۔ ڈاکٹراں نیاں فیساں بھراں۔ کیئیاں؟ کرماں والے پردیس جھلیں مشقتیں کریں میں ڈاکٹروں کی فیسوں میں اُڑاؤں، ہائے لوٹی! مری گھاں تے اِس طرح نہ کراں۔۔۔"

(توبہ میری کبھی بس میں پیر نہ رکھا شہر نہ دیکھا ساری عمر پنڈی چھوڑ روات تک نہ گئی کیوں ڈاکٹروں کی فیسیں بھروں۔)

پھلاہی کے ڈال کا سہارا لے کر ایک تیز موڑ کاٹا۔ گزرنے کے لیے بس ایک دو قدموں کی جگہ تھی اگر نیچے نظر چلی جائے تو میلوں گہرائی اپنے ہاتھوں کی کشش میں لپیٹ کر نگلنے کو تیار۔۔۔

کہنے لگا "چلو پاؤ بھر دودھ پی لیا کرو۔۔۔"

زبیدہ جان ہنسی تو سامنے کے ٹوٹے دانتوں سے تھوک کے ذرّے غزل جان پر سپرے ہو گئے، جیسے کوئی لطیفہ ہو گیا ہو۔ زبیدہ جان دوپٹہ منہ پر لپیٹ کر تا دیر ہنستی رہی۔

"بھلا میں دودھ کیوں پیئوں کوئی مرد ہوں کوئی باہر کی کارکرنی ہے مجھے۔۔۔ میں نے کہا مرجاؤں پر دودھ ضائع نہ کروں۔۔۔ نہ میں کوئی حالی کسان ہوں۔۔۔"

زبیدہ جان نے رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا، اوک میں منہ چھپا کر سرگوشی کی۔

"یہ ہے نا کھیت مظفر کرماں والا ٹھیکہ کر گیا تھا۔ بڑا ہوٹل بنے گا کہہ رہا تھا مہینے کی دس بیس لاکھ آمدن ہوا کرے گی۔ کراماں والا کہنے لگا۔۔۔ ہوٹل تیار ہو گیا تو آپاں جی آپ بھی کھانا یہیں سے منگوا لیا کرنا۔۔۔"

خالہ زبیدہ یوں ہنسی کہ کمزور پسلیاں تڑ تڑ بجیں۔۔۔ غزل جان نے سوچا بیماریوں کی گٹھڑی میں بندھی اس ہڈیوں کی مٹھ کے پاس مظفر کی تسبیح کے سوا کچھ نہیں بچا۔۔۔ لیکن شکیلہ جان کی تسبیح سے یوں فرق ہے کہ آنسوؤں کی بجائے ہنسی کے رِدھم پر اِس تسبیح کو پھرولتی ہے۔

پھلائی کا ڈال پکڑ کر کھائی ٹاپی جہاں سے مٹی بھرے پتھروں کا، تودہ پچھلی بارش نے میلوں

نیچے گرادیا تھا۔

''ہو کو تو یہ جوڑوں کے دردوں نے مار ڈالا۔''

کوہان اُبھرے سیاہ پتھریلے پہاڑوں کے پتھر سینوں سے سبزہ پھوٹ نکلا تھا کتنی سخت

جان ہے یہ روئیدگی بھی۔۔۔

''کیا بتاؤں تجھے غزل جان! دولیریاں (دودھل بھینسیں) گھر میں بندھی ہیں۔ روز دس

سیر صبح اور بارہ سیر شام دودھ بکتا ہے۔ ادھر پنڈی سے گاڑی آ کر لے جاتی ہے نہ عورت ذات ہوکر

دودھ کیوں پیئوں، مرنہ جاؤں۔ بے چارے پردیس کاٹیں جان ماریں میں تو اُن کے دھیلے دھیلے کی

پیال (محافظ) ہوں، نہ میں کیوں ضائع کروں۔ ہائے مرجاؤں پر پی کر ایک چھینٹ بھی ضائع نہ

کروں۔ نہ دودھ کبھی زنانیوں نے چکھا، دودھ اللہ جی نے مردوں کے لیے اُتارا ہے کیوں پئیں کماؤ

ہیں۔ عورت ذات تو گندی کوڑھی دھرتی کا بھار جتنی جلدی دھرتی کے سینے سے اُٹھ جائے اتنی ہی کم

گنہگار۔۔۔''

''خالہ! اُن بھائیوں کے لیے جنھوں نے تمھیں بیاہا تک نہیں پانچ پانچ سال مڑ کر خبر نہیں

لی کہ جیتی بھی ہو کہ مرگئی۔ اُن بھائیوں کے لیے جو اپنے بیوی بچوں کے ساتھ عیش کرتے اور یورپ

کے موسموں اور خوراکوں میں جوان اور صحت منداور تم دودھ کے گلاس کی بھی بچت۔۔۔''

بادلوں کے لشکر سیاہ وردیاں پہنے فوجی دستوں کی طرح دگڑ دگڑ مارچ کرنے لگے۔

''ہائے نہ کر ایسی بات نہ کر وہ ماں جائے دادے کی لڑی، سدا جئیں پھلیں پھولیں ہماڑ کا

کیا زنانی ذات...... اُن کی کمائی اُجاڑتی اچھی لگتی ہوں۔ زنانیاں کمائیوں کی راکھی وال ہوتی ہیں

برتتی نہیں ہیں بس سینت سنبھال کی ذمہ دار ہیں۔''

پہاڑوں کی بارش بھی کتنی بے اعتباری گھنے رتھ میں ڈھکی غار میں دونوں اُتر گئیں اور

پہاڑوں سے اُترتے پانی شور مچاتے دھما چوکڑی کرتے جیسے پوری کائنات ایک ڈھول ہو جسے

ہزاروں لاکھوں ڈھولچی مِل کر پیٹ رہے ہوں۔ جنڈ ہکائین پھلائیوں کے گھنے ذخیرے میں پانی کی لڑیاں ٹوٹ رہی تھیں لیکن موتی چھتناروں سے نیچے نہ گرتے تھے۔ سبزیوں کی بیلیں بے موسمے خربوزے تربوز، ال اور لوکی جنگلی توریوں کے بڑے بڑے پات جیسے خوشی سے تالیاں بجاتے ہوں جیسے اُن کے گلوں میں سوتر مالائیں ڈالی جا رہی ہوں۔

''توبہ کر توبہ اتنی بڑی کوٹھی کرماں والوں نے چاڑھی بیس کمرے ہیں مجال ہے کبھی کسی کمرے میں سوؤں۔ ہائے کیوں خراب کروں مالک آئیں گے تو آپ جم جم استعمال کریں گے۔ سردیوں کی اہین بھری برفیلی راتیں بھی باہر گیراج میں گزارتی ہوں۔ بس ایک مٹی کا پیالہ یہ گھڑا اور ایک رکابی۔۔۔ میں تو بس چوکیدارنی۔۔۔ ہماتڑ کا کیا نہ لیا نہ لتا پنج ویلے نماز پڑھی اور کرماں آلیاں واسطے اللہ جی سے خیر مانگی۔ ہماتڑ گنہگار۔۔۔'' رُخساروں کی کہانوں سے پھسلتی اوندھی باؤلیاں بوکے بھر بھر بہانے لگیں۔ عرشوں سے اوندھائے سارے کنویں، چشمے، آبشاریں اِک شور کے ساتھ ہر شے کو غوطا رہے تھے۔

''ہائے ماڑی ماؤ کیوں جمّیا ای وختاں جوگا۔'' (ہائے میری ماں کیوں مصیبتوں کے لیے پیدا کیا۔)

''ساری دیہاڑی بھینسوں کو چراتے دودھ دھوتے ٹہل سیوا کرتے گزر جاتی ہے۔ چھ بیگھ زمین ہے۔ خود کاشت کرواتی ہوں دانے سے دانہ بانٹ کر وصول کرتی ہوں۔ ہائے کیوں کرماں والوں کا نقصان کروں۔ ہماتڑ کا کیا آج مری کل دوسرا دن۔ یقین کر گندم کی روٹی نہیں پکاتی، بس باجرہ، مکئی، مشین سے پسوائی نہیں کرواتی، کیوں بھاڑا دوں، خود چکی پر پیس لیتی ہوں ایک دھیلا کبھی خرچا نہیں۔ پارسال مظفر آیا تو میرے نہ نہ کرتے بھی دو جوڑے لے کر دے گیا۔ آج کل کپڑے بھی۔۔۔ نہ پھٹیں نہ روز روز خرچے پڑیں۔ دو سال بعد آئے گا جیون جوگا جیتی رہی تو جوڑا دو جوڑا لے کر دے جائے گا حیاتی ٹپ جائے گی۔۔۔''

زبیدہ جان نے میلی کچیلی چادر کا پلّو خوب پھیلایا، جیسے آسمان بھر دُعائیں اسی جھولی میں

سمٹ آئی ہوں۔

"اللہ پھلیں پھولیں۔ دوہتوں پوتوں والے ہوں۔ میں نہ بال بچہ۔ زنانی ذات اللہ جی نے پیدا ہی گنہگار کیا۔ آدم نے تو معافی مانگ بخشش کرالی حوا نے کب کبھی مانگی معافی۔ میں نے تو نہیں سنا کبھی کہ اُس نے مانگی یا قبول ہوئی معافی اُس کی۔۔۔"

چوے سے لگی ٹونٹی سے گھڑا ابھر کر غزل جان نے سر پر اُٹھایا جیسے سر پچک کر رہ گیا ہو۔۔۔ گھڑا نہ ہوا گناہوں کا پنڈورا ہوا۔ غزل جان نے سوچا واقعی اُس نے بھی یہ کبھی نہیں پڑھا کہ حوا نے معافی مانگی یا شاید اُسے آدم کی معافی میں ہی بخش دیا گیا یہ بھی کہاں لکھا ہے۔۔۔"

"میرا خیال ہے بخشی ہی نہیں گئی بس دوزخ بھرنے کے لیے پیدا کی گئی ہیں یہ حوائیں۔۔۔"

زبیدہ جان نے گھڑا یوں اُس کے سر سے نوچا جیسے بیل کے سر سے ککڑی نوچی ہو۔ بارش تھم گئی تھی لیکن پورے پہاڑی سلسلے آبشاروں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ہر ہر پگڈنڈی سے اُترتے ہوئے پانی۔ اِک پتھریلے شور کے ساتھ نیچے کہیں بھاگے چلے جا رہے تھے۔

"نہ تو کہاں اُٹھا سکتی ہے اب تو تو بھی ولائتی ہو گئی ہے۔ ولائت کی ٹھنڈک میں تو ویسے ہی کمزوری ہڈیوں کو چڑھ جاتی ہے۔ یقین کر کپڑے بھی پھوکے پانی میں نتھار لیتی ہوں۔ کیوں صابون پر پیسے ضائع کروں میرا کلی جان کا کیا؟ کھایا پیا پہنا اوڑھا زیاں ہی ہے نا۔ ویسے غزل جان سنا ولائت میں عورتیں بھی مردوں کے برابر جیتی ہیں۔ اُن کے پیچھے نہیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ اپنا جوڑ بھی خود ڈھونڈ لیتی ہیں۔ ہاں تو اب تو اِس گراں میں بھی یہی فیشن چلا ہے توبہ توبہ۔۔۔"

غزل جان نے پگڈنڈی پر پھیلی بیل پر چڑھے تربوز کو ٹھوکر مار نیچے کھائی میں پھینکا، جیسے زبیدہ جان کو میلوں نیچے گہرائیوں میں جمع پانیوں میں پٹخ دیا ہو۔ جس نے ٹھنڈی آہ بھری جیسے وجود میں بھرے بارُود کو اُگلا ہو۔

"یہی تن کا جوڑا تھبو کا اور پہنا کیوں دوزخی تن کو ریشم و کمخواب پہنانا، آخر تو مٹی میں ہی ملنا، کیوں گوشت دودھ پھل فروٹ کھلانے آخر تو سب دوسری راہ نکل ہی جانا، کیوں حفاظت کرنی۔ نہ

اِس لوبھی تن کو کھلا پلا کر کیوں پالنا، آخر تو دوزخ کا ایندھن بننا ہے نازنانی ذات کے لیے تو جہنم دیکھتے ہیں خود آپ ﷺ جی نے بتا دیا نا۔۔۔ہوں نا..........

''ادھر اسلام آباد میں چار کوٹھیاں کرائے پر چڑھی ہیں لاکھوں روپے کرایہ۔۔۔'' دولت کے خزانوں کے بیان کا سلسلہ طویل ہوتا چلا گیا۔۔۔زبیدہ جان جس کے حصے میں بھائیوں کی جائیدادوں اور دولتوں کی حفاظت آئی تھی جس کا مقصدِ حیات تولہ تولہ پھووا پھووا جوڑنا اور پھر اُسے تالوں کنڈوں میں بند کر کے محافظت میں بیٹھ جانا لکھا تھا۔ کیا پھر بھی جہنمی، ہاں ہوئی جو عورت ذات، آدم کو بہکانے والی۔ جس کے لیے نہ حوروں کا وعدہ نہ دودھ مشروب کی نہریں، نہ گاؤ تکیے لگائے حسین غلمان سے چھلیں نہ شراب کے جام۔۔۔اگر کوئی جنت میں چلی بھی گئی تو بھی بڑا اعزاز شوہر کی خدمت گزاری یا پھر حوروں کی ہمسری۔ خدا بھی کہیں عورتوں کے حق میں۔۔۔مرد ہی رہا۔ غزل جان نے سوچا۔

پر وہ تو غزل جان تھی جس نے روائتوں اور خاندانی فیصلوں کی محافظت والا طوق کس دلیری سے اُتار پھینکا تھا، جو جنت کی حوروں کی ہمسری سے بھی بغاوت کر سکتی تھی۔ کئی کھمبیاں سر پر چھاتے تانے اِدھر اُدھر مٹکتی تھیں، جیسے گوری میمیں امبریلا اٹھائے سیر کو نکلی ہوں۔ جنگلی سبزیاں پھل، بارش کے موتی نکھرے ہوئے چہروں پر سجائے جیسے مشاطہ کے ہاتھوں سے تیار ہو کر ابھی ابھی باہر نکلی ہوں۔

بارش تھمے وقت گزرا دو متوازی قوسِ قزح شمالاً اور جنوباً جھولا جھول رہی تھیں۔

''انتظار، حفاظت، نگرانی، وفا کبھی مرد کا اِمتحان بھی تو لیا جانا چاہیے۔''

بارشوں کے پانی سارے ندی نالے جھیلیں رتھ بھر کر کہیں میدانوں کی سمت محوِ سفر تھے۔

پہاڑی کوا پچھلا ہی پر بیٹھا کاں اں کاں اں شور مچانے لگا۔ اتنا کالا پھٹے ہوئے گلے والا موٹے سر والا کہ مادہ اور نر میں کوئی فرق ہی نہیں۔

''نہ کس نے آنا ہے؟ اُڑ جا کسی اور بنیرے جا بول میرے آنے والے تو دُور دیس گئے۔

کب کہیں پلٹیں جن کو اُمید ہے اُن کے بنیرے جا بیٹھ۔۔۔''

زبیدہ جان اُونچے سُروں میں بین ڈالنے لگی تھی۔

''ساری حیاتی اُڈیک میں لنگھ گئی۔۔۔''نشیبوں سے ٹکراتی بازگشت چوٹیوں چڑھی۔

شاید جنات کے ہاں کوئی مرگ ہوگئی تھی۔اتنا ماتم پہاڑوں کی دیواریں بجنے لگیں۔اتنا پٹ سیاپا کیا بارش نے ڈالا تھا۔ولائت کی کمائیوں سے محروم اکلوتے مکان کی چھت سے بھیگے بھٹے اکٹھے کرتی خدیجہ جان زور سے ہنسی۔

''تیرے کس نے آنا زبیدہ جان! جیسے ہما تڑ، ہائے پر میں وسر (بھول) گئی۔خزان سنگھ کی بیٹی آ رہی ہے نا۔یاد نہیں تجھے لوٹیوں سے پہلے مِل کھیلتی تھیں۔کرانچی پر بیٹھ کر گڈی گڈے کا بیاہ کرتیں۔۔۔سکھوں کے گھر سے گڈا بیاہ لیتیں پر اپنی گڈی کبھی نہ دیتی تھیں ہم۔۔۔''

نشیبوں میں سے ڈھولک اور پرات بجانے کی صدائیں اُوپر چڑھیں۔

''لے غزل جان تیری شادی کی ڈھولک جنّیوں نے بھی رکھ لی ہے۔''

خالہ خدیجہ جان بھٹے اکٹھے کرتے گنگنانے لگی۔۔۔پھوپھی زبیدہ کے چہرے کی کیفیت یکدم بدلنے لگی تھی۔خالہ خدیجہ نے ہاتھ باہم رگڑے۔

''ہو کو ہائے! دورہ پئی گیا۔ہائے کوئی آؤ دورہ۔۔۔ہائے دورہ۔۔۔''

''چپ کر جا چپ۔'' پھوپھی زبیدہ موسل اُٹھا کر بے تحاشا برسانے لگی، بھیگے ہوئے بھٹوں سے پھسلتے پتھروں کو توڑتے بھیگی مٹی کو کیچڑ بناتے پسینے میں شرابور......جب تک غزل جان اور خالہ خدیجہ نے اُسے سنبھالا۔تب تک جبڑا مڑ گیا تھا۔سفید جھاگ بائیں باچھ سے بہہ نکلا تھا۔موسل پر پکڑ ڈھیلی ہوگئی تھی۔ردی بے کار وجود بے آب مچھلی کی طرح تڑپتا ہوا۔۔۔پانی بھرے نشیبوں میں شاید کوئی بوڑھی کنواری جنّنی بین ڈالتی تھی۔منہ سر پیٹتی تھی۔پہاڑوں کے سنگ دل سینوں پر چوٹیوں نشیبوں پر، آبشاروں، چشموں پر، جھیلوں نالوں پر ریل کی پٹڑیوں پر بارش منہ سر کوٹتی تھی اور تیز گام چھناکے سے گزر گئی تھی۔

غزل جان کو یقین نہ تھا کہ خزان سنگھ کی بیٹی کا استقبال، اِس گرم جوشی سے کیا جائے گا۔

برسوں بعد بچھڑی سہیلی کہ گم ہو چکی بیٹی جس کی ڈولی بعد مدّتوں پیکے پنڈ آئی ہو۔ خزان سنگھ کی ہٹی سے سودا خریدنے والی بڑی بوڑھیاں ابھی بھی اُس کے بچپن کی شرارتوں کو یاد رکھے ہوئے تھیں۔ اس کے ہمراہ کھیلنے والیاں گڈی گڈے کے بیاہ کے دن یاد کرتی تھیں، پھر وہ سماں تو دماغوں کی زمین پر اَن مٹ تھا، جب برات پر بلوائی ٹوٹ پڑے تھے سارا جہیز لوٹ لیا گیا، دیگیں اندھا دی گئی تھیں اور ڈولی اُٹھا لی تھی۔ خزان سنگھ کی بیٹی کی یادداشتوں میں بچپن کا چوا، مرادوں کے جھنڈوں بھری جنڈ، چٹے پڑ سے گرتی آبشار، درختوں سے گپھا بنا رتھ، سب دیئے ہنوز جگتے تھے۔

وہ ہر چیز کا ذِکر یوں کرتی تھی جیسے چھنی ہوئی عزیز اشیاء کی بار بار گنتی کر کے ایف آئی آر کٹوانی ہو۔ گڈیاں پٹولے جو آلے میں دھرے رہ گئے تھے اُسے یقین تھا وہ ابھی بھی وہیں کہیں وقت کی دھول میں چھپے پڑے ہوں گے تقریباً آدھی صدی جو اس جنم بھومی کے فراق میں تڑپتے گزری۔ یہ عمر تو اُن چند برسوں کے مرکز سے جڑی چرخی کی طرح گھومتی تھی۔ یہ اُنھی چند برس کی تلاش میں سرگرداں رہی تھی جن میں سے کسی ایک دن کا شمار بھی وہ نہ بھولی تھی نہ گھر کا رستہ نہ دکان کی شناخت، اُس نے کہا تھا مجھے کوئی رستہ نہ دکھائے۔ وہ سب سے آگے آگے اپنے مکان پر پہنچی تھی جو اَب ایک ماڈرن کوٹھی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ خزان سنگھ کی دُکان پر بھی بنا کسی راہنمائی کے پہنچی تھی جو اب بھی دُکان تھی لیکن اُس پر آویزاں ''پاکستان جنرل سٹور'' کا بورڈ برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا۔ جس کی اصل مالکن گم صم تھی اور یادوں کے چنار جلتے تھے۔ پھر یہ سکھنی درودیوار سے لپٹ کر جو روئی ہے تو پوٹھوار کے بھولے بسرے ماتم کی گونج پلٹ پلٹ پہاڑوں کے کھلے دھانوں سے نکلتی تھی جس میں جننیوں کے بین پروئے تھے۔ شاید اُس کی ہم سن جننیاں بچھڑی سہیلی کو پا کر خوشی سے روتی ہوں گی۔ تبھی تو پہاڑوں سے اُٹھتی بازگشت میں اتنی گمبھیرتا تھی۔ اتنا سوز تھا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا کسی مرگ یا شادی پر نہ ہوا۔

وہ مکھانے، ٹانگریاں، بوندی برفی جو اُس کی ماں اپنے ہاتھوں بناتی تھی، جس کے تھال

یہاں چبوترے پر دھرے ہوتے ،عید شب رات دوسہرہ ، دوالی پر جن کی تعداد دوگنی ہو جاتی ، دیسی گھی کی واشنا اور مٹھائیوں کی خوش ذائقہ خوشبو سارے میں بھری رہتی ۔ اُسے لگا اُس کی ماں کے ہاتھ کی بنی مٹھائیوں کی خوشبو ابھی بھی دُکان میں بھری رہ گئی ہے یا شاید اُس کے اپنے بدن سے چھٹتی ہے ۔

''یہاں تل والے لڈوؤں کا تھال ۔۔۔ یہاں زعفران والی بوندی یہاں دوہرے پھُوں والی امرتی ، یہاں شکر کے ٹین یہاں ۔۔۔ اور یہاں ماچس کی ڈبیاں ۔۔۔ اگرچہ پوٹھواری لہجہ خاصا تبدیل ہو گیا تھا لیکن مشرقی پنجاب کی پنجابی میں پوٹھواری لفظ اپنا تلفظ بدل کر جذب ہو گئے تھے ،فرق صاف پتہ چلتا تھا۔

اب صفِ ماتم میں بیٹھی پرانی پوٹھوارنوں کی باری تھی ۔ دوپٹوں سے منہ سر ڈھک کر گلے لگ جو بین ڈالے ہیں تو قرنوں پرانے پہاڑوں میں بازگشت پلٹی ہے ۔ جیسے اُن کے سینے گونجتے ہوں کہ پہاڑوں کے دل لرزتے ہوں ۔ سطح ہائے مرتفع پوٹھوار کے صدیوں سے جمع سارے دُکھ بے قابو ہو اُبل پڑے ہوں ۔ پہاڑ بھی روتے ہیں کیا؟ اُن کے پتھر دل بھی پگھلتے ہیں ۔ اُن کے سینے بھی چھدتے ہیں کیا ۔ اُن کے تہ دل سے گونجیلے بین باہر پھیلتے ہیں ۔ یہ سنگ دل پہاڑ بھی ماضی کی کتاب پھرولتے ہیں کیا ۔ ان کے سینوں میں یادوں کی آتش بھڑکتی ہے کیا یہ اپنے چھوڑے ہوئے مکینوں کی شناخت کی پھل جھڑیاں دل میں سنبھالے رکھتے ہیں کیا؟ ۔۔۔

اس گراں کی عورتوں کی سمجھ میں تو نہ آیا کہ سکھنی کیوں روتی ہے ،لیکن رقت اِس طرح طاری ہوئی کہ سراور رانیں پیٹ ڈالیں گھر کی مالکن نے پھوڑی بچھائی ۔

''ہوکولوٹی ! کیوں جنیا ای ماں دُکھوں جوگا ۔''

سکھنی درودیوار سے لپٹتی چومتی روتی کُرلاتی پھوڑی پر ڈھ گئی ۔

کتنے سوالات تھے جو غزل جان کو جھنجھوڑتے تھے لیکن اُس کی آنکھیں خشک چشمے تھیں ۔ جب کہ سامنے اُس کی ماں کی نسل کی عورتیں آنسوؤں کے جل تھل میں بہہ رہی تھیں ۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ سکھنی اپنے پُرکھوں کو رو رہی ہے جن کی ہڈیاں اور رُوحیں یہیں چھوڑ کر اُسے بھاگنا پڑا تھا ۔

اب وہ اُن رُوحوں سے مکالمہ کرتی ہے، جو پہاڑوں کے نشیبوں میں ابھی بھی بستی ہیں۔ وہ اُن ہڈیوں کا ماتم کرتی ہے جو اس مٹی کا سُرمہ ہوگئیں لیکن وہ تو اس مکان کو روتی تھی جہاں اُس کا بچپن اُس سے بچھڑ گیا۔ وہ امرتسر، کینیڈا اور مانچسٹر، لندن کہاں کہاں نہیں بھٹکی لیکن وہ تو یہیں اِس پہاڑی گاؤں میں ہی دبک کر بیٹھا رہ گیا تھا۔ اِس چھوٹے سے گھر کے کسی کچے کمرے میں جو اب ایک بڑے پکے مکان میں تبدیل ہو چکا تھا، لیکن اُسے کون یہاں سے دیس نکالا دے سکتا تھا کیونکہ وہ تو ان مضبوط اور طویل وعریض پہاڑوں میں اپنی کیلیں گاڑے ہوئے تھا۔ انسانوں کو تو بے وطن کیا جا سکتا تھا لیکن یہ ماضی کتنا ڈھیٹ سرکش خود کسی زندہ نفس کی طرح سانسیں لیتا جیتا اور یہیں پیچھے بستا رہ جاتا ہے۔ کبھی اُجڑتا نہیں کبھی مہاجر نہیں ہوتا، کبھی پناہ گیر بن کر در بدر نہیں ہوتا۔ یہ ماضی کس قدر سخت جان جس پر سے آدھی صدی کی ریل گاڑی دھڑ دھڑ گزر گئی لیکن دھواں چھوڑتی پٹڑیوں سے لپٹا کبھی کچلا نہ گیا۔ وہ آج بھی چوکڑی مارے، دھونی دھمائے بیٹھا تھا، برگد کی جڑوں سے جھولا جھولتا تھا۔ چوے کے پاک پانیوں میں مچھلیوں کے پونگر پر سنہری پرت بن چمٹا تھا۔ وہ آج بھی بنفشے کے پھولوں پر منڈلاتی تتلیوں کی ست رنگی افشاں میں جذب تھا۔ وہ آج بھی رتھ کنارے پڑے قوسِ قزح کے جھولے جھولتا تھا۔ وہ آج بھی کلعام ریلوے اسٹیشن سے گزرتی ریل گاڑیوں کے پہیوں سے لپٹا دھڑک دھڑک جیتا تھا۔

پوٹھوار کے بھولے بسرے ماتم کی یادیں یوں تازہ ہوئیں کہ عورتیں رو رو کر کیتھارسس کر کے ہلکی پھلکی ہوگئیں اور پھر یادوں کی مالائیں پرونے لگیں۔ ایسی دو چار بڑی بوڑھیاں بھی ابھی زندہ تھیں، جنھوں نے خزان سنگھ کے خاندان کو یہاں بستے اور پھر اُجڑتے دیکھا اور پھر وہ نسل جس کے بچپن کی کوکھ میں اُجلی اُجلی کئی یادوں کی کھُمبیاں چھاتے اوڑھے تھیں، جنھیں آنسوؤں کی برسات سینچتی تھی۔ جنھیں وقت کی گرد نے چاہے دُھندلا دیا تھا لیکن سکھنی نے یاد دلایا تو سب یاد آیا۔ آلے میں بسری گڑیوں کو زبان مِل گئی۔

"صنوبر جان! تجھے یاد ہے نا ہم رتھ میں کھیلا کرتی تھیں جس میں چشمہ اُبلتا تھا۔ ہم کپڑوں

سمیت نہایا کرتے تھے۔''

''ہاں نا جسبیر کورے! رتھ تو کٹ گیا ہے چشمہ ابھی بھی چھلکتا ہے۔''

''ہائے میں نے اُس رتھ میں جانا ہے جہاں سورج بھی آنکھ نہ مار سکتا، جہاں کے کنویں کا پانی اتنا میٹھا اتنا ٹھنڈا اتنا سوادی کہ کسی منرل واٹر میں وہ سواد نہ آیا پھر کبھی۔۔۔''

''ہاں جسبیر کورے وہ کنواں سوکھ گیا ہے لیکن اندھا غار ابھی بھی موجود ہے۔''

''ہائے نی میں نے چوے کا پانی پینا ہے۔ ہائے ذرا ہاتھ نیچے کرو چلو بھر لو کتنا شفایاب۔''

''ہاں جسبیر کورے وہ چشمہ بک گیا ہے لیکن پانی ابھی بھی اُمڈتا ہے۔۔۔''

''ہائے نی وہ سکول ساگری گراں کا پرائمری سکول جہاں میں الف بے والا قاعدہ پڑھنے کو داخل ہوئی پر پڑھ نہ سکی۔۔۔''

''ہاں جسبیر کورے اب وہ پرائمری سکول ہائی سکول بن گیا ہے اور جو داخل ہوتی ہے پڑھ کر نکلتی ہے۔''

''ہائے وہ ریل گڈی جس کی وِسلوں سے یہاں دن شروع ہوتا اور رات پڑتی تھی۔۔۔''

''ہاں جسبیر کورے وہ گڈی آج بھی گزرتی ہے لیکن اب اُس کی وِسلوں سے یہاں دن رات کا آغاز نہیں ہوتا۔''

''ہائے وہ مٹھائیاں، وہ چھینٹ کے تھان کہ گراں کی کوئی بچی دُکان پر جاتی تو اُسے گز ڈیڑھ گز کی چنی تحفے میں دیئے بنا خزان سنگھ واپس نہ موڑتا۔'' اب سوالیہ بینوں کی باری گراں کی عورتوں کی تھی۔ مکالمہ طویل اور کبھی نہ ختم ہونے والا تھا جس کے حرف جڑوں کی طرح صدیوں کی کوکھ میں گڑے تھے۔

آج بھی جنرل سٹور کے نئے مالک نے پرانی مالکن کو ایک نفیس جاپانی سوٹ تحفتاً پیش کیا تھا۔ خزان سنگھ کی دُکان کی جائز مالکن جو اِس دُکان میں دفن ماضی اور اِس کی فضاؤں میں بھٹکتی یادوں کی گاہک تھی۔ کیا سودا ممکن تھا۔ دُکان میں نئے نئے گاہک بھرے تھے اور وہ اِس ماضی کی قبر

پر یادوں کے کندھے سے لگ روتی تھی۔

''ہائے یہاں مٹھائیوں کے تھال پڑے ہوتے تھے۔ یہاں گڑ شکر کے پیپے یہاں چھینٹ کھدر کے تھان یہاں لیڈی ہملٹن اور ساٹن کے سوٹ، یہاں پھلکاریاں، یہاں کھدر کی ساڑھیاں، یہاں چرخے ترکلے۔''

صنوبر جان یاد کے قفس کی پرانی قیدی جو مُدّت ہوئی ماضی کی گرد سے پر جھٹک کر آزاد فضاؤں میں اُڑنا بھول چکی تھی۔ وہ حیران تھی کہ یہ سکھنی ہر گوڑھے کو اپنی بند پٹاری میں سنبھالے ہوئے تھی۔ وہ سکھنی کے چرخے کی تند پر لپٹتی چلی گئی۔ حیرت تو غزل جان کو اِس بات پر ہوئی کہ خود صنوبر جان سکھنی کے چرخے میں پونی پونی کتتی چلی گئی۔ یادوں کا چرخہ اٹی پہ اٹی اُتارتا گیا۔ گوڑھے پہ گوڑھا پٹاریاں چھابیاں سب بھر گئیں۔ اس تند میں کسی ملاوٹ یا کھوٹ کی ہرگز جانچ پڑتال نہ کی گئی۔ خود غزل جان جن وسوسوں کا اسرار یورپ کی برفوں میں منجمد بے اعتباریوں میں ڈھونڈتی رہی تھی اس برف کا دھواں تک صنوبر جان کی آنکھوں میں نہ دُھندلایا تھا۔ کیا صنوبر جان جرم اور انصاف والی حد سے گزر کر کوئی نروان پا گئی ہے یا چواپاک کے پانیوں پر اتنا اعتبار ہے کہ گھونٹ دو گھونٹ کی سیرابی بھی خیانت کے کہرے کو جمنے نہ دے۔

اِرد گرد کے گراؤں میں خبر لگی خزان سنگھ کی بیٹی آئی ہے۔ دن کم تھے اور دعوتیں زیادہ تھیں۔

اتنے سوٹ جمع ہوئے کہ واپسی پر زائد سامان کے پیسے بھرنے پڑے۔ ان سوٹوں کی قیمت کی نسبت اضافی چارجز کہیں زیادہ تھے لیکن ان کی قدر والا پلڑا تو کہیں زیادہ جھکا ہوا تھا۔ اتنی محفلیں جمیں کہ شادی کی تقریب دُھندلا کر رہ گئی۔ اُس نے فرمائش کر کے مانیاں بنوائیں آٹے کو گھی شکر میں خود گوندھ کر ٹکیاں گھڑیں۔ بوندی اور شکر پارے بنائے۔

''آخر حلوائی کی بیٹی تھی۔ دیکھو وہی خوشبو جو خزان سنگھ کی ہٹی میں ہوتی تھی۔''

''خوشبو تو پانی کی ہوتی ہے ایسا میٹھا پانی پوری دُنیا میں کہیں نہیں پیا۔ اِسی لیے تو مٹھائیوں میں یہ ذائقہ بھی کہیں کبھی نہ بھر سکا۔''

خزان سنگھ کی بیٹی نے مٹھائیوں کے تھال لہرا کر رقص کیا اور ہنسی کی گاگریں اُنڈیلیں۔

پرانی پوٹھوارنوں نے آنسو بھری آنکھوں سے اُس کے ہاتھوں کو چھوا۔ مٹھائی تھی کہ منہ سے لگی نہ اُترتی تھی۔

خزان سنگھ کی بیٹی تقریباً نصف صدی کا سمندر پاٹ کر اپنے بچپن کے گھروندے میں جیسے خوشی سے کیکلی ڈالتی ہو جیسے وہ پھر سے چار پانچ برس کی ہوگئی ہو۔ نصف صدی کی گھور مسافتیں اُس پر سے اُتر گئی ہوں۔ برسوں کی تکان ایک انگڑائی میں چھٹ گئی ہو اور وہ لڑکی سی نکل آئی ہو۔ آنکھوں کے دِیپ جگتے، یوں جیسے دیوالی کے دیے، قہقہے اُنڈیلتی جیسے شب رات کی آتش بازی، بولتی تو گھنگھروسے بجتے، جیسے بیتے وقت کے قافلوں کے نقارے، چلتی تو پیراہن کے رنگ لہراتے، جیسے دیوالی کی رنگ بھری پچکاریاں کھِلرتی ہوں۔ اِس گراں میں بسنے والے بچپنے نے اُسے رنگوں اور رسوں سے نہال کر دیا تھا۔

شادی کے پانچ روز بعد غزل جان کی فلائیٹ تھی۔ اُسے پانچ راتوں کی سہاگن بن کر بچھڑ جانا تھا۔۔۔ ان پانچ راتوں میں سے ہر ایک رات کی اپنی کہانی تھی لیکن ان ساری راتوں میں ایک ہی مشترک بات تھی کہ اب انھیں غزل جان کو نہیں بلکہ عثمان خان کو عمر بھر دُہرانا تھا۔ پل پل یاد کرنا تھا اِس یاد کا سلسلہ غزل جان تک پہنچتے پہنچتے بکھر گیا تھا کیونکہ یورپ کی ٹھنڈی تیز رفتار زندگی میں یاد کی مالائیں پرونے کا وقت نہیں مِلا کرتا۔ اب اِس یاد مالا کو عثمان خان کے گلے کا ہار بننا تھا۔

پہلی رات جب حجلۂ عروسی میں اُسے دھکیلا گیا تو پہلی رات کی دُلہن کا گھونگھٹ اُٹھانے کی اُسے ہمت ہی نہ ہوسکی۔ جیسے وہ دُلہن نہ ہو یورپ سے درآمدہ کوئی ایسی جدید مشین ہو جسے وہ چلانا نہ جانتا ہو اور اِس خوف سے کوشش بھی نہ کر رہا ہو کہ کہیں مہنگی چیز خراب نہ ہو جائے، جیسے اُس نے برٹش کارڈز کا لباس زیب تن کر رکھا ہو، جس پر میڈ اِن انگلینڈ کی مہریں ثبت ہوں لیکن جس کے ساتھ ترکیب استعمال والا لٹریچر بھیجنا وہ بھول گئے ہوں۔۔۔ دھکا دے کر کسی نے داخل تو کر دیا تھا اور باہر سے کنڈی چڑھا دی تھی۔ بھاگ نکلنے کا رستہ بھی بند کر دیا تھا لیکن وہ دروازے کے ساتھ

ہی قالین پر پڑا رہا تھا، جیسے معذرت خواہ ہو کہ اس وقوعے میں میرا کوئی کردار نہیں ہے جو بھی ہوا اُوپر سے کہیں نازل ہوا میں تو میڈ اِن انگلینڈ کا بار اُٹھانے کے قابل ہی نہ تھا۔

چند لمحوں میں ہی وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ شاید اُس کے دماغ کی بیداری کی نسبت اِس حادثے کا وزن کہیں زیادہ تھا۔

غزل جان بھاری لہنگا سیٹ اور طلائی زیورات کا بوجھ اُٹھائے سنگھار میز کے شیشے میں خود کو دیکھتی تھی۔ دنوں کی محنت سے منتخب کیا ہوا لباس اور زیورات جنھیں اُس کے بدن پر سجانے کو بیوٹیشن نے چھ گھنٹے صرف کیے تھے۔ پورے جسم کو تھریڈنگ مساج، سٹیم یعنی حسن نکھارنے کے نئے جدید طریقوں سے شعلہ سا بدن بنا دیا تھا۔ سیاہ رنگ زیر جامے خصوصی طور پر پہنائے گئے تھے کہ گلابی اور سیاہ کا کنٹراس آگ دہکا دیتا ہے۔ مرد کی پسندیدگی اور سیکس کی حدت کے پیمانوں پر دُلہن کو تیار کیا گیا تھا۔

''مرد اور سیکس۔''

غزل جان نے قدِ آدم آئینے میں سے دروازے کے سامنے مُردہ سے حقیر وجود کو پڑا دیکھا۔

''یہ مرد...... پھسڈی۔۔۔ میڈ اِن پوٹھوار جو ولائت کی کمائیوں میں اپنی روائتوں اور وقار کا سودا کر چکا ہے۔ کھوکھلا دوغلا اپنی حرارتوں اور توانائیوں کو ڈالر اور پاؤنڈز میں لپیٹ چکا ہے۔ ہت تھو۔۔۔''

اُس نے اپنا قہقہہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر روکا، جسے اِس لباس بناؤ سنگھار زیورات کی حرارتوں سے دہکتے بدن کی سیکسی بناوٹوں، ملائمتوں اور روم روم سے پھوٹتی روشنی کی سمت منہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی غزل جان نے سوچا۔

کیا یہ قابلِ افسوس اَمر ہے یا وہ اپنے پلان کی بالکل صحیح سمت بڑھ رہی ہے۔ غزل جان نے بُندوں کے سہارے کھولے، پورا سَر ایک ایک لٹ مختلف چھوٹی بڑی پنوں سوئیوں سے بھرے تھے، جوڑے کی پنیں ٹیکہ اور جھومر کو سر پر ٹکانے کی پنیں، نتھ اور بھاری بُندوں کو سہارنے کو پنیں بھاری

کامدانی دوپٹہ اٹکانے کو پنیں۔ اُسے پھر ہنسی آ گئی شاید مشرقی دُلہن کے لیے یہ مرحلہ سب سے بڑھ کر ہیجانی اور سیکسی ہوتا ہے، جب یہ پنیں اُترتی ہیں، جیسے کوٹھے والی کی نتھ اُترتی ہے۔ اُس نے سہاگ رات کی جتنی کہانیاں سن رکھی تھیں یہی ایک مرحلہ اُسے عجب رومانی معلوم ہوتا تھا۔ جب دُلہا دُلہن کے بدن پر جڑی یہ سوئیاں کھولتا ہے۔ ایک ایک پن اُتارتا ہے جیسے سلگتے بدن کے بندِ قبا کھولتا ہو۔ جیسے سوئیوں میں سلی ہوئی شہزادی، جس کی سوئیاں کسی شہزادے نے ایک ایک کر کے چُن لی ہوں لیکن آنکھوں کی سوئیاں رہنے دی ہوں اس مشرقی دُلہن کی طرح جس کے پورے بدن کی سوئیاں چُن لی جاتی ہیں لیکن آنکھوں کی سوئیاں عمر بھر چبھتی اندھا کرتی رہتی ہیں۔ لیکن انھیں کبھی کوئی نہیں نکالتا، لیکن غزل جان خوش قسمت تھی کہ اُس کے سوئیوں سے جکڑے وجود میں بس آنکھیں ہی تھیں جن میں سوئیاں نہ پروئی جا سکی تھیں بٹ بٹ کھلی تھیں وہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔

شیشے میں سے بے سدھ پڑی انسانی شبیہ کو اُس نے تحقیر سے دیکھا یہ آج کی رات بھی سو سکتا ہے کیا؟ جب کہ پنوں اور سوئیوں میں جکڑی دُلہن کنواری خوشبوؤں میں مہکتی اُس کے ساتھ اکیلے کمرے میں بند ہے۔ وہ ایک ایک پن کھولنے لگی ہر پن کھل جانے کے بعد اُسے کسی بندش سے آزاد کر دیتی تھی۔ پہلے نتھ کی پنیں کھولیں اور نتھ کی جھولتی ہوئی موتیوں کی لڑی ٹھوری پر جھولنے لگی۔ نتھ اتنی مضبوطی سے ناک کے چھید میں پروئی گئی تھی کہ باہر نکالنے کی تگ و دو میں خون پھوٹ نکلا۔

اُس کا جی چاہا باہر سے اپنی چھوٹی بہن مریم جان کو آواز دے جو اَب اُس سے جیٹھانی کا رشتہ بھی رکھتی تھی لیکن نہیں دُلہن کی پنیں کبھی کسی بہن یا جٹھانی نے نہیں کھولیں۔ یہ تو صرف دولہے کا اِستحقاق ہے اور دُلہن کا غرور۔ یہ سب سوئیاں بے تابی کو مہمیز کرنیوالے کوڑے ہیں، جو صرف دولہے کے بدن پر برسنے کے لیے تو چنی جاتی ہیں۔ اب غزل جان کو خود اپنی پوروں کو زخمی کرنا تھا۔ اپنی سوئیاں خود اپنے ہاتھوں چننی تھیں۔ اُس نے یہ سجاوٹیں یہ سولہ سنگھار اِس چغد کے لیے تھوڑی کروایا تھا۔ اُسے دُلہن بننا تھا اور دُلہن بھی ولائت کی کمائیوں سے اصراف کے ساتھ کہ دیکھنے والے کہہ سکیں۔

کیا زیور ڈالا ہے ولائیتیوں نے۔ عروسی جوڑا! جوڑے پر تو مانو ڈالر اور پاؤنڈز جڑے تھے۔ تصویروں کے رول کے رول اُترے تھے۔ وی سی آر کی کتنی ریلز خرچ ہوئی تھیں۔ گولڈن سینڈل میں سجے پیر جن پر کون مہندی کے نقش ونگار بنانے میں پورا دن صرف ہوا تھا۔ سونے کے پازیب اِس پوٹھوار میں پہلی بار اِس ولائتی دُلہن نے جھنجھنائے تھے۔ پیروں سے شروع ہوتا مووی کیمرہ شوٹ لیتا گھٹنوں پر دھرے ہاتھوں کی عکاسی کرتا تھا۔ حنائی اُنگلیوں میں پڑی چھاپیں پنج اُنگلے، جن میں سونے کی سی دہک چھوڑتا پرس سلامی کے کورے نوٹوں سے بھرا تھا، لیکن ان سجی ہوئی اُنگلیوں میں جگمگاتی ایک بھی چھاپ پر دل کی شبیہ نہ بنی تھی۔ وہ شکیلہ جان، زرینہ جان کے منصب کو ٹھکرا چکی تھی جو اِسی دل والی چھاپ کے سینے میں بند عمر بھر دھڑکتی رہیں اور فاطمہ جان جیسی کتنی تھیں جو دل پر کندہ چھاپ سے ہی بیاہی گئی تھیں۔ لیکن دُلہن کا عروسی جوڑا نصیب نہ ہوا تھا۔ وہ خوش قسمت تھی کہ اُسے عروسی جوڑا نصیب تو ہوا تھا۔ چاہے دل والی چھاپ بے بیاہی ہی رہ گئی ہو۔ پتہ نہیں کنواری کہ نکاحی۔ اُس کی ہر اُنگلی چھاپوں سے بھری تھی لیکن ایک بھی دھڑکتی نہ تھی کسی پر بھی کوئی نام کندہ نہ تھا۔

''تاج۔۔۔تاج محل۔۔۔'' دل کے خشک ویران جزیروں میں بوندسی ٹپکی۔ شہدسی بوند جو جم کر گوند بن گئی۔ چپکنے والی بے ذائقہ موم بتی بنانے والی سلگنے والی اور پھر بھسم ہو جانے والی۔

اُس نے سوچا وہ دُلہن بنی ہے خود کے لیے، کہ کوئی یہ نہ کہے کہ غزل جان بیٹھی بوڑھی ہو گئی۔ اُسے بر نہ مِلا۔ وہ شکیلہ جان، فاطمہ جان کی طرح دُلہن بننے کے خواب آسیبوں کا شکار نہ ہونا چاہتی تھی۔ وہ دُلہن بن گئی تھی۔ کتنے زیور سجائے تھے اُس نے ایک ایک اُترتا گہنا سنگھار میز پر جمع ہوتا چلا گیا، جھمکے، بازوبند، گلوبند، ہار، مالائیں، پازیب، شفاف شیشے میں جیسے آگ دہک اُٹھی ہو، جو سنگھار پڑے کی مہک میں گچ تھا۔

اب عروسی ملبوس کے اُترنے کی باری تھی اُس نے شیشے میں سے انسان نما ڈھیر کو دیکھا جس کے خراٹے آہ و بکا ڈال رہے تھے۔ یہ لباس تبدیل کرنے کے لیے غسل خانے میں جانے کی

ضرورت نہ تھی۔ یوں بھی عروسی ملبوس کا حجلۂ عروسی میں ہی تبدیل ہونا دستور ہے۔

سچے تاروں اور موتیوں سے باریک کامدانی کے فن کا نادر نمونہ آتشیں لہنگا قالین پر اوندھا گیا جیسے ٹھوکر کھا کر کسی اندھے غار میں گر گیا ہو۔

بیڈ پر پڑا وزنی بارڈر والا دوپٹہ جیسے لہنگے کی ہیئت کذائی پر کھلکھلایا ہو بس اب چولی چڑھی رہ گئی تھی، جس کے بٹن کھولنے کا حق شبِ عروسی کی روایت کے مطابق صرف دولہے کو ہی حاصل ہوتا ہے۔ ''دولہا'' نیند میں جس کا ہاتھ دروازے سے ٹکرایا اور چند ثانیوں کے لیے خراٹے رُک گئے۔ پھر پہلے سے بھی پُرشور ہو اُٹھے، جیسے اِس حق سے دستبرداری پر احتجاج کرتے ہوں۔ اُس نے بازو موڑ کر ایک ہی جھٹکے میں پوری زِپ کھول دی۔ زیں ایں کی لمبی چیخ کے ساتھ چولی ڈھیلی ہو گئی۔ اب اُسے اُتار پھینکنا کون سا مشکل تھا۔ وہ بھی اندھے غار میں منہ کے بل گری۔

سیاہ زیر جاموں میں جھلملاتا کنوارا عنابی بدن ان چھوا بے لمس۔۔۔ جسے زندگی میں پہلی بار دعوتِ نظارہ دینے کو محنتوں سے تیار کیا گیا تھا۔ لیکن نظارہ حاصل کرنے والا کوئی نہ تھا۔ دروازے کے پاس پڑے ڈھیر کے خراٹے ڈراؤنے ہو گئے۔ آئینے کے جوہر میں سے خود بخود ایک شبیہ مسکرانے لگی۔ وہ سکتے میں رہ گئی۔

''تاج۔ تاج محل۔''

جب ایک دروازہ کھلا تھا اور اندر کا کریہہ منظر اُس کی بصارتوں پر طلوع ہوا تھا اور وہ بچ کر بھاگ نکلی تھی۔ وحشیانہ قہقہے اُس کا پیچھا کرتے رہے تھے۔ اُسے لگا حجلۂ عروسی انھی قہقہوں سے گونج اُٹھا ہے۔ بے عزتی، بے حرمتی، اُس نے اتنی سُرعت سے شب خوابی کے لباس میں خود کو ڈھکا کہ میز پر پڑا پانی کا جگ اُلٹ گیا۔ پانی دبیز قالین میں جذب ہوتا رہا اُس نے جگ کو سیدھا نہ کیا۔ فرش پر پڑے ڈھیر نے کسی خطرے کی بو پا کر فضا میں ہاتھ چلائے، جیسے کچھ پکڑنے کی کاوِش کر رہا ہو پھر کٹی شاخیں سی ہاتھ نیچے گر گئے۔ وہ بیڈ پر تنی سیج کی سنہری لڑیاں ہٹا کر اندر اوندھا گئی۔ حجلۂ عروسی سسکیوں اور آنسوؤں میں گچ سہاگ پڑے کی خوشبوئیں دم گھونٹتی تھیں۔

اگلی صبح یہ خبر آٹھ گراؤں میں لگی کہ غزل جان اپنا کنوارپن ولائت کی ٹھنڈ کی نذر کر آئی ہے۔ وہ سفید چادر جو حجلۂ عروسی میں بچھی تھی وہ بے داغ رہی تھی۔ گاؤں کی عورتیں رواج کے مطابق صبح سویرے چادر دکھائی کے لیے آئیں تو عروسی پلنگ پر بچھی سفید چادر دُودھ کی طرح اُجلی تھی، ذرا مسلی بھی نہ گئی تھی۔

یہ ان گراؤں کی پرانی رِیت میں انوکھا وقوعہ تھا کہ لڑکی اپنی بکارت کا ثبوت پیش نہ کر سکی تھی۔ اگر کوئی دوسری ہوتی تو طلاق کے داغ کے ساتھ کونوں کھدروں میں چھپ پل پل مرتی یا ایک ہی بار نیلا تھوتھا پی چین کی نیند سو رہتی اگر شک کے فائدے میں سہاگ بخش بھی دیا جاتا تو شوہر کے واہموں، نفرتوں اور ساس نندوں کے طعنوں کے تکلوں میں پور پور عمر بھر چھدنا پڑتا اور بے توقیری کی انگیٹھی پر سلگنا ہوتا۔ رواج کے مطابق اُنھیں یہ داغ دار چادر دُلہن کے کمرے کی چوکھٹ کے باہر پڑی ہوئی ملنی چاہیے تھی جو دولہا سب کے بیدار ہونے سے پہلے پہلے باہر پھینک دیتا تھا۔ لیکن چوکھٹ تو بیوہ کی مانگ کی طرح سونی تھی۔

عورتیں اضطراب سے پھٹتے سینوں اور تڑ تڑ بجتی پسلیوں کے ساتھ گچھا مچھا دروازے پر بجیں اور دھڑام سے اندر پٹخیں کچھ دیر تو ناک پر دھری اُنگلی کی طرح حیران کھڑی رہیں کہ وہ غزل جان تھی۔ برٹش نیشنل۔ پھر سوچا شاید ولائت پلٹ لڑکی نے خود ہی چادر بدل دی ہو، جب طلب کرنے پر بھی چادر نہ ملی تو پھر ساری پھوپھیاں، ممانیاں، چاچیاں یکبارگی ساسیں بن گئیں۔

دوسری رات جب دن بھر کی لعن طعن اور مذاق کا بوجھ اُٹھائے عثمان خان کمرے میں داخل ہوا تو دروازے کی کنڈی لگتے ہی بلب بجھا دیا اور گھور تاریکی کی کوکھ میں چھلانگ لگا دی، جیسے ڈرتا ہو کہ میڈ اِن انگلینڈ کی بارُعب مہر پر کہیں پھر سے نظر نہ پڑ جائے ورنہ بے اٹکلی کے بے توقیر احساس سنٹھ کر دیں گے۔

چہرے یا جسم کے کسی بھی دوسرے اعضا سے اُسے کوئی غرض نہ تھی۔ اُس کا ہدف صرف وہ مقام تھا جسے سر کرنے کے بعد اندھے الزامات کو وہ دھو سکتا تھا۔ ہونٹ چہرہ، ہاتھ، کلائیاں، پیٹ کی

پلیٹ، بال سب کنوارے اَن چھوئے رہ گئے، وہ اِس ناگہانی حملے سے سنبھل ہی نہ سکی۔ اُس نے مردانگی کے اِس انتقامی وار کا سوچا تک نہ تھا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی۔ شدتِ تکلیف پر چلانا چاہتی تھی۔ اپنی بے توقیری پر واویلا کرنا چاہتی تھی لیکن وہ اُسے مردانگی کے اِس بھرپور اظہار پر شاباشی وصول کرتے ہوئے بھی نہ دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ جانتی تھی وہ جتنا بھی چیختی، جتنا بھی مدد کے لیے پکارتی باہر سے ہنسی ٹھٹھول کی آوازوں کے سوا کچھ نہ پہنچتا۔ وہ اِس جیتے ہوئے سانڈ کے گلے میں فتح کے ہار پھول پہنے ہوئے نہ دیکھ سکتی تھی۔

اُس نے تکلیف اور ذِلت کے احساس کو اپنے ہی گلے میں اُتار لیا۔ اپنے ہی وجود میں کوڑے کی طرح ٹھونس لیا لیکن سفید چادر پر وہ گواہیاں ضرور لکھی گئیں۔ پرانی روایت کے ٹوٹنے کی خواہش میں مضطرب گراں بھر کی عورتیں دروازہ کھلتے ہی ریوڑ کی طرح اندر گھسیں۔ سب کی نگاہیں داغدار چادر سے لپٹیں۔ ہنسی کے چھینٹوں اور لذیذ جملوں سے غزل جان کی بریت کا فتویٰ جاری کر دیا گیا۔

شاید اِس افسوس کے ساتھ کہ حظ اور ہیجان کا موقع ضائع ہو گیا۔ غزل جان نے سوچا۔ تاج محل کی دھرتی کے باسی نے بھی تو بس اتنا ہی چاہا تھا لیکن کم از کم بتانا ضروری سمجھا اور وہ بھاگ نکلی تھی، لیکن یہاں ذہن اور اِرادے کی عبارت پڑھنے کی ضرورت نہ تھی کیونکہ نکاح کے بولوں میں وہ اپنا یہ حق سلب کروا چکی تھی۔

عثمان خاں جیسے ہی کمرے کے دروازے سے نکلا باہر کھڑے چچازادوں، پھوپھی، خالہ زادوں کی شیطان چوکڑی نے تالیاں بجائیں اور یکبارگی نعرے بلند ہوئے۔

''شلوار اُلٹی اوئے ہوئے اُلٹی شلوار۔'' وہ تالیوں اور قہقہوں کی گونج میں واپس پلٹا تو عورتوں نے مذاق کے تکلوں میں پرو لیا جو صرف ایسے ہی موقعے پر اپنی صدیوں پرانی سنٹھ شرم و حیا کو کہیں الگنی پر ٹانگ دیتی تھیں۔ حالانکہ شلوار اُلٹی نہیں سیدھی تھی، لیکن شاید ان رِشتے کے بھائیوں نے کوئی طاقت ور معجون یا پھر کوئی سریع اثر ولائتی دوا کھلا کر حجلۂ عروسی میں دھکیلا تھا اور اب

دوا کی کامیابی پر ایک دوسرے کو داد دے رہے تھے۔ جیسے رنگ میں جیتنے والے کو ہجوم نے کندھوں پر اُٹھالیا ہو۔

تیسری رات وہ اُسی طرح اندھیرے کی کوکھ میں چھپا شکار پر جھپٹا جیسے بھیڑیے کے منہ کو خون لگ چکا ہو اور وہ ریوڑ سے دوسری بھیڑ بھی چیر پھاڑ کرنے آیا ہو، لیکن یہ بھیڑ اپنی مسکینی اور ناتوانی کے باوجود مڑے ہوئے سینگ رکھتی تھی۔ کئی کھرونچے کئی دانت مدافعیت میں گاڑ دیئے تھے، لیکن ''شلوار اُلٹی'' کی جگت سے گھبرا کر دروازے کی چوکھٹ سے سر ٹکرا کر زخمی ہونے والا آج زیادہ پُر اعتماد تھا۔

شدید مزاحمت کے باوجود بھیڑ زخمی ہوگئی تھی۔

اگلی صبح یہ خبر آٹھ گراؤں میں لگی۔

''ہائے لوٹی ہائے لوٹی ہوکو ہائے! حق آں کنڈ کرنی دوزخ سڑے ولائتوں کے ہو آئی زنانی نیں مرد بنی گئی۔۔۔ ہائے سنا عثمان خانے کے گلے پڑی، ناخن اور ٹانگیں ماریں ہوکو لوٹی! موت جو گی۔۔۔ ایسیوں سے ہی تو جہنم کا پیٹ بھرنا ہے۔''

چوتھی رات وہ کمرے میں تو آیا لیکن بیڈ سے تکیہ اُٹھا کر نیچے بے سُدھ سو گیا۔ شاید لڑائی کا موڈ اور توانائی نہ رکھتا ہو۔

پانچویں اور آخری رات شاید بھائیوں نے تاکید کی تھی کہ دوستوں نے ہمت بندھائی تھی پھر بھیڑ زخمی ہوگئی۔

ان پانچ راتوں میں اُن کے درمیان گفتگو کا کوئی سلسلہ نہ جڑا تھا۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے کا چہرہ تک نہ دیکھا تھا۔ گھور تاریکی کی کوکھ میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیا تھا۔ جس کی ضرورت تھی وہ اعضا اندازے اور تخمینے سے وا ہوئے تھے لیکن شادی کا اہم رُکن ادا تو ہو گیا تھا۔ آٹھ گراؤں کے مردوں کی تسلی اور عورتوں کی تشفی ہوگئی تھی۔

اب وہ خزان سنگھ کی بیٹی کے ہمراہ ولائت کو رُخصت ہو رہی تھی۔ اِس گراں کو گھیرے

ہوئے پہاڑی سلسلوں میں آہ و بکا پلٹ پلٹ کر گونجتی رہی تھی۔ شب بھر جنات کی عورتوں نے پٹ کلٹا ڈالے رکھا تھا، اور اب انسانوں کی عورتیں اُس آہ و زاری کا سرا پکڑ رہی تھیں، جہاں سے جننیوں نے سانجھ سویرے اُسے چھوڑا تھا۔ یہ پہاڑوں کے ہم وزن ہم سن دکھ ان عورتوں کی تو آنکھ سمندر میں سمائے رہتے ہیں جو ذرا سے جوار بھاٹے سے طغیانیاں بہا دیتے ہیں۔ پوٹھوار کی یہ عورتیں شاید اِسی نمکین پانی سے گوندھ کر دُکھوں کے چاک پر گھڑی گئی ہیں۔ ذرا سی ٹھوکر سے سارے گھڑے کوزے اُبل پڑتے ہیں۔

غزل جان نے صنوبر جان سے گلے لپٹتے ہوئے سرگوشی کی تھی۔

''اب انتظار کی باری اُس کی ہے۔ امی! آج روایت بدل رہی ہے آج فطرت کے بدلے کا دن آ پہنچا ہے۔۔۔''

صنوبر جان کے آنسوؤں نے گردن کی صراحی لبالب بھر دی تھی۔

''انتظار کے دوزخ کا ایندھن مت بننا، میری نصیحت بھی ہے اور حکم بھی۔۔۔''

ایئرپورٹ تک چھوڑنے صرف مرد آئے تھے۔ ان میں عثمان خان بھی شامل تھا۔ یہ عجب رِشتہ تھا، جو وصل کی انتہا کو پہنچا لیکن ایک دوسرے کو دیکھنے کی خواہش کا حوصلہ بھی چھین لے گیا۔

اس پوٹھوار کی تاریخ میں یہ پہلا حادثہ ہوا تھا کہ کوئی نو بیاہتا اپنے شوہر کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ جو اُسے الوداع کہنے والوں میں تو تھا لیکن ہاتھ ہلانے والوں میں اُس کا ہاتھ شامل نہ تھا، جو شاید روایتوں کی صدیوں پرانی ریل گاڑی کو رُخصت ہوتے دیکھ کر شرمارہا تھا۔ وقتِ رُخصت وہ سبھی سے ملی تھی، گلے لگی تھی سر پر ہاتھ پھروایا تھا۔ پیار لیا تھا۔ پیشانی پر بوسے لیے تھے لیکن یہ کیسا رشتہ تھا کہ جسم کی پاتال کو چھو لینے والا نظریں چار نہ کر سکا تھا۔

غزل جان یوں دُور ہٹ گئی تھی، جیسے تھور ہو کہ سہہ کہیں کانٹے نہ چمٹ جائیں۔

وہ دونوں لاؤنج میں چلی گئیں رُخصت کرنے کو آنے والے جہاز کے اُڑان بھرنے کا انتظار کرنے لگے۔ شاید فطرت کے انتقام والا مرحلہ آن پہنچا تھا۔ قدرت کا وہ نظامِ عدل جو زیریں

سطحوں پر سدا جاری رہتا ہے۔ جسے مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔

جہاز کی کھڑکی سے بادلوں کے گالوں میں سے زمین کی سختی کو تلاش کرتے ہوئے عجب کیفیت تھی، جیسے روئی کے پہاڑ محوِ پرواز ہوں۔ جن پر سورج سوار ہو جسے وہ اپنی ننگی آنکھوں سے دیکھ سکنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ یہ عجب سورج تھا، جس نے بادلوں کے بے کنار پہاڑی سلسلوں پر چاند ستارے اور کرنیں ٹانگ دی تھیں۔ روشنیاں بھر دی تھیں۔

شاید شکیلہ جان کی رُوح ان بادلوں پر سوار اُس کے ہمراہ ہوگئی تھی اور اُسے شاباش دیتی تھی کہ آج تاریخ کا دھارا بدل گیا ہے۔ آج یہاں کی ایک عورت گھور پرانے دُکھ کسی مرد کی جھولی میں اُلٹا کر کھلی فضاؤں میں پرواز کر گئی ہے۔ وفا نبھانے کا کڑا، امتحان پہلی بار اِس پہاڑی گاؤں میں کسی مرد پر آن پڑا تھا۔ اب وہ انتظار کرے گا۔ دُور دیس جانے والی کے واپس مڑنے کا، اتنے دن گنے گا اتنے پہر اتنے لمحے شمار کرے گا کہ بالوں کی سیاہی سفیدی میں تبدیل ہو جائے گی۔ ہر ہر پل چہرے پر پڑنے والی جھریوں میں گندھ جائے گا۔ سلگتی جوانی کی آگ مزاج میں بھڑک اُٹھے گی اور آتشیں زبانیں رُوح تک کو چاٹ جائیں گی، لیکن حیرت تو اُسے اُس وقت ہوئی۔ جب انگلینڈ کی ٹھنڈی راتوں میں وہ از خود سلگنے لگی۔ وہ لمس جو زور زبردستی اپنے نقش پا ثبت کر گیا تھا۔ وہ قدم قدم محوِ خرام ہونے لگا۔ پگڈنڈیاں بنانے لگا۔ سانپ کے بے پاؤں لہرئیوں کی طرح سرسرانے لگا۔ بچھو کے مہین ڈنگ ہر ہر مسام کو ڈسنے لگے۔

آتے جاتے رستوں، پارکوں میں اِک دُوجے میں گم جوڑے یورپ کے بے راہ رو کلچر کی نفرت میں سے اپنی معنویت جتانے لگے۔ برف پگھلے ٹنڈ منڈ درختوں پر کونپلیں پھوٹنے لگی تھیں، جب وہ گئی تھی تو سڑکوں کے اطراف، مکانوں کی چھتوں پر برف کے ڈھیر جمے تھے۔ اس ڈیڑھ ماہ میں وہ چپکے سے کہیں پگھل گئے تھے۔ اب لمبے کوٹوں میں لپٹی گوریاں مختصر لباس میں موسم گرما سے لطف اندوز ہونے لگی تھیں۔ چھٹی کے اس روز وہ اپنے ہی اندر برپا جنگ سے شکست خوردہ سی بستر میں تا دیر پڑی رہی تھی۔ ناشتے کے تصوّر سے ہی اُبکائی اُمڈتی تھی۔ جب جسبیر کور نے آ کر گرم

ماتھے پر ہاتھ رکھا تو حلق میں بھری اُبکائی واپس سینے میں دھکیلنا اُسے مشکل ہوگیا۔ جسبیر کور اُچھل پڑی جیسے اُلٹی نہ ہو کوئی ہیرے موتی ہوں جو اُس نے ڈکرا کر اُلٹ دیئے ہوں۔

''سمجھ گئی۔ دن چڑھ گئے ہیں نا۔''

وہ خوشی سے چیخ مار کر مٹھائی لینے کو بھاگی۔ اُس کے بس میں نہ تھا کہ ایک ایک فلیٹ کی کال بیل بجا کر پہلے بھنگڑہ ناچتی اور پھر منہ میٹھا کرواتی۔

غزل جان نے ہاتھ بڑھا کر قمیص کا دامن کھینچ لیا۔

''خوشی کس بات کی، آخر کس بات کی۔۔۔ کہ میں مجبور ہوئی ایسے شخص کی بیوی بننے کے لیے جس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں تھا۔ درندوں کی طرح وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ جس کا نتیجہ کہ میں ان چاہے Un-Wanted بچے کی ماں بننے والی ہوگئی۔ قبول کرلوں، میٹرک فیل اُجڈ جاہل اُسے اپنا شوہر مان لوں۔ ایک یورپی یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکی۔

۔۔۔ میں اُس سے شادی پر مجبور کیوں ہوئی۔ یہ آپ نہیں سمجھیں گی۔ یہ شادی کسی خوشی یا وفا کا بندھن نہیں ہے۔''

اُس نے سارے فیصلے یکبارگی اُنڈیل دیئے جیسے اُلٹی اُنڈیل دی تھی۔ بے اختیار حلق میں بھری غلاظت باہر اُلٹ دی تھی۔

''ہائے نی کملی! میں بھلا کیا نہیں سمجھتی، عورت تو اِس یورپ میں بھی گڈیاں بننے کی سمت لوٹ رہی ہے۔۔۔

ہم جب اپنے وطن چھوڑ آئے تو جوڑ اور میچ بھی وہیں چھٹ گئے۔ اب تو دیکھ نہیں رہی۔ ایشیائی کمیونٹی میں یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے بر نہیں رہے۔ لڑکیاں بن بیاہی رہ نہیں سکتیں۔ اپنے دیسوں میں جوڑ نہ ملے تو لڑکی سنیاس لے لیتی ہے۔ کوئی درخت سے بیاہی جاتی ہے کوئی قرآن سے نکاحی گئی، کوئی مصلے بٹھائی جاتی ہے چلو دُلہن بننے کا چاؤ تو پورا ہو جاتا ہے نا۔

ماں باپ بھی مطمئن، وہ بھی اپنے وجود کی چتا میں جل مریں۔ یہاں چتا بھی تو نہیں جلتی نہ

ودوہ کے لیے نہ کنواری کے لیے پھر ماپوں کو کہیں سے تو برلانا ہے۔ خوف یہ کہ گورے یا کالے اُن کی نسل کو بدنسلا نہ کر دیں۔ یہاں جوانی بیٹھ کر نہیں گزرتی۔ اِسی لیے تو نے دیکھا نہیں پیچھے سے وطنوں سے اپنے بھتیجے بھانجے بلا کر اُنھیں یہاں سیٹ بھی کرتے ہیں اور بیٹیاں بھی اُن سے بیاہتے ہیں۔ نخرے بھی اُٹھاتے ہیں اور بے جوڑ رِشتے بھی نبھاتے ہیں۔۔۔

مجبوری ہے گڈی مجبوری ہے۔ بس مجبوریوں کی صورت بدل گئی ہے۔۔۔ عورت ذات وہی ہے۔"

"اس مجبوری کو اُتار پھینکوں گی۔ میں ابارشن کروا دوں گی۔" غزل جان کمبل چھوڑ کر سلیپر گھسیٹتی سنک میں جا ڈکرانے لگی۔

"نہ کملی نہ جھلی! یہی تو سانجھ ہے تیری۔ مرد تو رہ گیا پیچھے وطنوں میں وجود کی تنہائی اِسی سانجھ سے کٹے گی۔ اِس سانجھ سے کبھی منہ نہ موڑنا ورنہ ساری باقی عمر کے خواب ڈراؤنے ہو جائیں گے۔ پاک ہوتے ہوئے بھی بار بار ہاتھ دھوئے گی۔ خود اپنے آپ سے باتیں کرتی رہے گی پر جواب نہ پا سکے گی۔"

غزل جان کو جس آ کاس بیل نے لپیٹ لیا تھا۔ اُس کے شکنجے میں دم گھٹتا تھا جو اسی کا لہو چوس کر پھول پھل رہی تھی۔ وہ پورا مہینہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے منصوبے بناتی رہی۔ ہر روز وہ ایک چٹ لکھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتی۔

"کل اس ان چاہے کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔ کل اس کے ساتھ مزید کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے گا۔"

ان چٹوں کی تعداد پوری تیس ہوگئی، جو شاید ایک دوسری سے سمجھوتہ کیے ہوئے تھیں۔ جس چارج شیٹ کو اس نے اپنے ہاتھوں تحریر کیا تھا وہ اب خود اُسی کے خلاف استعمال ہو رہی تھی، جیسے جیسے ان کا ڈھیر بڑھتا جا رہا تھا وہ ان کے بوجھ تلے دبتی چلی جا رہی تھی۔ تیس راتوں کی یہ چٹیں رینگنے اور شوکارنے لگیں، جیسے سنپولیے اُسی کے پالے ہوئے اُسی کو ڈسنے لگے ہوں۔ الٹ کر ہاتھ مارا اور

سبھی کو ڈسٹ بِن میں پھینکا۔

ہسپتال پہنچی تو یہ لفظ جیسے تالو سے نکل کر زبان پر چپک گیا ہو، جیسے لفظ ''ابارشن'' اس قانونی حمل کو غیر قانونی بنا دے گا۔ اس جائز کو ناجائز قرار دے دے گا۔ اِس باپ والے کو حرامی کے درجہ پر لے آئے گا۔ مشرقی روایات کو مشکوک کر دے گا۔ اُس کے کنوارے بدن پر بدکاری کا الزام ثابت ہو جائے گا۔ پھر لوگ اُسے سنگ سار کر دیں گے وہ اپنی پلوٹھی کی اولاد کو کوکھ میں لیے ہی مر جائے گی۔

گئی تو وہ حمل گرانے تھی لیکن جب باہر نکلی تو ایک ایسے بچے کا بوجھ اُٹھائے ہلکی پھلکی سی تھی۔ جسے اب برٹش نیشنیلٹی لے کر پیدا ہونا تھا، جس کے باپ کے خانے میں ''عثمان خان'' لکھا گیا تھا اور اب اِس بچے کو بحفاظت پیدا کروانے کی ذمہ داری یہاں کے قانون اور ریاست نے خود اپنے سر لے لی تھی۔

اب تو وہ چاہتے ہوئے بھی اسے خود سے جدا نہیں کر سکتی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بحفاظت پیدا کرنے کی مجبوری اُس پر لاگو کر دی گئی تھی کہ یہ اب اُس مُلک کا شہری تھا، جو اپنے باشندوں کی حفاظت کے لیے واہموں اور وسوسوں پر بھی ٹرائیگر دباتے رہتے ہیں اور مستقبل بعید میں بھی پیدا ہونے والے متوقع دُشمنوں کے ہیولوں کا قلع قمع کرتے رہتے ہیں۔ وہ اُلٹیاں ڈکارتی چھپکلی کی کٹی دُم کی طرح تڑپتی رہی، لیکن اُس کے اندر رکھے سنپولیے کا بیج اُسے چاٹتا رہا۔ وہ نچڑتی رہی پیٹ پھولتا رہا کہ اُس نے خود اپنے ہاتھوں اسے قانونی تحفظ دلا دیا تھا۔ اب وہ پیٹ پر مکّے مارتی تو بھی اُسے کچھ نہ ہوتا۔ بڑی بڑی چھلانگیں لگاتی سیڑھیاں اُترتی چڑھتی لیکن وہ تو کسی حرامی نطفے کی طرح ڈھیٹ اور بے شرم واقع ہوا تھا۔ وہ جتنی مشقت کرتی وہ اُتنا ہی مضبوط ہوتا چلا جاتا۔ وہ جتنی نفرت کرتی وہ اُتنا ہی پیارا ہوتا چلا جاتا۔

جسبیر کور دیسی ٹوٹکے آزماتی رہی، وہی ٹوٹکے جو اُس گراں میں بھی اُس پر ضرور آزمائے جاتے اگر وہ وہاں یہ وقت گزارتی تو پھوپھیاں چاچیاں یہی بھانڈے اور پنجیریاں دیسی گھی اور چہار مغز میں بھون بھون بناتیں۔ یہی سونف سنٹھ تلسی صندل۔ وہ جسبیر کور کے سامنے تو منہ بھر لیتی

لیکن پھر بہانے سے ہاتھ رُوم میں اُلٹ آتی۔ موسم گرما اپنی خوشگواریت تبدیل کرنے لگا تھا۔
آسمان سلیٹی اور دُھواں رنگ رہنے لگا۔ دُھند اور بادلوں کے مرغولے تازہ تازہ اُون کے گولوں کی طرح بالکونیوں، کورٹ یارڈ اور پارکنگ میں ٹھنسے رہتے۔ ویسا ہی اُون جس سے غزل جان کی ماہر اُنگلیوں میں چھوٹے چھوٹے سویٹر، موزے، ٹوپیاں بنے جاتے۔ آٹھ دس گھروں والی مشکل بنتی۔ جب مکمل ہو جاتے تو وہ اُنھیں یوں چپت مُکا مارتی، جیسے شرارتی بچے کو سرزنش کرتی ہو۔

ساتھ والی بالکونی میں ہاٹ کورا اپنے منگیتر کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی۔ وہ ابھی تک شادی کی پابندیوں سے باہمی کشش کو ماند کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ وہ ابھی بھی ایک دوسرے کی تسخیر کے درپے تھے۔ بالکونی میں بادل بھرے تھے جن کے سلیٹی پھاہوں کی چلمن میں سے وہ دونوں دائرے اور لہریے سے بناتے تھے، جیسے ناگ اور ناگن ایک دوسرے سے کھیلتے ہوں۔ ست رنگے منکے پھینکتے اور دبوچتے ہوں، دبوچتے اور پھر پھینکتے ہوں پر کبھی تھکتے نہ ہوں۔ ایک وہ کہ دو تین راتوں میں ہی نئے بیج کی پرداخت کی ذمہ داری اوڑھے ممنوعات کی ذیل میں چلی گئی تھی۔ جس نے پیٹ کے اندر پوری کروٹ بدلی، جیسے اپنا احساس کروا کر اُسے سرزنش کر رہا ہو۔

اندر ٹیلی فون بج رہا تھا۔ بجتا رہا۔ وہ جانتی تھی اسی کا باپ ہے جو دن میں کئی بار اس کی خیریت معلوم کرتا تھا، لیکن جس کی کوکھ میں وہ پل رہا تھا، شاید اُس کا نام لیتے ہوئے بھی شرماتا تھا اور وہ خود بھی اس کا حال کبھی نہ بتاتی۔ اگر اکیلی ہوتی تو کبھی ریسیور نہ اُٹھاتی جواب بھی بجے جا رہا تھا۔ اُس گراں میں وفا اور نبھا کا سلسلہ شاید سات سمندر پار نہ کر پایا تھا۔ رستے میں ہی کہیں تند ٹوٹ جاتی تھی۔ کتنے تھے جو اپنے نطفے کسی کوکھ میں چھوڑ آتے لیکن یورپ کی برف اور بادلوں میں دفن کبھی کوئی لگاؤ یا تعلق کا تار نہ جڑا...... پھولے ہوئے پیٹوں والیاں آنسوؤں کی مالائیں گوندھتی انتظار کے موتی پروتی، صرف مائیں رہ جاتیں۔ وہ اُون سلائیاں تیزی سے چلانے لگی۔

وہ یہ بچہ یہاں جنے گی ایک بار واپس بھی جائے گی اور دو چار روز میں ہی پلٹ آئے گی۔ وہ اُسے دیکھے گا چند روز اُس سے کھیلے گا بھی۔۔۔ پھر وہ اُس سے یہ عزیز ترین کھلونا چھین کر لوٹ

آ ئے گی، پھر اُس وقت لوٹے گی جب وہ جوان ہو چکا ہوگا اور اس کا باپ بوڑھا۔۔۔لیکن خود وہ جسبیر کور کی طرح سدا جوان۔تب وہ اس بچے کو اُس کے اجنبی باپ کے منہ پر لے جا کر مارے گی جو پوچھے گا۔

"Who is he mom."

اِس منصوبے کی تکمیل کی شدت میں دن سرعت سے گزرنے لگے تھے۔اِس پہاڑ سے وقت کو اس پُر ہیجان مصرف کے پر لگ گئے تھے کہ اُڑانیں بھرتا رہتا ستاتا کبھی نہیں۔

پاکستان سے آنے والے ٹیلی فونوں کی چیخیں زیادہ بے چین اور کرب ناک ہوتی چلی گئی تھیں جنھیں اُس نے ایک بار بھی نہ سنا تھا۔البتہ اصغر خان گھنٹوں لمبی لمبی تسلیاں اور تشفّیاں کرواتا رہتا۔

''فکر نہ کرو اللہ خیر کرے گا جلد ہی اچھا وقت لائے گا۔ان شاء اللہ جلدی ہی۔۔۔''

اُس کے ہاتھوں میں اُون سلائیاں زیادہ سُرعت سے چلنے لگتیں۔گنجلک بنتی بگڑنے لگتی وہ بن بن کر اُدھیڑتی بڑبڑاتی۔

''جلدی نہ دیکھ پائے گا ان شاء اللہ۔''

ڈاکٹر وِزٹ کرتی،خوراک ورزش واک احتیاطی تدابیر بے شمار۔۔۔جیسے یہ بچہ نہ ہو کوئی فوق البشر پیدا ہونے والا ہو۔آخر دُنیا جہاں کو روندنے والے لاکھوں قتال جائز قرار دینے والے یہ گورے ہر نئے پیدا ہونے والے بچے کا استقبال ایسے کیوں کرتے ہیں،جیسے یہی بچہ اِس دُنیا کا آخری باشندہ ہو۔اسی سے نسلِ انسانی کی بقا مشروط ہو،جب وہ ہسپتال میں درد جھیل رہی تھی تو سبھی یوں الرٹ تھے،جیسے کوئی خلیفتہ الارض وجود لانے جا رہا ہو کہ اُس کے سواگت کے انتظامات میں کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔

اُسے اتنا معلوم ہوا تھا کہ اب نارمل ڈلیوری کا اِرادہ ترک کر دیا گیا ہے اور سیزیرین کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

نرس نے اُس کے چہرے سے تکلیف اور مشقت کے پسینے سے بھرے بال ہٹاتے ہوئے

مسکرا کر کہا تھا۔

''بچے کے باپ کے سائن کا انتظار تھا اب سائن مل گئے ہیں بس ابھی پندرہ منٹ میں تم ماں بن جاؤ گی۔عورت کے سب سے عظیم درجے پر فائز ہو جاؤ گی۔''

تکلیف کی شدت سے وہ اُس کی تصحیح بھی نہ کر سکی کہ یہ بچے کا پاپا نہیں گرینڈ پا ہے۔

جواب دینے سے پہلے ہی وہ لمبی مدہوشی میں چلی گئی تھی۔سبز چوغوں اور نقابوں میں لپٹے فرشتے جیسے جنت کے دروازے کھول رہے ہوں۔جن کے قدموں سے سفید روئی کے پاکیزہ پھاہے لپٹے ہوں اور جو کسی مسیح موعود کے ظہور کے منتظر ہوں۔جب وہ ہوش اور مدہوشی کے بیچ معلق تھی تو اُس کے کانوں میں ایسی آوازیں پڑنے لگی تھیں جیسے اُس گراں کے نشیبوں سے جنات کی آوازیں اُبھرتی تھیں۔کبھی ڈھولک کی تھاپ پڑتی کبھی جننیاں خوشی کے گیت گاتیں۔مخصوص پوٹھواری لہجے میں باریک تیز چیختی آوازوں کی بھنبھناہٹ جیسے رتھ کے خشک کنویں میں چمگادڑیں بولتی ہوں، پوٹھواری چمگادڑیں لجلجے پر جھنکارتی پروازیں بھرتی ہوں۔

''ناں کے ہوسی'' (نام کیا ہوگا) یہ قدیم پوٹھواری لہجہ اصغر خان کا تھا۔

''مہر النساء دادی نے نائے تے رکھی چھوڑوس چاچا جی۔۔۔'' (دادی کے نام پر اس کا نام رکھ دیں۔)

یہ آواز چپے چپے سے ٹکراتی کلعام ریلوے اسٹیشن کی پٹڑیوں میں جھنجھناتی سات سمندر کیسے پاٹ آئی تھی۔

نیم غنودگی یوں چھٹ گئی جیسے بم کے دھماکے کی گونج سے، قریب المرگ مریض ہسپتال کے بستر سے چھلانگ لگا بھاگا ہو۔اُس نے پوری جاگتی آنکھوں اور بیداری کے بے انتہا خبردار دماغ کے ساتھ گردن گھما کر دیکھا۔

عثمان۔۔۔عثمان خاناں۔۔۔

یہ نیم بے ہوشی کا خواب نہ تھا۔وہ سات سمندر روند آیا تھا اور اب اُس لوتھڑے کو اپنے

ہاتھوں میں اُٹھا رکھا تھا، جس کا ایک ایک نقش اُسی کی شبیہ لیے تھا لیکن رنگت یورپ کی برفوں سے مستعار تھی۔ جیسے ذرا سی برف کا گولا جس پر پوٹھواری نقوش ٹانگ دیئے گئے ہوں۔

غزل جان کو لگا وہ شکست کھا گئی ہے۔ اس بچے کی پیدائش کے وقت جسے نہیں موجود ہونا چاہیے تھا۔ وہ آن موجود ہوا تھا۔ اِس لیے کہ یہ بچہ انگلینڈ کی نیشنلٹی لے کر پیدا ہوا تھا۔۔۔ جب کبھی وہ خود پیدا ہوئی تھی۔۔۔ تو اُس کا باپ۔۔۔ کہاں تھا...... گراں میں ہر چھلے والی عورت کے لیے مخصوص (دھمائیں والی) کوٹھری میں صنوبر جان نے کتنے دنوں اُسے آنکھ بھر کر نہ دیکھا تھا کہ اصغر خاناں آ جائے گا تو دونوں مِل کر یہ تعین کریں گے کہ کون سا نقش کس پر گیا ہے، لیکن جب وہ دوسری بار لوٹا تو غزل جان جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی اور جب آخری بار پلٹا تو چھوٹی مریم جان بیاہی گئی تھی۔ ٹھیکرے کی مانگ جس کا چچیرا شوہر مشرقِ وسطیٰ کی کمائیاں سمیٹنے کو جا چکا تھا اور وہ آسمانوں پر سے گزرتے جہازوں کا شمار شروع کر چکی تھی۔

غزل جان کو لگا کوئی زلزلہ سا آیا ہے اور مدافعیت کی زمین اُس کے قدموں تلے سے کھسک رہی ہے، تبھی اُس پر عجب عقدہ کھلا کہ وہ خالی ہاتھ نہیں ہے۔ اس کے پاس ایک جوابی پتھر موجود ہے۔

اُس نے پوری قوت سے دفاعی وار کیا۔

''نہیں اس کا نام ہوگا ''تاج''

''پر یہ تو لڑکی ہے تاج لڑکوں کا نام ہوتا ہے۔''

عثمان خان اُس سے مخاطب ہونے کی مردانگی شاید اس بچی کے وجود سے کشید کر رہا تھا۔

''تاج۔۔۔تاج محل۔''

اس برٹش نیشنل کے فیصلے سے اختلاف کی کسے جرأت ہو سکتی تھی، جو فیصلہ سنا کر پھر نیم بے ہوشی میں چلی گئی تھی جس کے نیم وا لبوں پر تسبیح کے دانے تھر کتے تھے۔

''تاج۔۔۔تاج۔۔۔تاج محل۔''

چودھری محمد اکرم VS NZD

ساتھ والی بالکنی کی ماجی نے سیاپا ڈال رکھا تھا ''اوئے ڈاگ کے سن سروچ ہیڈک ہو رہی ہے۔ بند کر اس مدر کوڈے اینڈ نائٹ اس گوری رن کا سیاپا۔۔۔''

چیختی آواز میں مائیکل جیکسن کی مون واک کی نقل میں مصروفِ رقص دونوں لڑکے اپنے پیروں پر یوں آگے پیچھے ہٹتے بڑھتے تھے، جیسے یہ فرش موم کا بنا ہو۔ اُن کے پیروں کے تلوؤں سے تو چپکا ہو لیکن متحرک حالت میں ہو۔ وہ جتنا آگے بڑھتے ہوں اُس سے زیادہ پیچھے ہٹتے ہوں۔

غزل جان ہنس دی۔

''مدر نہیں ماجی فادر کہیں۔''

''یہاں ایک ہی ہوتا ہے۔ ایک جیسا ہی فادر کہ مدر۔''

غزل جان نے سوچا، ماجی سچ ہی تو کہتی ہیں۔

''Single Parents'' جب بوجھ ہو جائیں ایک دُوجے پر تو پھر اپنی اپنی آسان راہ Single کے Single۔

دو دو تو وطنوں میں ہوتے ہیں۔ پکے گوڑھے ہمیشہ ساتھ ساتھ کبھی نہ چھٹنے والے بس

موت ہی جنھیں الگ کر سکتی ہے۔ بیچ میں چاہے کیسی چٹان آن گرے ایک ایک ہاتھ پیر دھنسائے ساتھ ساتھ کھڑے رہتے ہیں۔ کسی درد تکلیف کا اظہار کیے بنا۔ چاہے اظہار چہرے کی بوسیدگی سے واضح ہوتا رہے، جیسے پڑا پڑا کپڑا چھدتا ہے، پڑا پڑا کچرا بو مارتا ہے۔ پڑی پڑی آلائشیں گلتی سڑتی ہیں لیکن پڑی رہتی ہیں۔ اپنی اپنی جگہ پر دفن ہوتی رہتی ہیں۔ مزید کوڑے کرکٹ سے آلائشوں سے بھرنے کے لیے۔ غزل جان تو نئے عہد کی اِنقلابی لڑکی ہے۔ اُس نے اپنا ایک ایک ہاتھ پیر چاہے چٹان کے بھاری بوجھ تلے دفنانے سے بچا رکھا ہو، لیکن دونوں کے بیچ یہ کیسا موم جامہ منڈھا ہے وہ ملتے تو ہیں لیکن دونوں کے بیچ پولی تھین کی تہ لگی ہے۔ جو خراش تو ڈالتی ہے پر سمونے نہیں دیتی۔ اِک دُوجے میں خلط ملط ہو کر بھی اپنی اپنی حد بندی برقرار۔۔۔ دونوں لڑکے مسلسل پیر آگے پیچھے پھسلا رہے تھے۔ مون واک۔۔۔ سیاروں ستاروں میں جا بسنے کی عجب چاہ۔ یہ یورپ بھی تو پاکستانیوں کے لیے ایسا ہی مون، جس پر کششِ ثقل کی بجائے موم جامہ منڈھا ہے۔ جتنا آگے بڑھتے ہیں اُتنا ہی پیچھے کھسکتے ہیں۔ یعنی عمر بھر کی مسافت وہی چار قدم۔۔۔ یہ ماجی اس کرّہ چاند پر پیدا ہونے والے بچوں کی مون واک کو کیا سمجھیں۔۔۔ جنھیں یہاں لایا تو انہی بچوں کی دیکھ ریکھ کے لیے گیا تھا لیکن وہ جلد ہی بال و پر نکال لائے اور اُن کی چھتری سے اُڑ نکلے اور وہ بوسیدہ چھتری کے سایے میں کھڑی آ آ کرتی باجرے کے دانوں سے خالی کٹورہ سر پر بجاتی رہ گئیں۔ آ آ آ ھائے لٹ گئی ھائے پٹ گئی کے بین میں نجانے کب تبدیل ہوگئی، لیکن اُڑ چکے کبوتر اُن کی چھتری پر واپس پنجے نہ گاڑتے تھے۔ مصنوعی آکسیجن ماسک لگائے خلا بازوں سا مصنوعی لباس پہنے یہ بچے جو اپنے قدموں چلتے نہیں بس آگے پیچھے سرکتے ہیں۔ اُنھیں کیا معلوم ماجی کس قدرتی آکسیجن، قدرتی زمین پر مضبوط قدم جمائے رہی ہیں۔ یہ فائبر، نائیلون، پولی تھین، گلاس شیشے سے بنی کائنات کتنی اجنبی تھی اُن کے لیے مریخ جیسی کہ چاند جیسی۔

اب ماجی بال نوچنے اور بین ڈالنے لگی تھیں۔

''کتنا بیڈ لک تھا جس روز گوروں کے کنٹری کا ویزہ لگا تھا۔ اللہ جی کبھی نہ لگاتا۔ خوشی میں

کتنا سیڈ چھپا تھا۔ لائف ڈسٹرب ہوگئی پتہ ہوتا تو کبھی نہ وڑتی اس ٹھنڈی گور میں۔ راجہ سلطان محمود کی نسلیں اب گوروں کی نسلیں ہو گئیں، جنھیں ہم وطنوں میں چوہڑے عیسائی کہا کرتے تھے۔ آج ہم اُن کے لیے چوہڑے عیسائی ہو گئے۔ وہ مسلمانوں جیسے ہو گئے ہم عیسائیوں جیسے ہو گئے۔ گورے بننے کے شوق میں بن گئے چوہڑے اُن کا گند ولورنے والے بھنگی۔''

غزل جان ماجی کے معصوم دُکھ میں سے چھلکتی ایک بڑی دانش پر حیران رہ گئی۔ ان تارک الوطن مہاجروں کے لیے نفرت کے نام کتنے یکساں ہیں۔ چوہڑے مسلی، سکھڑے، مسلے، بنیے، گورے لنگور، فرنگی...... ہر قوم اپنی اقلیتوں کو تارک الوطن کو حقیر کہتر گھس بیٹھیے سمجھتی ہے تو ایک جیسے ہی نام اور مقام دیتی ہے۔ یہ بچے جو مغربی معاشرے کی گود میں چڑھنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں تو یہ کلوننگ اُنھیں کیسا ہی تبدیل کر دے پھر بھی بحرانی کیفیت سے دوچار ہیجڑے کے جیسے۔۔ وہ اپنے وطنوں میں مرد عورت کی ابنارمل تقسیم میں تماشا بن گئے یہ بھی ان اجنبی خطوں میں ابنارمل تقسیم میں، ہیجڑے کے جیسے۔ نامکمل ادھورے، آدھا سچ، اب تو وطنوں میں بھی پورا سچ اُن سے چھن گیا تھا۔ وطنوں میں کالے انگریز ولائتی، امریکی، یہاں کالے ایشیائی، بلڈی پاکستانی۔ اس چاند سرزمین کی موم جامہ منڈھی سطح پر پیر جمتے ہی نہ تھے۔ ناک نقشے سدا چغلی کھاتے رہیں گے۔ وہ بات بہ بات پکڑے جاتے رہیں گے۔ کسی بلوے، چوری، ڈکیتی، دہشت گردی کا الزام سدا انہی بے وطنوں پر ہی رہے گا۔ کتنے قابلِ نفرین، کمتر نسل، حقیر ذات۔ گالی کے جیسے اُن کی معاشرت اطوار، رسم و رواج سب گھٹیا، اُن کی شکلیں، جسامتیں سب مضحکہ خیز۔ اُن کے لہجے تلفظ بھی قابل اعتراض۔ کتنی نسلیں گزر جائیں وہ اپنی بولیاں، شناختیں تہذیب، مذہب سب چھوڑ دیں پھر بھی فاصلے پر ہی کھڑے رہیں گے، جیسے نوکر ملازم مالکوں کو کھانا کھلاتے خدمتیں کرتے لیکن اُن کی غمی خوشی میں فاصلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آنسو بہاتے یا تالیاں بجاتے۔ اجنبی غیر، خارجی باہری ایلین، پناہ گیر مہاجر۔

خود چاہے وہ سب بھول جائیں، لیکن جب بھی وچول ہوگی۔ ہر الزام کا ہدف صرف یہی

ہوں گے۔ مفسد، گرہ کٹ، جاسوس، اُس معیشت پر بوجھ اُس زمین کے فسادی، ذلیل کمینے، بے جڑ، بے بنیاد، یہ وطنی یہ Native اُن کے منہ پر دے ماریں گے۔ اُن کی ساری درآمدی گندگیاں اور غلاظتیں یہ تارک الوطن ہمیشہ اپنی غلاظتوں اور الزاموں کے ہمراہ جئیں گے۔ گندے، اُجڈ، بدتہذیب، ہرتہذیب میں گھسنے والے ان چاہے۔ چوہڑے مسلی...... عجب طنطنہ اور زعم ہے ان وطنیوں کا۔ یہ بے وطن سب حاصل کرنے کے باوجود کس قدر کنگلے، ذلیل، منگتے، وطنیوں کے رحم وکرم اور ٹکڑوں پر پلنے والے۔ جب چاہیں مجرموں کی فہرست میں لے آئیں انہیں۔ غزل جان نے سوچا عجب المیہ ہے یہ بھی...... پچاس برس گزرنے کے باوجود ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کو ہندوستانی کہا جاتا تھا یعنی جس پاکستان کی خاطر سب چھوڑا کہ اپنے نئے وطن میں آزاد، باشندے بن کر رہیں گے وہاں بھی کہلائے ہندوستانی، ہندوستوڑے، مہاجر پناہی اُن کی زبان معاشرت تو پھر بھی ملتی جلتی تھی۔

یہاں کیونکر امریکی کہلا سکتے ہیں۔ زبان سیکھ کر بھی لہجہ چغلی کھاتا ہے۔ لباس پہن کر بھی بدن اکڑتا نہیں ہے۔ وہاں کی خوراک کھا کر بھی آنکھوں اور بالوں کا رنگ بدلتا نہیں ہے تو پھر درخت تو اپنی مٹی میں جڑ مارتا ہے۔ گملے کی مٹی میں نہیں۔ عجب المیہ ہے کہ بدل جانے کی تمام تر تگ ودو کے باوجود کچھ نہیں بدلتا۔ یہ تبدیلی اِتنی کیوں مشکل ہے۔ انسانوں میں نسلوں میں، موسم پھول پھل دن رات کتنی سہولت سے بدل جاتے ہیں۔ زمینیں، زمانے، وقت، تقدیر، حد مذہب بھی تبدیل ہو جاتے ہیں، کوئی نہیں پوچھتا کہ پیچھے سے سکھ رہے ہو، ہندو رہے ہو۔ پر پوچھتے ہیں۔ پیچھے سے کہاں کے ہو، کس ذات برادری سے ہو، قومیّت وطنیت کی جڑیں جیسے زمین کے اُس حصے میں گڑھی ہیں جہاں سلسلہ ہائے کوہ ایستادہ ہیں۔ سب بدل جاتے ہیں۔ زمینوں کا جغرافیہ پہاڑوں، دریاؤں، سیاروں، ستاروں کی ہیئت تک بدل جاتی ہے۔ نہیں بدلتے تو انسانوں کے بیچ نسلوں کے تفرقے، یہ زمین، جغرافیہ، کیوں اِتنے شدید ہیں۔

قدرت نے بھی عجب کھیل کھیلا۔ ایک نسل کے اندر اِتنی نسلیں، آدم زاد کے اندر اِتنے آدمی۔

ایک آدمیت کے اندر اتنی آدم بو۔ قدرت نے بھی اپنی کائنات کے ہنگاموں کا کیسا بندوبست کر دیا ہے۔ ''اختلاف'' یہ بندوبست جو مسلسل جاری رہتا ہے کبھی تھک کر آرام نہیں کرتا۔ کبھی کہنگی کا شکار ہو کر نہیں مرتا۔ سب سے سنگین اور برحق سچ، وطنیت اور نسلیت۔ یہ مذہب عقیدے، فرقے تو ادھورا سچ ہے۔ اصل سچ تو نسل اور جغرافیہ ہے۔

غزل جان زرتاج کو نہلا کر باتھ ٹاول میں لپیٹ لائی تھی۔ ''ماجی کیوں کھپ رہی ہو۔ مان جاؤ جو نیا زمانہ منوانا چاہتا ہے۔'' غزل جان کہنا چاہتی تھی پر کہا نہیں کہ یا پھر کوچ کر جاؤ ان بے رحم زمینوں سے، لیکن کہاں قبولیت کے زمانے تو لد گئے، نہ دیس اپنے نہ پردیس۔

واحد امان مٹی جو سینہ کھول دے گی۔ اجنبی مٹی سمو تو لے گی لیکن وجود کی مٹی اس مٹی کے خمیر سے ہم آمیز ہونے میں تکلیف محسوس کرے گی۔

اپنے دیسوں کی نرم گرم مٹی ماں کی آغوش جیسی آغوش تو یہ بھی ہے لیکن سوتیلی ماں، غیر بے رحم۔ اس نسل کی عجب خواہش اپنی مٹی میں دفن ہونے کی خواہش۔ اپنی مٹی کے ساتھ سُرمہ بننے کی خواہش۔

''کتی کے جنے میرے سر پر کیوں ناچ رہے ہو۔'' یہ بچے اس بے رحم اجنبی زمین جیسے غیر اجنبی تکلیف دہ بے رحم۔

وہ اپنے بال نوچنے اور بین ڈالنے لگیں۔ اُن کے سر کے بیچوں بیچ گنج بن چکا تھا۔ وہ اپنا ڈپریشن بال نوچ نوچ کر سر کے خالی مساموں سے خارج کرتی تھیں۔ سفید بُراق بالوں کے بیچ دائروں میں سفید جلد خالی تھی، جیسے برف زار جیسے فلیٹ کے باہر سڑکوں کے کنارے برف سے لدے ہوئے۔ جن کے بیچوں بیچ گزرتی گاڑیوں کے شیشے سفید پھوار سے بھرے ہوئے۔ سامنے پارک میں بلند قامت سنٹا کلارک لال چغہ اور سفید ٹوپی میں چھپا ہوا۔ غیبی تحائف دینے والا، نوازنے والا، اچانک خوشی دینے والا۔ یہ دیس بھی عجب بظاہر دیتا ہے بباطن چھین لیتا ہے۔

برفوں کے دیس میں ٹھنڈی برف سی پھیکی، بے رس جلد، یخ دھوئیں چھوڑتی ہوئی۔ سفید

جلد، نرم سرد بے جان دیسوں والی سنولاہٹ جو حدت ہے۔ گرم سرگرم اس حرارت بھری سنولاہٹ کو بھی یہاں کی فضائیں چھین لیتی ہیں، پھر وہی بے جان ٹھنڈی برف، مچھلی سی رنگت مساموں میں اُنڈیل دیتی ہے۔ اپنی آبائی رنگت کا وقار بھی چھین لیتی ہے۔

مردے کو تادیر محفوظ رکھنے والی برف لاش سی نیلاہٹ بھری، سردخانے میں محفوظ پرانی لاش۔ یہ سردخانہ سی زمین لاشوں کو بہت دیر محفوظ رکھتی ہے۔ مردے خراب نہیں ہونے دیتی۔ ان کے وارثین انھیں قبولنے سے چاہے انکاری ہو جائیں لیکن یہ نیلے پھر وجود جیئے جاتے ہیں جنھیں زندہ رکھنے کے جتن بہت ہیں یہاں، ان کی سائنس، طب رفاحی ادارے، میوزیم آرکائز......

دیسوں میں جینے کے مصنوعی حربے جتنے کم ہیں، زندہ رہنے کی دل جوئیاں اُتنی ہی زیادہ پیار کرنے کو پوتے دوہتے لڑنے کے لیے جھگڑنے کی مصروفیت، بیویاں اور بہوئیں، نندیں ساسیں رُعب ڈالنے کو داماد پوتیوں دوہتیوں کے شوہر، گلے شکوے کرنے کو پڑوسنیں۔ بڑوں سے غفلت برتنے کو شریکنوں کے طعنے یہ کیا کہ کوئی شریک کوئی پڑوسی کوئی منہ پر مارنے کو لعن طعن کرنے کو موجود ہی نہیں ہے۔ دیسوں میں تو شرموشرمی لوکائی کے خوف سے ہی خدمت کرنے پر مجبور۔۔۔ یہاں لوکائی ہے ہی نہیں صرف دل سے مرضی سے اپنے رحم دلانہ جذبات سے، مجبور ہو کر خدا اور لوگوں کے خوف سے نہیں، ورنہ لاپرواہ بے خبر۔

عجب دیس ہے، اتنی مشینیں اتنی دوائیاں اتنے ہسپتال، موت کا وقار بھی چھین لیتے ہیں بھرا میلہ چھوڑ جانے کی حسرت بھی اچک لیتے ہیں، پیچھے والوں کے دلوں کی تشنگی بھی نہیں رہنے دیتے۔ اوب ڈالتے ہیں۔ بس جیئے جاؤ، رہے جاؤ مشینوں کے ہمراہ، دوائیوں کے سنگ ہسپتالوں کے ساتھ۔ انسان صرف معالج یا پھر این جی او، ورکر......خیال کرنے والے رشتے قلبی وابستگیاں محبتیں اسی برف زار میں دفن۔ گرم علاقوں والے گرم جذبات بھی اسی برف زار میں جمے ہوئے قلفی۔۔۔ جیسے یہ مون واک کرتے لڑکے، دیکھ ہی نہ پا رہے تھے کہ یہ بوڑھی دادی اُن کی وجہ سے کتنی تکلیف کا شکار ہو چکی ہے۔

غزل جان اپنا ڈیپریشن میدے کی پرات میں دونوں گھونسے چلا چلا کر خارج کرنے لگی۔

ماربل کے شیلف پر دھری پرات مسلسل اُچھل کود کر رہی تھی، جیسے مون واک کرتی ہو۔

جسبیر کور نے بالکونی میں سے منہ باہر نکالا۔

''کی ہویا گڈی۔''

''ہوا ماں کا سر۔۔۔''

آج چھٹی کا دن تھا۔ عثمان خان ٹیکسی لے کر صبح صبح ہی نکل گیا تھا۔ بظاہر ڈیپریشن کی یہ کوئی وجہ نہ تھی۔ اُسے کونسا وقت گزاری کرنا تھی اُس کے ہمراہ...... چائے کے کپ پر چھٹی کا ایک پہر صرف اس لیے گزارنا کہ ایک دُوجے کو محسوس کیا جا سکے۔ قریبی شاپنگ مال سے ہفتے بھر کا سودا سلف اکٹھے خریدنا کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے اِنتخاب اور قیمتوں پر بحث و تکرار سے وجود کے بڑے بڑے گڑھے ان ذرا ذرا باتوں کی بھل سے بھر سکیں۔ جیسے ہلدی تیل بڑے بڑے زخموں کے لیے کار آمد ہو جاتا ہے۔ رُوحانی مالش، دبانا، ہاتھ کا لمس، سانسوں کی گرمی کتنے عوارض کا علاج...... یہ دم پھونک تعویذ دھاگہ، عمل چلہ، کتنے نفسیاتی امراض کا شافی معالجہ، لیکن اُسے تو ان میں سے کسی کیفیت سے نہ گزرنا تھا۔ دن کی روشنی میں تو وہ کبھی ایک دوسرے پر نگاہ بھی نہ ڈالتے تھے۔ وہ رات کے اُس پہر میں لوٹتا جب وہ سوئے ہونے کی ایکٹنگ کر رہی ہوتی لیکن شدید بیداری ہر ہر اعضا پر پھٹی پھٹی آنکھیں اُگا دیتی جیسے عدسی شیشے چڑھائے سارے وجود پر کھلی آنکھیں شدید اِنتظار کی کڑی دھوپ کی سولی پر چڑھی ہوں، تب اُسے محسوس ہوتا کہ باورچی خانے میں رکھا سالن روٹی اوین (Oven) میں گرم ہوا ہے پھر وہ بیڈ پر آ کر لیٹا ہے۔ کبھی سو گیا ہے اور کبھی ایک دو کروٹیں بدلنے کے بعد اُس کے بیڈ پر رینگ آیا ہے۔ شروع شروع میں تو وہ دھتکار دیتی۔ تاج کو اُٹھا کر پیٹ پر لٹا لیتی، سوئی ہوئی بچی بات بننے سے انکاری ہو جاتی۔ دھاڑ دھاڑ رونے لگتی اور وہ دم دبا کر ناکام چوہا سا واپس اپنے بل میں رینگ جاتا اور کسی ہزیمت کسی غصے یا شرمندگی کے احساس سے عاری اگلے ہی لمحے خراٹے لینے لگتا۔

وہ تو سو جاتا لیکن وہ شدید بیداری کی سولی پر ٹنگی رہ جاتی۔ وجود کے سبھی مساموں سے زہر

پھوٹتا۔ روم روم پر کانٹوں کے تار اُگ آتے جو ذرا ذرا چھید تے، قطرہ قطرہ لہو نچڑتا۔ خلیات ٹوٹتے رخساروں کی جلد ڈھلکتی۔ اگلی صبح اُس کا چہرہ ساتھ والی ماجی جیسا بوڑھا ہو چکا ہوتا۔ شب بھر کی لمبی مسافتوں کی دھول میں مسمار ناک نقشہ، کرخت مسام کھدا موٹا چمڑا۔۔۔رت جگوں کا سنٹھ، جلد کی نرمی اور لچک کو ہڑپ لیتا۔ بدشکل بڑھیا، چڑچڑی سنکی، شوہروں کے ہوتے ہوئے بھی عمر بھر تنہا راتیں بسر کرنے والی پوٹھوہار کی عورتوں جیسی مرغی بکری کو طعنے دینے والیاں۔ ماتھے پر تفکر کی سلوٹوں کا بوجھ اُٹھائے فضاؤں میں سے گزرتے جہازوں کو نااُمیدی سے دیکھنے والیاں سنٹھ جلد اور پھیلے ہوئے کولہوں میں سمٹی ساس نندوں میں گھری چارپائی پر شب بھر کسی آہٹ کی منتظر، شاید کوئی بیٹھک کے حصار کو توڑ پائے لیکن خود چل کر اُن کے پاس آنے والا کوئی نہ ہوتا۔ بس کبھی کسی شب محافظوں کی غفلت پیشاب کا بہانہ بنا دیتی ورنہ تو پیشاب کے لیے بھی پورا گروہ ساتھ میں جاتا کہ لچی کنجری گندگھول نہ آئے۔ ان تنہا راتوں کی عفریت چہرے پر تھوپے پھر اس نے مزاحمت چھوڑ دی۔ اُسے درست اور چالو حالت میں رہنے کے لیے اس مرمت اس اُوور آلنگ کی ضرورت تھی۔ بصورتِ دیگر ناکارہ مشین، غلاظت بھرا متعفن کمرہ، بدبو مارتا کچرے کا ڈھیر۔۔۔ اس سے کیا کہ مرمت کرنے والا مشین ٹھیک کرنے والا کاریگر صفائی کرنے والا خاکروب کیسا ناپسندیدہ ہے۔ مطلب تو صفائی سے ہے۔ درستی سے اُوور آلنگ سے ہے۔ گندگی سمیٹ لی جاتی۔ خرابی دُور ہو جاتی مشین چالو ہو جاتی۔ متعفن کمرہ صاف ہو جاتا۔ مسام کھلتے کرخت جلد والے چہرے کا فیشل ہو جاتا۔ وہ اس صفائی سے درستی سے، اُوور آلنگ سے اِنتہائی ناپسندیدگی کے ساتھ گزرتی، لیکن ریلیکس ہو جاتی۔ جیسے کڑوی دوا میں مرض کی شفا رکھی ہو۔ اُن کے درمیان بات نہ ہوتی دن کی روشنی میں ایک دوسرے کا چہرہ نہ دیکھتے۔ کوئی تبادلۂ خیال نہیں، کسی مسئلے کسی معاملے میں کبھی ایک دوسرے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔

سوائے ایک ضرورت کے ایک تعلق کے، وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ تمامتر اجنبیت کے باوجود فطرت اغماض نہیں برتتی۔ وہ اپنے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے

انسانوں کے جذبات و خواہشات کا ہرگز لحاظ نہیں کرتی۔ یہ فطرت کا چلن بھی بڑا بے رحم، بے حس، انسان اس فطرت کا تر نوالہ۔ تمام تر ذہنی دُوریوں، دِلی نفرتوں کے باوجود وہ اُسی مرد کے بچے کی پھر سے ماں بننے والی تھی۔ دن کی روشنی میں جس کا چہرہ بھی دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ ایسے ہی رہتے تھے جیسے گراں میں شادی شدہ جوڑے رہا کرتے تھے۔ مرد باہر بیٹھک میں مردوں میں گھرے سوتے تھے۔ عورت ساس نندوں کے جھرمٹ میں۔ جو پورا پہرہ دیتی تھیں کہ پیشاب کے بہانے کہیں سوٗرنی کوئی دوسرا کرتوت نہ کر آئے۔ تمامتر پہرہ داریوں کے باوجود کبھی کسی رات تجاوز ہو جاتا۔ وہ اجنبی اپنے ہونے کی کاروائی ڈال کر کہیں کسی بل میں واپس اُتر جاتا۔

تب ساس نندیں پہلے تو اپنی غفلت اور اُس کنجری کی جرأت اور بدمعاشی پر اُسے کوسنوں طعنوں سے چھلنی کرتیں اور پھر دُعائیں کرنے لگتیں۔

''اللہ جی! بیٹا دینا......لڑکی ڈائین سے بچانا...... ماں جیسی گندے کرتوتوں والی سے بچانا۔''

اُس نے بھی کسی سے کچھ نہ کہا تھا بس دل ہی دل میں دُعائیں کرتی رہی تھی۔ ''اللہ جی لڑکی ڈائین سے بچانا۔ ماں جیسے کرتوتوں والی سے بچانا۔''

اپنی واحد تفریح انجوائے کرنے والے کو یہ بتا بھی نہ سکی کہ اب اُنھیں احتیاط کی ضرورت ہے۔

البتہ اردگرد کے فلیٹوں کی عورتوں نے بھانپ لیا تھا۔

گراں میں بھی تو یہی بچے گواہ ہوتے تھے کہ اُن کا باپ فلاں ابنِ فلاں۔۔۔اب فلاں نے تو بس کسی تاریک لمحے میں پل بھر کی وز دی کی تھی۔

یورپ میں تو ٹیسٹ ٹیوب بے بیز اب متعارف ہوئے تھے۔ پوٹھوار میں تو ساری اولادیں اسی سے ملتی جلتی تھیں۔ نطفہ رکھ جانے والا پل بھر میں منظر سے معدوم پکڑے جانے کے خوف اور شرمندگی میں لپٹا غائب۔ بس شب رو کے قدموں کے نشانات سراغ دیتے ہیں کہ کوئی گزرا تھا۔ یہ کہنے کا تو وہاں دستور ہی نہ تھا کہ یہ میری بیوی ہے میرے بچے ہیں۔۔۔بہو پوتے بیٹی نواسے کے

حوالے سے شناخت ہوتے ہیں۔ پچھلی نسل اُس سے پچھلی نسل سے......بس خاندان پُرکھوں سے چلتے ہیں۔ ہرنئی نسل کی شناخت پچھلی نسل، پوتا، پڑپوتا...... بیٹا کہنے کی نوبت جب آتی تو خود بیٹا پوتوں والا ہونے کو ہوتا۔

ایسے ہی نشانات غزل جان کے وجود پر بھی ثبت ہوتے چلے گئے۔ ایک سربُریدہ تعلق، تاریک شب کی اُونگھتی کوکھ میں آنکھیں کان ناک سب بند، گفتگو نہیں، بدبو نہیں، خوشبو نہیں، وجود انگیٹھی کا دُھواں، بدن مساموں سے چھٹتا تو ناک گلا رُندھ جاتا۔ وہ تاج محل بھی تو یہی سب چاہتا تھا لیکن بہانگِ دہل بتا کر، جتا کر جگمگاتی روشنیوں کے بیچ کسی رشتے کسی مذہبی قرینے کا آسرا لیے بنا جائز کا ٹھپّا لگائے بنا۔

تب وہ بھاگ نکلی تھی۔ بکتی جھکتی تھوکتی ڈکراتی۔ گالیاں تو وہ اَب بھی بکتی تھی تھوکتی ڈکراتی تو اَب بھی تھی، لیکن واردات گزر جانے کے بعد، نفرت تو اُسے اب بھی اپنے وجود سے ہوتی تھی مگر لتھڑ پتھڑ ہوچکنے کے بعد، لُٹ جانے کا ماتم تو وہ اَب بھی کرتی تھی، لیکن وجود انگیٹھی کے منہ کھلے سوراخوں سے پورا دھواں چھٹنے کے بعد۔ اُسے لگتا تھا وہ اس کاروائی کی ایسے ہی عادی ہوجائے گی جیسے فضلہ اُلٹی جھاڑنے اُلٹنے سے سرکو چڑھی اُتر جاتی ہے۔ وہ روتی آنسوؤں میں رائیگانی کا ملال خارج ہوتا تین برس میں تین بچے۔

دن کی روشنی میں ایک دوسرے کا چہرہ دیکھے بنا ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کیے بنا ہی زندگی سہولت سے گزر رہی تھی، جس سہولت سے گراں والیوں کی گزرتی تھی۔ کبھی کوئی ضرورت کوئی پریشانی اُن کے بیچ گفتگو کا سبب بنی ہی نہیں...... دن کا بیشتر حصہ مٹھائیوں کا میدہ گوندھتے شیرہ اُبالتے، کالی مرغی کے گم ہونے کا برسوں پرانا قصہ سنتے گزر جاتا۔ اگر یہ کالی مرغی کھو نہ جاتی اور جسبیر کور کا دل بے ٹھکانے نہ ہو جاتا تو شاید وہ اتنی پُرسکون اتنی تر و تازہ بھی نہ رہتی۔ منوں مٹھائیاں بناتے چولہے جھونکتے شیرے میں سنے ہوئے، نہ زبان میں تلخی آتی نہ ہی چہرے پر نہ ماتھے پر تیوریاں نہ ابروؤں کے بیچوں بیچ مستقل شکنیں، نہ پپوٹوں پر غصے کا ڈھلکاؤ نہ تھکن کی سولی پر

تنگی ہوئی یہ بدرنگ آنکھیں۔ نہ ہی آنکھوں کے نیچے بے خوابی اور تفکرات سے بھری تھیلیاں۔ نہ ٹانگوں کے جوڑوں سے اُٹھتی ہو ہو کاریں، پُراطمینان اور پُرسکون جسم وجاں، شاید کالی مرغی کے کھو جانے اور پھر اُسے ڈھونڈنے کی مصروفیت میں پوشیدہ تھا۔ وہ بھی تاج محل کے کھو جانے کا کوئی اظہاریہ بنا لیتی تو اس سرعت سے تو خرچ نہ ہوتی رہتی۔ اُس نے رُوح کے سرگم کو چھیڑنے کی بجائے جسم کے تار ہلا دیئے تھے۔ کالی مرغی کے نرم پروں کی سرسراہٹ اوڑھنے کی بجائے وجود کے تال میں ڈبکیاں کھانے لگی۔ سیاہ کیچڑ وجود میں سے لتھڑ پتھڑ رُوح کا کوئی موتی بھی پھرول لاتی تو......کوفتے، پلاؤ، کباب، تنجن، قیمے، آلو گوبھی، مولی بھرے پراٹھے پکاتے پکاتے انہی تین پرت والے پراٹھوں جیسی، بچے پیدا کرنے پر مامور......زرینہ جان شکیلہ جان، فاطمہ جان سے کس قدر کم ظرف جو کبھی کسی جسمانی لمس سے آگاہ نہ ہوئی تھیں لیکن اُن کا تارِ جاں جس مرد سے بندھا تھا۔ بس وہ اُس گرہ کی مضبوطی کے لیے وجود کی موم بتی کو پگھلاتی اور اس گرہ پر وجود کی لاکھ سے ٹھپّے لگاتی چلی جاتیں۔ آخر سارا وجود لاکھ بن پگھل گیا اور گرہ پر لگے ٹھپّے باقی رہ گئے۔ اُس کا تارِ جاں کسی اور سے بندھا تھا۔ بچے وہ کسی اور کے پیدا کرتی تھی کیا وہ بے وفا تھی۔

کیا وقت نے ان اپاہج جذبوں کو لتاڑ دیا تھا۔ جس مرد کے بچے وہ پیدا کیے جا رہی تھی وہ کرائے کا باپ تھا کہ وہ نسل بڑھانے والی کرائے کی ماں۔ یہ کرائے کی ماں گچ راتوں میں لوہا سا پگھل جاتی تھی جس مرد سے نفرت کرتی تھی اُسی کو چوم لیا کرتی تھی شاید تاج کے مغالطے میں۔۔۔ پھر شدید نفرت۔۔۔ وہ سمجھ جاتا اب اُس کی ضرورت اور معنویت ہرگز نہ رہی تھی۔ مزید ایک منٹ برداشت نہ تھی اُس کی......بس آمنی سامنی دیواروں میں گھسے، بستروں میں روپوش، جیسے کبھی دونوں اِک دُوجے میں سمائے ہی نہ ہوں لیکن فطرت کبھی اغماض نہیں کیا کرتی۔ ہر وصال کی پکی سند لکھی جاتی رہی تھی۔

تعلق کتنا کریہہ ناپسندیدہ ہیجانی وہنگامی کیوں نہ ہو۔ رابطہ تو کہلاتا ہے۔ پرچہ کتنا غلط سلط خارج از متن کیوں نہ ہو نتیجہ تو آتا ہے۔

ہارٹ کور کی لڑائی بالکنی میں زوروں پر جمی تھی۔ لوہے کی گرل تینوں دیواریں اور کھڑکیاں بج رہی تھیں۔

غزل جان نے سوچا ابھی اُسی شدت سے ایک دوسرے کو چومنے لگیں گے جس شدت سے ایک دوسرے پر گالیاں اور گھونسے برسا رہے ہیں۔ ان کے پاس پازیٹو اور نیگٹو دونوں کرنٹ ہیں۔ اسی لیے تو بجلی پیدا ہو رہی ہے۔ اُس کے پاس صرف ایک کرنٹ کبھی پازیٹو کبھی نیگٹو ۔۔۔ فیوز جل بجھا، بلب خاکستر ہو چکے، تار۔ برقی رو سے خالی۔۔۔

حرام کا جنا، بھوتنی دی۔ سالی چکلے دارن۔

ماں ۔۔۔ بہن یا وی کنجر کنجری۔

یہ خالصتاً دیسی گالیاں، گانے اور ہندوستانی فلمیں، ابھی تک اس نسل کا ناطہ اپنی زمینوں سے جوڑے ہوئے ہیں۔

گالیاں اور گانے لطیفے اور کوسنے اپنی بولی میں ہی شدت رکھتے ہیں۔ بدیسی بولی میں مصنوعی ہو جاتے ہیں۔ بے اثر، نہ تڑپاتے ہیں نہ رولاتے ہیں۔ غزل جان نے سوچا۔

اُس سے گالیوں کوسنوں بددُعاؤں کی مصروفیت بھی اس اجنبی زمین نے چھین لی تھی اُسے پوٹھوار کی وہ لمبی بے انت لڑائیاں یاد آئیں۔ ایک دوسرے کے بال نوچتی، چہرے کھروچتی پوٹھواری زبان کے مخصوص تیز چیختے لہجے میں اِک دُوجی کو تو م ڈالتیں۔

شوہروں سے لڑنے یا مردوں سے زبان چلانے کی روایت تو وہاں تھی ہی نہیں، مرغی بکری کو کوسنے سناتیں جو نند بہو کو سناؤنی ہوتی۔

''کہوں بیٹی کو، سناؤں بہو کو والی کہاوت۔

''ہائے یہ بکری ہائے ہائے ڈائن روز ڈِھڈ پھلا لیتی ہے۔ خصم کی جاہنگوں پر سوار اس کے سوا کوئی اٹکل نہیں ہر کہیں مینگنیں ۔۔۔ ساری پھلا ہی چونڈ لی، رجتی نہیں دو ہی کام، منہ میں ڈالنا اور چوت سے نکالنا۔ ہائے یہ لگڑی چھری پھیرو اس پر۔۔۔'' جوابی وار آتا۔

''ہر ویلے کڑ کڑ آپ ہی اپنے انڈے کھانے والی۔۔۔نتھ ڈالو اس کی ناک میں کانٹا پرود پھلا ہی کا نتھنے میں، آدم خور......نری بیٹھیں۔'' پوٹھوار کی عورتوں کو سب سے غلیظ کام بہوؤں کا بھابیوں کا ہم بستری کرنا لگتا تھا۔ یہ جائز فعل بھی یہاں انتہائی ناجائز اور ناپسندیدہ تھا......کینڈی سنگھ انگریزی لہجے میں دیسی گالیاں بکتا جھکتا باہر نکل گیا۔ بھوتنی دی۔۔۔سسری۔۔

ہارٹ کور وارڈ روب نوچ نوچ کر بالکنی سے باہر پھینکنے لگی۔

''یہ لے جا اپنے مشک مارتے کاچھے یہ پائجامے، سڑے ہوئے ساکس، گلوز، بدشکلی شرٹس، پھٹی ہوئی جینیں۔ سارے یورپ کا گند۔ ڈسکاؤنٹ کی لائنوں میں لگ لگ کر خریدے ہوئے ریجیکیٹڈ مال۔ یہ لے اپنی سیکنڈ ہنڈ قسطوں پر لی ہوئی گٹار۔''

گٹار تیسری منزل سے گری اور کئی ٹکڑوں میں ٹیرس پر جھنجھنا گئی۔ جیسے کوئی کرب ناک گیت سنایا ہو۔ کینڈی غضب ناک ہو کر پلٹا اور اُسے دبوچ لیا۔ گھونسے اور چانٹے وہ لمبی لمبی برہنہ جاہنگیں چلانے لگی۔ وہ اُس کا گلا دونوں ہاتھوں سے گھونٹ رہا تھا۔ ہاٹ کور رُندھے حلق کے ساتھ جیسے ذبح ہوتا بکرا ڈکراتا ہوا ''باسٹرڈ حرام کا جنا ہوا۔''

''ماما پولیس کو کال کرو اس ریچھ کی Complaint لکھواؤ۔ ماما سنتی کیوں نہیں ہو۔۔۔''

جسبیر کور شیرے کے اُبلتے کڑاہے میں فرائنگ پین سے گلاب جامنوں کی گولیاں سنہری کر کرکے اُنڈیل رہی تھی۔ ''میری کالی مرغی کھو گئی میرا دل ٹھکانے نا۔'' جیسے وہ نہ کچھ دیکھ رہی ہو اور نہ ہی کچھ سن رہی ہو۔ صرف کالی مرغی کے کھو جانے کے جانکاہ صدمے کو جھیلنے کے لیے کوشاں ہو۔

زندگی کی ہر پریشانی ہر صدمے کے مقابلے میں کالی مرغی کے کھو جانے کا رُوحانی کرب زیادہ پُر سرور تھا۔ بالکنیوں میں کھڑی ہندوستانی پاکستانی کمیونٹی کی عورتیں اس آئے روز کی فری ٹکٹ مووی سے لطف اندوز ہونے لگیں۔ یہ انسان کی فطرت بھی اُس کی مٹی اُس کے خمیر کی دَین ہے کئی دھائیاں یہاں گزارنے والیاں بھی دیسی فطرت سے پیچھا نہ چھڑا سکی تھیں۔ ٹوہ، تبصرے کھوج تماشا، کنسوئیاں غیبت، بدخوئی، کتنی مصروفیات تھیں۔ یورپ میں رہ کر بھی گھروں میں بند

رہنے والی ان دیسی عورتوں کے لیے یہاں والی لاغرضی، بے پروائی، مزاجوں میں آئی ہی نہ تھی۔

''بنا بیاہ کے ساتھ رہنے کا نتیجہ۔۔۔اُس کا مال گودام باہر پھینک کر پھر سنگل۔۔۔''

ارے میری رخشندہ کو ابھی سولہواں برس لگا تھا کہ بیاہ دی۔ بائیسواں لگا ہوگا اب چار بچوں کی ماں ہے۔ یہ ہارٹ کور تو ستائیس اٹھائیس کی پکی پیڈی ہے۔دس سال سے رسی بسی ہوئی اب کیا اٹریکشن ہے اس میں باقی کہ وہ بند ھا رہے۔''

''اور میری سعیدہ تو ابھی پندرھویں برس میں۔۔۔'' پندرھویں سولہویں برس میں بیاہی جانے والیاں کتنی خاص اور عظیم تر ہو گئی تھیں۔اس یورپ امریکہ میں تو اعلیٰ تعلیم اور اچھی نوکریاں بھی گرین کارڈ اور یورپین سیٹ اَپ کے گلیمر کی بھینٹ چڑھ گئی تھیں۔انگریزوں کے لہجے میں انگریزی بولنا آ گئی تو پھر کسی اور تعلیم کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پڑھنا آئے یا نہ......تاریخ، جغرافیہ، ادب، سائنس سب بے کار......یورپی امریکی لہجے میں انگریزی بولنا سب سے بڑا اعزاز، سند، ڈگری تعلیم......جسبیر کور اس سارے ہنگامے سے لاتعلق شیرے میں گلاب جامن فرائی کر کے اُنڈیلتی رہی، جیسے وہ اس تماشے کی تماش بین بھی نہ ہو۔''میری کالی مرغی کھو گئی میرا دل ٹھکانے نا''

پُرسکون چہرہ غیرضروری جھریوں سے پاک پُرسکون دماغ والی ملائمت۔

وہ دونوں گتھم گتھا ہارٹ کور چلا رہی تھی۔

ماما! اس حرام کے جنے کو تھرو آؤٹ کرو اس بھینسے کو ٹھڈے مارو کک آؤٹ۔۔۔''میری کالی مرغی کھو گئی میرا دل ٹھکانے نا''

جیسے کانوں میں کالی مرغی کے پروں کے ہیڈ فون لگا رکھے ہوں۔''ماما سنتی کیوں نہیں پولیس کو کال کرو Help me کک ہم آؤٹ۔''

اس آئے روز کی لڑائی کا انجام معمول کے انجام کے دورانیہ سے زیادہ تاخیر کا شکار ہو رہا تھا اور وہ خوش فہمی کا شکار ہو رہی تھیں کہ آج معمول سے ہٹ کے کچھ دیکھنے کو ملے گا۔عورتیں اب واقعی سنجیدہ ہو رہی تھیں اور مدد کے لیے فون کرنے کا اِرادہ بھی کر رہی تھیں کہ منظر یکبارگی بدل ہی

گیا۔ وہ منہ میں منہ ڈالے مدہوش ہو رہے تھے۔ عورتیں شرمندہ ہو کر اپنی بہو بیٹیوں کو اس شرمناک منظر سے بچانے کو کھڑکیاں بند کرنے لگیں۔ وہ اب اِک دُوجے میں جذب رقص کر رہے تھے۔ عورتیں بہو بیٹیوں کو بھگار لہسن کی بجائے پیاز سے لگانے یا پیاز کی جگہ لہسن سے لگانے پر لعن طعن کر رہی تھیں۔ شاید اِس لیے کہ یہ خارجی دباؤ داخلی شدت کو اندر ہی اندر گھونٹ رکھے۔ ان سکھڑوں کی رذیل فطرت نے اُنھیں کیسا دھچکا لگایا تھا۔ اچھا بھلا تماشا...... نگاہیں سمونے کو تیار کہ یکبارگی پردہ گر گیا۔ نگاہوں سے منظر چھن گیا۔ بے اعتباری قوم پتہ نہیں کس وقت کیا کر ڈالیں۔ شادی پر رونے لگیں اور مرگ پر ناچنے لگیں۔ انھیں تو رب نے کوئی وکھری ہی ٹائپ دے کر پیدا کیا ہے۔ ''کک آؤٹ تھرو آؤٹ۔''

اور اب دونوں اِک دُوجے میں سموئے جاتے تھے۔ وہ بائیس تئیس برس کی بہوئیں جو غلط بھگار لگانے پر کوسنے سن رہی تھیں۔ جو تین تین چار چار بچوں کی مائیں بن چکی تھیں۔ اندر ہی اندر کڑکتا بھگار، اپنے ہی وجود کی دال کو لگتا ہوا لال مرچ اور ادرک کا بھگار...... صبح سے رات گئے تک کچن میں گھسی مختلف قسم کے بھگار اور دم لگاتی ہوئیں دال، کڑھی۔ دل بدن۔ بھگار اور دم۔۔۔

وطنوں میں تو پھر بھی والدین اب لڑکیوں کے ڈاکٹر، انجینئرز، لیکچرار بننے کا اِنتظار کرنے لگے ہیں، لیکن یہاں ولائت میں تو والدین کا سب سے بڑا مسئلہ لڑکیوں کی جلد از جلد رُخصتی ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ کہیں رُخصت ہو کر جاتی نہیں ہیں۔ بابل کے ویہڑے میں ہی رُخصت ہو کر پھر اُتر جاتی ہیں۔ جیسے پوٹھوار میں ڈولی گراں کا ایک پھیرا لگا کر دوبارہ اُسی احاطے میں اُتار دی جاتی تھی کیونکہ میرے پھپھیرے کا گھر بھی اسی احاطے میں موجود ہوتا تھا۔ اور یہاں اس یورپی ماحول کے اِدراک اور اِردگرد سے برانگیخت ہوتے جذبات کی بیداری سے پہلے پہلے اُنھیں بھسم کرنے کی ترکیبیں ڈھونڈی جاتیں۔

وطنوں سے اپنے اَن پڑھ احمق بھانجے بھتیجے بلا کر وہاں سیٹل بھی کرتے اور بیٹیاں بھی دیتے اور گھر داماد بھی رکھتے ہیں۔ بیاہی تو گئی نا۔ کمیونٹی میں تو سر اُٹھا کر یہ کہہ سکتے ہیں دیکھو ہم نے

ٹین ایج میں کنواری لڑکی بیاہ دی۔ گوریوں کی ریس میں ماری ماری نہیں پھر رہی۔ ہم نے اپنا خاندانی اور اِسلامی فرضِ اوّلین نبھا دیا اور لڑکیاں تھان پر بندھے ان گدھوں کو بھی اسی لیے قبول کر لیتی ہیں کہ اس اوپن معاشرے میں وہ تحفظ مِل جائے جو مشرقی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتا ہے۔ یہ خاندان ایسے ہی بستے ہیں، جیسے پوٹھوار سے جس دھائی میں یہاں منتقل ہوئے اُسی دہائی کا وطیرہ اور کلچر بھی یہاں اُن کے گھروں میں منتقل ہو کر منہ بند ہو گیا۔ اگلی دہائیاں تبدیلیوں کے کیا کیا طوفان اپنے نوکیلے سینگوں پر اُٹھاتی رہیں وہ سینگ یہاں کہاں گھس سکتے ہیں۔

گراں میں کسی عورت کو ٹھہرنے والا حمل اُس کی عیاشی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ کنواری عورتیں اُس کے اُبھرے ہوئے پیٹ کو دیکھ دیکھ شرماتی اور اُس کی گھٹیا فطرت کو کوستی رہتیں۔

''کنجری کیسے اُٹھائے پھرتی ہے نہ شرم نہ حیا۔''

''بے حیائی سے بھرا ہوا گھڑا آگے لٹکایا ہوا ہے۔''

اپنے خفتہ جذبات کو تھپک تھپک روہانسو ہو جاتیں۔ اپنے چچیروں ممیروں سے بھی شرماتیں۔ جو یہ واردات ڈال گئے تھے اور اب ایسے نچنت تھے، جیسے اُن کا تو کوئی تعلق قصور ہی نہ ہو۔ اُنہیں ورغلانے والی، گند گھولنے والی ایک معصوم کو رستہ دکھانے والی یہی بے حیا چڑیل بہو تھی۔ جس کی آگ ٹھنڈی ہونے کو نہ آتی تھی۔ پانچ سالوں میں تیسرا گھڑا بھروالیا تھا جس نے۔ اس بے حیائی کی واردات کا سراغ بھی تو اُس وقت لگتا جب گھڑا بھر کر چھلکنے کو تیار ہوتا۔ وہ شرم اور خوف کے مارے کسی کو شریکِ جرم بھی تو نہ کرتی تھیں۔ سارے کٹھن لمحات کا عذاب خود پر جھیل جاتیں کیونکہ بتانے کے بعد تو یہ دوہرا عذاب ناقابلِ برداشت ہو جاتا۔ اُس نے بھی تو کسی کو شریکِ جرم نہ کیا تھا لیکن اس میں خوف یا شرم کا دخل نہ تھا بلکہ بے زاری اور بے بسی نے اس عذاب کو دوہرا بنا دیا تھا۔ اڑوس پڑوس والیاں جیسے اس عیاشی کو انجوائے کرنے لگیں دوسرے سال میں دوسرا بچہ تیسرے سال میں تیسرا بچہ وہ جس اِنتہائی ناپسندیدہ اَن چاہے عمل میں شریک ہو جاتی اُس پر وہ خوشی کا اظہار کرنے لگتیں۔ بہ رضا و رغبت اس گناہِ بے لذت کی مبارکبادیں قبول کرنے لگی۔ اگر اُن کے بیچ اِک

دُوجے کومحسوس کرنے، بدن کا بخار خارج کرنے کا کوئی دوسرا نکاس ہوتا تو اس اِنتہائی قدم کے بیچ کئی رُکاوٹیں آسکتی تھیں جب دیگر سارے ذرائع موقوف ہوئے تو پھر سب سے مختصر وقت میں Relaxation کا ذریعہ یہی مؤثر ڈائریکٹ ایکشن ہی رہ گیا تھا۔ دو چار منٹ میں دونوں شانت اور پھر الگ الگ اجنبی بےزار، نفرت اور خوف کا اِمتزاج عجب یہ عبوری رشتہ۔۔۔ گراں میں تو بس پیشاب کا بہانہ کارگر ہو جاتا تھا۔ اچی سرگی چٹے پڑ کے پیچھے، مکئی کے اُونچے لمبے ٹانڈوں میں چھپے گھنے رتھ (جنگل) کے نشیبوں میں اُونچی چوٹیوں کے غاروں میں پیشاب کا بہانہ بن ہی جاتا۔

اس چھپن میٹی میں وہ کبھی پکڑے نہ جاتے یہ ازحد خفیہ ملاقاتیں یہ چوری چھپے کی ایک آدھ واردات رنگ لے آتی۔

ساس نندوں کی ساری چوکسی ساری پہرے داری دھری رہ جاتی۔ وہ تاڑ تاڑ چانٹے رانوں پر مارتیں اور مخصوص پوٹھواری کلمۂ تاسف دُہراتیں۔ ''ہوکولوٹی۔۔۔ ہوکولوٹی۔۔۔''

''کنجری لچی بدمعاش پتہ نہیں کس ویلے گند گھول آئی آگ لگی ہے، اس کے چڈوں میں خنزیرنی کا چولہا ٹھنڈا نہیں ہوتا سارا چوا پھینکو آگ بجھاؤ اس کی۔۔۔'' لیکن یہاں نہ کوئی طعنے دینے والی نہ ہی پہرے داری اور واردات کی چوکسی کرنے والی نتیجہ پھر بھی وہی۔

نیچے گارڈن میں انکل NZD سیر والی پتلی سی بانس کی چھڑی ٹیکتے بار بار اُوپر کھڑکی کی سمت دیکھتے تھے۔ شاید واحد یہ چھڑی تھی جو وہ وطنوں سے ہمراہ لائے تھے جو پچاس برس سے وفاداری نبھا رہی تھی۔ اُن کا بوجھ تنہا اپنی جانِ ناتواں پر اُٹھائے ہوئے تھی۔ اُس وقت بھی جب وہ اسے محض اُنگلیوں پر نچاتے تھے اور اب بھی جب وہ اُنھیں متحرک رکھنے کا بہانہ تھی۔۔۔ کہانی کا اگلا موڑ اُن کے بوڑھے حلق میں پھانس لگا گیا تھا۔ جس کا ایک تار غزل جان کی سماعتوں سے جڑا تھا وہ سنے گی تو ہی اُلجھے بل کھلیں گے۔

کتنے دنوں سے وہ اُن کی کہانی کی خاموش سامع تھی۔ زمین اور مٹی کی دبازتوں میں دفن کہانی اکھوئے اور بیج نکال لائی تھی۔ وقت اور محبتوں کے گوشواروں میں منقسم کہانی۔ ایک اِنتہائی

عمومی اور معمولی کہانی۔ انفرادیت ہے تو انفرادی بیان میں جو کہانی کی عمومیت اور معمولیت کو منفرد اور خاص بنا دیتا ہے۔ انکل کے بیان کی دلچسپی اور اسراریت نے ہر تارک وطن کی یہ عمومی اور معمولی کہانی سننے پر اُسے مجبور کر دیا تھا۔ جو موجود تو یہاں ہر ہر فلیٹ میں تھی لیکن اُسے کہنے کا ڈھنگ نذیر احمد کو ہی آتا تھا۔ نذیر احمد سے NZD بننے کی عام سی کہانی ایک عام سے شخص کی خاص کہانی۔

وہ رات کے بچے ہوئے چاول اوین میں گرم کر کے اُوپر دو شامی کباب رکھ لفٹ سے نیچے اُتری۔ انکل NZD شکریہ ادا کرتے کرتے بچھے جاتے تھے۔ یہ بھی نذیر احمد سے NZD بننے جیسی روایت تھی کہ یہاں ذرا ذرا سی مہربانی پر Thank you کی گردان کرتے نہ تھکو۔ کوئی اُن کے لیے اپنا وقت Sacrifice کرنے کا حوصلہ رکھتا ہے، جب کہ وطنوں میں تو بڑی بڑی مہربانیوں کو اپنا جائز حق سمجھ کر وصول کر لیا جاتا ہے۔ اُلٹا گلہ اور شکایت بھی برقرار رہتی ہے کہ جتنی توقع تھی اُتنا ہوا نہیں ہے۔ بات تو یہ ہے کہ کس معاشرے کے تضادات زیادہ تکلیف دہ ہیں۔ غزل جان نے سوچا۔

دیسی معاشرت کے تضادات معاشرے کے لیے اور ولائتی معاشرے کے تضادات فرد کے لیے نقصان دہ ہیں۔ غیریت اور منافقت کہاں کیسی ہے کس درجے پر ہے یہ درجہ کتنا مضر اور کتنا بے ضرر ہے۔ یہی کہانی تھی نذیر احمد کی۔۔۔ انکل NZD کی کمان سے نکلی تیر سی کہانی۔ یہ تیر سیدھا دل و جاں پر جا بیٹھا تھا۔ وہ کہانی جو چودھری نذیر احمد جیسے معتبر اور بھاری بھرکم نام کو سکیڑ کر NZD بنا دیتی ہے۔ مختصر باسہولت جس قدر بولنے میں آسانی اسی قدر نظر انداز کر دینے میں بھی آسانی۔ یہ کہانی تھی نذیر احمد بمقابلہ چوہدری محمد اکرم محبت و اغماض کی کہانی۔ دونوں نے بچپن ساتھ کھیلا تھا۔ گاؤں کے سکول سے پرائمری کلاسیں پاس کی تھیں۔ دونوں نے ایک قصباتی سکول سے مڈل اور میٹرک کا اِمتحان فرسٹ ڈویژن میں ایک ساتھ پاس کیا تھا۔

دونوں ایک سائیکل پر روزانہ تاروں کی لو میں چودہ میل کا فاصلہ طے کر کے سکول پہنچتے اور اِتنا ہی فاصلہ طے کر کے بعد از مغرب دھند لکے کی اوک میں لپٹے واپس اِپنے گاؤں پہنچتے۔ دونوں

نے آتے جاتے یکساں مناظر کو اُبھرتے، ڈھلتے، وقت میں تبدیل ہوتے ایک ساتھ دیکھا تھا۔ پرندوں کی چہکاریں پھولوں کی چٹک پانیوں کی کِل کِل وقت کے سائے میں تبدیل ہوتی صدائیں سنی تھیں۔ پرندوں کے پروں کی جھنکاریں چوپائیوں کی کوکاریں، جنگلی جانوروں کی دھاڑیں ایک ساتھ سنی تھیں۔ دونوں خوف اور خوشی کے جذبوں سے یکساں متعارف ہوئے تھے۔ پتوں پھولوں بیلوں کی الگ الگ خوشبوؤں کا الگ الگ اِدراک ایک ساتھ حاصل کیا تھا۔ پچھل پیریاں بھوت سایے چھلاوے ٹنڈا نے خوف حیرت، تجسس، واہمے اور ان سے وابستہ سارے احساسات اکٹھے محسوس کیے تھے۔ دیکھے اَن دیکھے۔ کتنے مختلف النوع حشرات الارض زمین کے زہریلے کیڑے فضاؤں میں ایک آدھ پرواز بھرتے ٹڈی دل، وسعتوں کو چیرتے طائرِ لا ہوتی۔ پوری عمر میں ایک آدھ بار نظر آنے والے جاندار، مناظر اور حادثے، گرتی ہوئی بجلیاں خاکستر ہوتی ہوئی گہیوں کی پکی بالیاں، ہلکے پھلکے زلزلے، سانپ کاٹنے اور زہریلے پھل پات چکھ مرنے والے کسان اور جانور، نہر میں ڈوبنے والے برچھوں کے وار سے مرنے والے حریف، سیلاب کے سامنے ٹوٹتے بند، راتوں رات راہوں میں آباد ہو جانے والی خانہ بدوش بستیاں اور پھر کسی روز اُسی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ جانے والے بوسیدہ خیموں کے یہ شہر۔ لہلہاتی فصلیں اور پھر ٹڈی دل کے حملے سے پل بھر میں خاک ہوتے کھیت۔ کتنا کچھ مشترک تھا اُن دونوں کے بیچ۔ اتنے واقعے شادیاں مرگیں، کھیلیں، تماشے، بندر سانپ رِیچھ تماشے عمومی سے خصوصی مناظر تک سب سانجھے تھے۔ دونوں نے بیریوں لسوڑھیوں کینو لیموں کے پیڑوں کو ایک ساتھ جھنجھوڑ کر کچے پکے پھل کھائے تھے۔ تپتی دوپہروں میں بھاپ چھوڑتے نہری پانیوں میں اُونچے پُل سے جسم تول کر قلابازیاں لگائی تھیں۔ بھینسوں کی دم پکڑ کر تیرا کی سیکھی تھی۔ قریبی کھیت سے تربوز چرائے وٹ بنے پر مار کر کھولے اور پنجے بھر بھر کھائے تھے ایک ساتھ۔ باغوں کے راکھوں کو جُل دے کر ادھ کچرے پھل چرائے تھے۔ اپنے سایوں پر رکھوالوں کے فائروں کی سنسناہٹ ایک ساتھ محسوس کی تھی۔ دو دھڑ ایک جان والے بچے کی طرح چاہتے ہوئے بھی دونوں الگ نہ ہو سکتے تھے کہ دونوں نے

مشترکہ بائی سائیکل خریدی تھی۔ باری باری مڈگارڈ پر بیٹھتے اور باری باری کاٹھی پر...... دونوں کے خاندان پرانی دوستیوں میں بندھے تھے کیونکہ دونوں کے پردادے، سگردادے، لکڑدادے ہمسائے رہے تھے۔ ہمسائیگی نے شہ بالوں سہیلیوں دوپٹہ بدل بہنوں، منہ بولے بیٹوں پگڑی بدل بھائیوں کے کئی سلسلے دراز کر دیئے تھے۔ دونوں کہاں کہاں سے نہیں جڑے ہوئے تھے، بلکہ سِلے ہوئے تھے۔ آخر یہ دودھڑ ایک جان والے بچے الگ کر دیئے گئے کیونکہ میٹرک کے بعد محمد اکرم کو اپنی چچازاد کو بیاہ کر گھر گرہستی سنبھالنا پڑی اور نذیر احمد مزید تعلیم کے لیے شہر آ گیا۔

غزل جان نے سوچا۔ سگردادوں اور لکڑدادوں والی دوستیاں کیا وطنوں میں اب بھی برقرار ہوں گی۔

اب جب کہ نئی دوستیاں نئے گلوبل ولیج نئے انداز، نئی مشینیں استوار کر رہی ہیں۔ تعلقات کے نئے نئے ذرائع ایجاد ہو رہے ہیں۔ کیا تعلقات کی نوعیت اور جذبات کی تفسیر نئے زمانے کے جدید مواصلاتی ذرائع نئے انداز سے ترتیب دیں گے۔ دوپٹہ بدل پگڑی بدل، شہ بالوں، سہیلیوں اور دوستالوں کی جگہ فیس بک، ای میل کی فاصلاتی دوستیاں لے لیں گی۔ ان ٹوٹ رشتے جو نسل در نسل موروثی جائیداد کی طرح ساتھ چلتے اور آبائی گھروں اور قبرستانوں کی طرح عزیز ہوتے ہیں۔ اُسے پوٹھوار کے دوستالے اور سہیلیاں یاد آئیں جو نسل در نسل قربتوں کی رسن میں جکڑے جاتے تھے۔ یہ خاندان ہمارا دوستالا ہے۔ ہمارے پڑدادے کا دوستالہ یہاں بنا تھا۔ اس گھرانے میں ہماری سگڑدادی کی سہیلی تھی۔ دوستیوں اور ہمسائیگی کے کتنے گہرے اور اٹوٹ رِشتے۔ کیا اب بھی وطنوں میں موجود ہوں گے۔

محمد اکرم کو فسٹ کلاس میٹرک کا کچھ تو فائدہ پہنچنا تھا، جب بارہ ایکڑ زمین کو اُس نے ''جٹ زرعی فارم'' کا نام دیا تھا۔ اُس کی فصل کو ماڈل کھیت کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ جدید زرعی طریقے ٹریکٹر تھریشر کا اِستعمال گاؤں میں اُسی نے متعارف کروایا تھا۔ پتہ نہیں گھر کا پکا ہوا کھانا مُدّتوں بعد مِلا تھا، یا چاول اُنگلیوں سے کھا کر اُنھیں منہ سے صاف کرنے کا طریقہ کسی خفتہ یادگار

کی بازیافت تھی۔ انکل NZD نے چاولوں کی پلیٹ ختم کی اور اُنگلیاں چاٹیں۔

''محمد اکرم کنویں کی گہرائیاں ناپنے لگا اور میں کائناتوں کی وسعتیں کھوجنے لگا۔ گاؤں کی ست رو جامد قدیم زرعی معاشرت میں لوٹنے کو جی ہی نہ چاہتا تھا۔ البتہ گاؤں کی ساری اطلاعات موصول ہوتی رہتی تھیں۔ محمد اکرم ہر ہفتے ایک خط ضرور لکھتا تھا، جو ہفت نامچہ ہوتا۔ گاؤں کی تمام تر اور جزوی و تفصیلی معلومات بھری ہوتیں، لوگ رشتے ناطے، بھینسیں، بیل گائیں، موسم بارشیں، سیلاب سوکھے نہری پانیوں کی بندیاں فصلوں کی بوائی اُٹھوائی۔ پیدائش مرگ کس کی منگنی یا رشتہ طے ہوا کس کے گھر کون مہمان آئے۔ کس کی بھینس گائے بکری نے بچے دیئے۔ کس نے گائے بھینسیں یا بیل خریدا یا فروخت کیا۔ اس بار آبیانہ کس کو کتنا کتنا آیا۔ میں سوچتا محمد اکرم نے لکھنے پڑھنے کے متروک عمل سے ایک رابطہ جوڑ رکھا ہے۔ سارے گاؤں بلکہ پڑوسی گاؤں تک کا روزنامچہ لکھ بھیجتا ہے۔ تمام پردیسیوں کو خط لکھتا اور اُن کے آئے خط عزیزوں کو پڑھ پڑھ سناتا۔ بُری خبریں جان بوجھ کر حذف کر دیتا اور اچھی خبریں بڑھا چڑھا کر پیش کرتا اگر وہ ایسا نہ کرتا تو لکھنا پڑھنا چند برس میں ہی فراموش ہو جاتا۔ ہل چلانے والے ہاتھ قلم تھامتے ہوئے کیسا محسوس کرتے ہوں گے۔ ہر ہفتے لکھے گئے خط کا اسے کبھی جواب نہ ملتا، لیکن جواب کی شاید اُسے توقع بھی نہ رہی تھی۔ اُسے تو اپنا رابطہ استوار رکھنا تھا۔ میں نے جب بی۔اے کیا تو محمد اکرم چار بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ میں جب ایم۔ایس سی فزکس کر رہا تھا تو محمد اکرم کے والد وفات پا گئے اور خاندان کے سربراہ کا قلع اُس کے سر پر رکھ دیا گیا، جس زرخیزی سے اُس کی فصلیں پھل پھول کر ماڈل کھیت قرار پا رہی تھیں۔ اُسی تیزی سے اُس کی اولادیں بھی بڑھ رہی تھیں۔

میں ابھی بے روزگار ایم۔اے پاس نوجوان تھا، جب وہ خاندان کا سرپنچ قرار پا چکا تھا۔ میرا کتابی علم بڑھتا گیا اُس کا تجربہ بڑھتا گیا۔ وہ گاؤں کے جھگڑوں کا تصفیہ کرنے لگا۔ اُس کی رائے صائب اور فیصلے قابلِ قبول ہوتے۔ کس اُمیدوار کو الیکشن میں ووٹ دینے ہیں کونسے ترقی کے منصوبے منظور کروانے ہیں۔ کہاں نالیاں پلیاں پختہ کروانی ہیں راجباہ، موگھوں پانیوں

کے مسائل حل کروانے ہیں۔

گاؤں کی ساری برادریاں اُس کے فیصلوں کی تائید کنندہ ہوا کرتیں۔ وہ سبھی گھرانوں کی خوشی غمی میں سب سے پہلے پہنچتا اور آخر میں اُٹھ کر آتا۔ ہر تقریب کا وہی منتظم اعلیٰ ہوتا کبھی عید شب رات پر گاؤں جانا ہوتا تو گاؤں کی حالت پہلے کی نسبت سدھری ہوئی محسوس ہوتی۔ رابطہ سڑکوں سے لے کر گاؤں کی پلیاں اور گلیاں بھی پختہ ہو چکی تھیں۔ وہ ہمارے بچپن کی چھوٹی سی مسجد ایک کھلی اور جامعہ مسجد میں تبدیل ہوگئی تھی۔ میٹرک تک سکول منظور کروالیا گیا تھا۔

Basic Health Unit بن چکا تھا۔ جنازہ گاہ اور قبرستان کی حالت بدل گئی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر ایک ہی جملہ ہوتا۔

یہ سب چودھری محمد اکرم نے بنوایا۔ چودھری محمد اکرم نے بڑا کام کروایا۔ اس ذرا سے گاؤں کے اَن پڑھ معمولی سے لوگوں میں وہ مرکز نگاہ بنا ہوا تھا اندھوں میں کانا راجہ۔ کنویں کا مینڈک، ایک میں کہ یورپ کی کھلی فضاؤں میں عظیم الشان یونیورسٹیوں کو سر کرتا چلا گیا۔ اس گاؤں کی تاریخ میں تو کسی کو اسکالرشپ کے معنی تک معلوم نہ تھے۔ محمد اکرم نے صدقے کی دیگیں اُتروائی تھیں اور مجھے ہار پھول پہنا کر رُخصت کیا تھا۔ یعنی اس گاؤں کی طرف سے گاؤں کے لائق سپوت کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔ جب میں پی۔ ایچ۔ ڈی فزکس کر چکا، تو وہ اپنی بڑی بیٹی کی منگنی طے کر رہا تھا۔ میں نے ابھی اپنی شادی کا بھی نہ سوچا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کا سوچ رہا تھا۔

جب مجھے ایک بڑی یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر نوکری ملی تو میں اُس سے اپنا موازنہ کرتا تھا۔

تحصیل میں اوّل آنے والا لڑکا ہل پھال میں جتا پورے گاؤں کے مسائل کو سلجھانے والا زیرک بزرگ۔ بھینس گائے بیائے یا بکری بیل بیمار پڑے لڑکیوں لڑکوں کے رشتے طے ہوں برات ٹھہرانے، کھانے کا اِنتظام کرنے، جنازے تدفین کو جلد نمٹانے، الیکشن میں ووٹ دینے کا فیصلہ اُسی کے ڈیرے پر پنچائتیں طے کرتیں۔ یہ زیرکی اور سنجیدگی جیسے اُس کی عمر کو ایڑھ لگا رہی تھی۔

آنکھوں کے گرد تفکر کی گہری لکیریں گہری گندمی رنگ جلد کی یہ سلوٹیں کبھی کبھار آسودہ ہوجاتیں تو ان ذرا ذرا کھدی نالیوں کے اندر کی جلد سفیدی مائل نظر آتی۔ ماتھے پر سوچ کی شکنیں کنپٹیوں پر تفکر کے سفید بالوں کی دھاریاں، محمد اکرم کی تو ایک شخصیت بنتی جارہی تھی۔ چودھری محمد اکرم ہائے! معمولی سی سوچ چھوٹی سی دنیا ذرا سے مقاصد، تحصیل میں اوّل آنے والا لڑکا آج میرے ساتھ اسکالرشپ پر یورپ کی بڑی یونیورسٹیوں میں نام بنا رہا ہوتا ترقی کررہا ہوتا۔

غزل جان نے سوچا۔ چودھری محمد اکرم سے AKY بن چکا ہوتا۔ ترقی شاید مخفّفات میں سمٹ رہی ہے۔ اِس ست رو قدیم زرعی معاشرے نے اکرم کو چودھری محمد اکرم صاحب بنا دیا اور اس جدید علوم اور نت نئے تجربوں سے چھلکتی لیبارٹریوں اور یونیورسٹیوں نے محمد نذیر احمد کو NZD بنا دیا۔ شاید انسان بھی کوڈ ورڈز میں ترقی کرنے لگے ہیں۔

''جب اُس نے مجھے اِنتہائی خوشی سے اِطلاع دی کہ گاؤں میں بجلی آ گئی ہے اُس وقت میں کمپیوٹر اور جدید ویب سائیڈز سے اِستفادہ کررہا تھا۔ جب اُس نے مجھے اِطلاع دی کہ گاؤں میں فون لگ گیا ہے۔ اس وقت میں موبائل فون استعمال کررہا تھا۔ جن دنوں اُس نے مجھے بڑی بیٹی کی شادی کا دعوت نامہ بھیجا۔ اُنہی دنوں میں کیرن نے یونیورسٹی جائن کی تھی۔ وہ اپنے جرمن بوائے فرینڈ سے بریک اَپ کے صدمے سے دوچار تھی۔ اپنی مشرقی فطرت کی کچھ کوتاہیاں تھیں کہ جو ابھی مخفّفات میں نہ سمٹ سکی تھیں یا مستقبل کی کوئی خفیہ سی منصوبہ بندی، ہم قریب ہوگئے۔ وہ مجھ میں ریسکیو تلاش کرنے لگی۔ میں اُس کے ساتھ وقت گزاری کرسکتا تھا۔ شاید مشرقی تہذیب کا کوئی اپاہج سا جذبہ ابھی باقی تھا کہ کسی خفیہ سے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی چالاکی۔ جھٹ سے اُسے پرپوز کردیا۔ وہ بھی تبدیلی کی شدید شوقین تھی اور اپنے سابقہ جرمن بوائے فرینڈ کو تڑپانے جلانے کی خواہش مند بھی۔''

انکل NZD بولے چلے جاتے تھے جیسے ڈرتے ہوں کہ غزل جان کوئی بہانہ بنا کر اُٹھ جائے گی اُسے کوئی بچہ آواز دے دے گا۔ چولہے پر رکھی ہنڈیا یاد آجائے گی اور پھر یہ کہانی حلق میں پھانس لگا جائے گی۔ نہ کہی گئی تو دم گھونٹ لے گی۔

''شادی چرچ میں عیسائی رواج کے مطابق ہوئی۔ ویسے بھی تمام مذاہب کی بنیاد تو ایک ہی ہے۔ مذہب الہامی ہے یہ رسومات تو زمینی اور انسانی ہیں ہر معاشرے نے اپنے جغرافیائی ماحول کے تحت خود کو کچھ رواجوں میں پابند کر لیا ہے۔ شادی کسی طریقے سے ہو مقصد تو دو افراد کا ملاپ ہے۔ وہی ایک خدا وہی پیغمبر اور الہامی کتابیں، کوئی کسی سلسلے، کسی کڑی پر مطمئن ہو گیا کوئی اخیر تک جا کر مطمئن ہوا۔ وہی اصل یعنی نیکی اور عبادات کا تصور۔ ہم دونوں خلقِ خدا کو نبیوں پیغمبروں کے ناموں میں تقسیم کرنے کے قائل نہ تھے۔

اسی لیے مسجد میں جا کر نکاح بھی پڑھا لیا یعنی دونوں مذاہب والوں کو مطمئن کر دیا۔ دونوں عقائد کی پیروی مکمل۔ جب کہ ہم دونوں کا خیال ایک ہی تھا۔

اللہ ایک ہے اُس نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے مذہب بھی ایک ہی اُتارا ہے۔ جس کی بنیاد فلاح اور نجات ہے۔ بس وقتاً فوقتاً آنے والے پیغمبروں نے اُسے اپنی جغرافیائی اکائیوں کے لیے اپنی اپنی شریعت میں محدود یا وسیع بنیادوں پر نیکی، محبت، بھلائی اور نجات کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ تمام خدائی کتابیں بھی ایک ہی درس کی حامل ہیں۔ نیکی پاکیزگی اخلاق اچھائی انسان دوستی کا درس، بدی کی سزا اور نیکی کا اِنعام، پھر فرق کیا ہے۔ بندوں کا اپنا بنایا ہوا فرق آخر تو ہدف سبھی کا ایک۔ جنت اور دُنیا کے سکون کا حصول، زادِراہ بھی وہی یکساں نیکی، انسان دوستی، خدا پرستی۔

اس یکساں زادِراہ کے ہمراہ راستہ اور راہ کی منازل اور پڑاؤ فرق فرق۔۔۔ ایسا ہم دونوں کا ہی خیال تھا تو پھر کیا جو ہم پیروکاروں کے پیروکار نہیں ہیں۔ گاؤں کے ہر بچے کی طرح میں نے امام مسجد سے قرآن پاک پڑھ رکھا تھا۔ اب بھی پڑھنا آتا ہوگا، لیکن دوبارہ پڑھنے کا زندگی نے کبھی وقت ہی نہ دیا۔ پر یقین تھا کہ آج بھی پڑھوں گا تو پورا یاد ہوگا۔ کیرن کے پاس بھی بائبل تھی لیکن اُسے بھی زندگی نے پڑھنے کا موقع نہ دیا تھا۔ اُس کی کتاب اُسی کی اپنی زبان میں تھی اُسے بھول جانے کا کوئی خدشہ ہی نہ تھا۔ اُس نے قرآن پاک کے ساتھ بائبل بھی رکھ دی۔

کچھ عرصے بعد دونوں کتابیں خلط ملط ہونے لگیں کبھی بائبل اُوپر آ جاتا تو میں آنکھ بچا کر

قرآن پاک اُوپر رکھ دیتا، جب قرآن مجید اُوپر ہوتا تو کیرن اُن کی ترتیب بدل دیتی۔ شاید ہم دونوں کو ایک دوسرے کی جسارت اچھی نہ لگتی تھی یا شاید ہمارے اندر سوئے ہوئے اپنے اپنے عقائد انگڑائیاں لے رہے تھے، مجھے ڈر تھا کسی وقت پورے پورے بیدار ہی نہ ہو جائیں، کسی ایک کو افیون پلانا لازم تھا۔ اس وقت بے وقت کی ہڑبڑاہٹ سے دو چار جذبات کو سلانا ضروری تھا تو پہل مجھے ہی کرنا تھی۔ میں ایک وسعتِ قلبی کے ساتھ اس اچانک بیداری کو تھپکنے لگا ایک ہی اللہ کی بھیجی ہوئی دو کتب ہیں۔ آسمانی مصنف خود بہتر فیصلہ کر دے گا کہ اُوپر کس کو ہونا چاہیے۔ کیرن بھی شاید اس اُوپر نیچے والے کھیل سے اُکتا گئی تھی، مجھے دست بردار ہوتے دیکھ کر اس کھیل کو بچوں پر چھوڑ دیا۔ وہ کبھی ایک کتاب اُوپر کر دیتے تو کبھی دوسری رکھ دیتے دونوں میں سے نہ کبھی میں نے کوئی ایک کتاب پڑھی نہ کیرن نے نہ ہی بچوں نے۔ کتاب کا مسئلہ صرف اس لیے بنا کہ ہم دونوں دو مختلف کتب کے حوالے رکھتے تھے، اگرچہ دونوں نے ان کتب کو اپنانے کی کوشش نہ کی تھی لیکن وہ ہمارے ناموں کی طرح موروثی طور پر ہمارے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ جیسے کیرن کے ساتھ مغرب اور میرے ساتھ مشرق جڑا تھا۔ ہم نے دونوں بچوں کو فطرت کے سپرد کر دیا جو مذہب چاہیں اپنائیں خارج سے کچھ ٹھونسنا کیوں۔۔۔ دونوں کتب اُن کے رُوبرو تھیں۔

اُنہی دنوں محمد اکرم نے اپنے منجھلے لڑکے کے قرآنِ پاک حفظ کرنے کی مجھے مبارک باد دی تھی۔ اُس نے یہ بھی خبر دی کہ پاکستان میں حفظِ قرآن کا رجحان بہت بڑھ گیا ہے۔ ستر کی دہائی والی لادینی اب ختم ہو رہی ہے۔ اب مساجد ہرگز نوحہ خواں نہیں ہیں کہ نمازی نہ رہے صحرائے عرب بالکل اُداس نہیں ہے کہ حجازی نہ رہے۔ شب بھر میں بننے والی مساجد میں من کیسے ہی پاپی ہوں نمازی بہت ہیں۔ لیکن یہاں تو اپنے مضمون سے متعلق ہی پڑھنے کو اِتنا علم بکھرا پڑا تھا کہ کچھ اور پڑھنے کی فراغت ہی نہ تھی۔ فزکس کے میدان میں اِتنی تبدیلیاں ترقیاں اور اِرتقاء تغیر کہ اُن سے باخبر رہنے کو وقت کم پڑ جاتا تھا۔ اتنے آرٹیکل کانفرنسز سیمینارز اِک جہانِ معنی تھا جو دریافت چاہتا تھا۔ کیا میں یہ کہتا کہ میرا نالج اَپ ٹو ڈیٹ نہیں ہے۔ یہاں دُنیاوی جنت کے بدلے سماوی

جنت کی قربانی دینا پڑتی ہے یہ مجبوری تھی۔

اب تو محمد اکرم کے خط پڑھنے کی بھی فرصت نہ رہی تھی جواب دینے کی فرصت تو پہلے ہی نہ تھی۔اب پڑھنے کی بھی نہ رہی۔۔۔"

انکل نے پینٹ کی جیبوں میں بھرے خط نکال کر سنگی بینچ پر رکھ دیئے۔سر بہ مہر لفافے جو گزشتہ کئی برسوں سے پڑھے جانے کے منتظر تھے۔ہرے نیلے خاکستری رنگ لفافے بوسیدہ ادُھرانے نئے پرانے خط۔رنگ برنگ ٹکٹ جو پوری کہانی پیش کرتے تھے۔سیاست حکمرانی، حکمران جن پر سن درج تھے۔مختلف رنگ اور ڈیزائن وطنوں میں منائے جانے والے دن،معروف ہونے والے شاعر،ادیب،کھلاڑی،سائنس دان ٹکٹوں پر مسکراتے ہوئے،بدلتی تاریخیں،بدلتے رویے رجحانات مفادات اور ضروریات۔

ان ٹکٹوں میں کیا کچھ موجود نہ تھا۔وطنوں کے سارے اہم دن،تاریخ جغرافیہ،سیاست سے کھیل تک ساری تاریخ درج تھی۔اہم مناظر،مقام،افراد،ایام۔۔۔پورا پاکستان آن موجود ہوا تھا۔بھولے بسرے دن چہرے مقام،ٹکٹ کی ذراسی ڈبی میں بند اِک جہانِ محشر۔۔۔ان خطوط میں گاؤں کے ہر خاندان کے حالات اور علاقے میں ہونے والے ہر واقعے کا مفصل بیان تھا۔بھینس گائے کے بیانے سے لے کر کسی انسان کے فوت ہونے تک مویشیوں کے مرنے سے لے کر اُن کے بچھڑوں کٹڑوں کی پیدائش اور ان کی نسلوں تک کی تفصیل موجود تھی۔

غزل جان ایک خط اُٹھا کر پڑھنے لگی۔کسی خاندانی بھینس کی بیماری کی لمبی کتھا تفصیل سے لکھی گئی تھی،جو جانبر نہ ہو سکی تھی۔

"نذیر احمد تمہیں تو یاد ہی ہوگا کہ حمید جٹ کے خاندان میں ایک پنج کلیان بھینس تھی۔اس کی ایک بیٹی میرے باڑے میں بھی ہوتی تھی۔اصل میں نذیر احمد اس کی نانی پچھلے زمانوں میں تمہارے دادے کے پاس تھی جو ہماری ہوش سے پہلے مرگئی تھی۔اس کی ایک نواسی آج کل میرے سالے چودھری شبیر کے پاس ہے۔کل اُس نے کٹڑا دیا لیکن وہ مر گیا۔پکا اکیس کلو دودھ ہے اُس

کے حوالے میں، بڑا افسوس ہوا۔ آج میں نے ''موڑا'' یعنی بھونس بھری کھال کا کٹڑا بنا دیا ہے۔ اُسے چومتی چاٹتی تو ہے اب دُعا کرو دودھ گھٹائے نا۔ اس خاندان کی ایک جھوٹی ملک دستگیر کے پاس ہے۔ پچھلے دنوں بھینسیں آپس میں لڑ پڑیں اور اُس کا ایک سینگ ٹوٹ گیا بہت سرے کی بانکی جھوٹی تھی۔ بج (داغ) لگ گئی شوہدی کو، آہ......اسی کی ایک بہن بھرا رمضے کے پاس ہے اُس کا ایک تھن مارا گیا تھا لیکن پھر بھی پکا چودہ کلو دودھ دیتی ہے۔ انہی کی رشتے دار نبی جٹ کے باڑے کا سنگھار تھی کل مر گئی۔ بڑا نقصان اور افسوس ہوا، بڑی نسلی اور خوبصورت بھینس۔۔۔'' اس طرح کے واقعات کی تفصیلات سے خط بھرے تھے۔ ہر گزرنے والے غمی خوشی کے واقعات وحادثات میں نذیر احمد کو تفصیلاً شریک کیا گیا تھا۔

زمینوں کی خرید وفروخت سے لے کر لڑکیوں کے جہیز خریدنے تک، جہیز کے ٹرک لوڈ کروانے کے دوران پیش آنے والی مشکلات کی تفصیلات تک سب موجود تھا۔

''نذیر احمد! پہلے تو دو منجیاں ہوتی تھیں۔ ایک پیٹی دو پیڑھیاں دس بسترے، لیکن اب نذیر احمد گاؤں بھی ترقی کر گئے ہیں۔ اب تو صوفہ سیٹ، سنگھار میز اور ڈبل بیڈ دیئے جاتے ہیں۔ کل رحمے چدھڑ کی بھتیجی کا داج لوڈ کروایا۔ ٹرک چھوٹا تھا اور چیزیں زیادہ۔ سائڈوں میں روئی رکھ رکھ چیزیں ایک دوسری کے ساتھ پیک کیں، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ دُنیا پور تک کوئی چیز اپنی جگہ سے کھسکی نہیں۔ ساتھ اپنی ٹرالی میں بھینس اور کٹڑی روانہ کی کہ چلو دوسرے ٹرک کا خرچہ بچ جائے۔ گاؤں کی دھی دھیانی ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ کوئی نقصان نہیں ہوا۔''

یورپ کے اس ترقی یافتہ شہر میں یہ باتیں کسی Taboo جیسی ہی معلوم ہوتیں۔

''نذیر احمد! ماسٹر اللہ دِتا تو یاد ہوگا نا تمہیں وہی جس سے ہم نے دوسری تیسری کلاس میں پڑھا تھا۔ کل فوت ہوگیا انا للہ وانا الیہ راجعون، بڑا نیک انسان تھا۔ آج ہم جو کچھ ہیں اسی کے طفیل تو ہیں۔ اپنا بچہ تو تھا نہیں بیچاروں کا، پر گاؤں والوں نے اِس طرح میت سنبھالا کہ سگا بیٹا کیا سنبھالتا۔ میرے ڈیرے پر پچھلے دس پندرہ سال سے قیام تھا۔ اُستادوں کا۔۔۔ اُستاد تو یوں بھی

رُوحانی باپ ہوتا ہے۔ یقین کرو نذیر احمد لگتا ہے سگا باپ بچھڑ گیا۔ کل سے روٹی اچھی نہیں لگ رہی
پانی کڑوا لگتا ہے۔ حلق سے نہیں اُترنا۔

ماسٹر جی کی کتابیں چوم کر غلاف چڑھا کر پر چھتی پر سنبھال دی ہیں۔ صبح وشام دیکھتا ہوں تو
آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ اُستاد تو۔۔۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سے میرے ہی ساتھ تھے۔ صبح
جاگتے اور رات سوتے دوٹائم پیر چھوتا تھا۔'' غزل جان نے ایک اور خط اُٹھایا۔

جس میں کسی ہالی بیل کی ناگہانی موت کا المناک قصہ درج تھا۔

''عنایت گوجر نے دو ایکڑ سہاگہ پھیر کر بیل ہل میں جوت لیا مغرب تک چلائے رکھا
آخر ساون کی ہوا اڑتی بس چٹھے پانی سے منہ موڑ لیا۔

بہت اوڑھ پوڑھ کیے سارے گاؤں کے مرد ساری رات الاؤ جلا کر بیٹھے رہے۔ دیسی گھی
کے نال چڑھائے، گڑ سونف اجوائن کی مٹھیاں کھلائیں، پر باچھیں کالی ہوگئی تھیں۔ آنکھوں سے
لجلجا پانی نکلنے لگا دُم مڑ گئی۔

سب نے کہا چھری پھیر دو پر ہالی داند (بیل) بیٹوں سے بڑھ کر پالا ہوا...... کسان اپنے
بیٹوں کو ''منڈے'' کہتے ہیں اور بیل کو پتر (بیٹا) بھلا کیسے ہمت ہوتی پتر کو کاٹنے کی۔۔۔ ہمارے
ہاتھوں میں جان دے دی کچھ نہ کر سکے ہم سارے۔۔۔ دو دن تو گھر میں روٹی نہ پکی۔ پورے لاکھ کا
نقصان جو ہوا سو ہوا پر جو پیار کا ناطہ ٹوٹا، جو دُکھ لگا، عورتیں تو آٹھ دن سے پھوڑی بچھا کر روتی بین
ڈالتی ہیں۔ دوٹائم میں بھی جا کر پھوڑی پر بیٹھتا ہوں۔ بھائی یہ جانور چلتے رہیں تو ٹھیک کھڑے ہو
جائیں تو سمجھو موت کا فرشتہ آ پہنچا۔ کوئی ڈاکٹر کوئی وٹنری کوئی دوائیاں ٹیکے کام نہیں آتے۔ دیسی
اوڑھ پوڑھ سے افاقہ ہو جائے تو ہو جائے یہ انگریزی دوائیاں تو نہ ہمارے مویشیوں پر اثر کرتی ہیں
اور نہ ہی ہم کسانوں پر، صدیوں پرانے ٹوٹکے پوٹکے چل جائیں تو ٹھیک ورنہ اجل تیار۔۔۔''

غزل جان نے ایک خط اور اُٹھایا، جس میں کپاس کی فصل میں پھیلنے والے وائرس کی تباہ
کاریوں کی داستانِ غم رقم تھی۔

''نذیر احمد کیا بتاؤں تجھے۔لہلہاتی فصل یوں سیواہ ہوگئی جیسے ٹھنڈے حقے کی چلم۔
پھل گڈی سے بھرے بوٹے یوں کملا گئے جیسے ایک ایک کی شہ رگ کٹ گئی ہو اور پرانے مردے بو مارتے ہوں۔

عورتیں دنوں مینڈھوں پر بیٹھ کر بین کرتی اور سر کے بال نوچتی رہیں، پر قدرت کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔نذیر احمد اس بار گاؤں پر بھاری وقت آیا۔شکر ہے بھڑولوں میں دانے ہیں چلوتن پر پیوند بھی لگیں تو تن جی جاتا ہے پر پیٹ تو مانگتا ہے بنا روٹی کے کیسے جیئے۔سارا پلان بنالیا ہے۔ربیع تک سب حساب کتاب لگالیا ہے۔انشاءاللہ جن کے بھڑولے خالی بھی تھے۔تھوڑا تھوڑا سب نے ڈالا تو بھر گئے ہیں۔عورتوں کو سمجھا دیا ہے کہ بھئی سگھڑ سیانیاں بنو،اسی میں چھ مہینے گزارنے ہیں ساونی (موسم سرما) ساری۔۔۔''

''آج گاؤں میں بازی تھی۔تمہیں تو یاد ہوگا۔

نیامت بازی گر پچاس فٹ اُونچے رسے سے یوں کود جاتا تھا،جیسے کوئی کبوتر غوطا لگاتا ہو۔یاد ہوگا جب بازی گروں کا ڈیرہ گاؤں میں اُترتا تھا تو ہم سارا دن وہیں منڈلاتے رہتے تھے کیونکہ وہ نقارہ پیٹ پیٹ کر یاد کرواتے رہتے تھے کہ بعد از نماز جمعہ اگلے ہفتے بازی پڑے گی۔اُسی نیامت بازی گر کا ڈیرہ اُترا ہوا ہے۔خود تو اب بوڑھا ہو گیا البتہ اُس کے پانچ بیٹے بلا کے بازی گر ہیں۔یوں رسوں پر سے پھاندتے ہیں جیسے بجلی کوندتی ہو،اس جمعے کو بازی ہوگی۔دُعا کرو اُنھیں اچھی ویلیں ہو جائیں۔غریب پورے سال میں بس ایک ہی بار تو اُترتے ہیں۔اُن کا حق بنتا ہے۔اگرچہ فصل کے حالات اچھے نہیں کھیسے خالی ہیں۔پر یہ تو جوگی والا پھیرا کبھی ہی ڈالتے ہیں۔ان کا حق تو دینا ہی ہے۔حکومت نے قرضے کی سکیم نکالی ہے۔سبھی کے فارم بھر کر اپلائی کروادیا ہے۔دُعا کرو بازی سے پہلے مِل جائے تاکہ بازی والے دن کوئی منہ نہ چھپاتا پھرے۔بہانے سے وانڈے نہ جائے یا حیلے سے بیمار نہ پڑ جائے۔اللہ سب کی عزتیں رکھے اور ناموری دے۔''

کسی اور خط میں ہیجڑوں کے تماشے کا تفصیلی تذکرہ تھا۔

"تمہیں یاد ہوگا۔ نذیر احمد! فضل کھسرا ہوتا تھا کبھی......اب اُس نے حج کر لیا ہے۔ سفید ململ کے کپڑے سے سر ڈھانپ کر رکھتا ہے۔ ناچنا گانا، چھوڑ دیا ہے۔ اللہ جسے ہدایت دیتا ہے اُس کی گل بدل جاتی ہے۔ کل اللہ وسایا کھچی کے پوتے کے ختنوں میں کھسرے آئے ہوئے تھے۔ اُسے دیکھ کر جی خوش ہوا۔ بہت ویلیں ہوئیں۔ ویسے اب ان کے حالات پہلے جیسے نہیں رہے لوگ نہ تو انھیں شادی بیاہ پر بلاتے ہیں اور نہ جی کھول کر ویلیں دیتے ہیں۔ فضل دین کھسرا کل رو پڑا کہنے لگا۔

"چودھری تم ہی بتاؤ نہ گھر والے اپنائیں نہ باہر والے قبول کریں کدھر جائیں ہم۔" اب تو بھیک مانگنے لگے ہیں جو کبھی فنکار تھے اب منگتے بن گئے۔"

انکل اُس خط کو تا دیر پڑھتے رہے۔ ہیجڑے جو فنکار سے منگتے بن گئے۔ جنھیں قدرت نے خود تماشا سا بنا کر آسمانوں سے زمین والوں کے تفننِ طبع کے لیے ارسال کیا تھا ایسے ہی جیسے وطنوں سے تماشا سا بن کر پردیس میں نازل ہونے والے۔۔۔ انکل Nzd اس خط کو بھی تا دیر پڑھتے رہے، جس میں جادوگری کے تماشے کا تفصیلی ذِکر تھا۔ جیسے اپنا بچپنا جس سحر میں مقید ہوگیا تھا اُس دیو سے آزاد کروا کر عمر کا سلسلہ آگے بڑھانا مقصود ہو۔ وہ جادوگری کے کرشمے جب سرخ رومال سفید کبوتر بن اُڑ جاتا تھا، جب تیز دھار چھری ماتھے پر بجنے کے بعد پھول بن جاتی تھی، جب ڈبے میں بند بونے کو دو حصوں میں کاٹ دیا جاتا اور وہ پھر بھی زندہ سلامت باہر نکل آتا۔ یہ سب ضعیف تیقنات کتنے ضروری تھے۔ خوش باش رہنے کے لیے۔ نذیر احمد سوچ رہے تھے کہ یہ سارے کرشمے کیا وطنوں میں اب بھی ہوتے ہیں یا وہاں بھی ان معصوم شعبدوں کی قلعی کھل چکی ہے۔ قلعی کا پگھلتا سکہ کیا اب بھی سیاہ برتنوں کو چمکاتا ہے کہ وہاں بھی تانبا پیتل ناپید ہو چکا۔ وہاں بھی سٹیل ان پیتل تانبے کی جگہ لے چکا ہے جو کبھی اپنا ملمع نہیں اُتارتا اسے کبھی قلعی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ "بھانڈے قلعی کرالو" کے ہوکارے اب نہیں پڑتے ہوں گے کیا؟ کتنے پیشے اور ہنر مندیاں پرانے وقتوں کی یادگار ابھی موجود ہوں گے کہ تمام ہوئے۔

''مدت سے میں نے ان خطوط کو کبھی پڑھا نہ تھا۔ وقت ہی نہ ملا تھا میرے لیے وقت بڑا قیمتی سرمایہ تھا۔ کیا ایک بھینس کے مرنے یا کسی کھسرے کے تالیف قلب کی لمبی کتھا میں اسے ضائع کیا جاتا۔ اس دورانیہ میں تو ایک ایسا لیکچر تیار ہو سکتا تھا جو کسی بڑی یونیورسٹی میں ڈیلور ہوتا جو کسی انٹرنیشنل جرنل میں چھپ سکتا۔ رُک کر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی عمر بھر...... والدہ، والد، بڑے بھائی بہن کتنے قریبی رشتہ دار چلے گئے۔ محمد اکرم دو دو راتیں میتیں رکھ میرا انتظار کرتا رہا جیسے مجھے یورپ سے نہیں کسی دوسرے شہر سے آنا ہو، جیسے میرے حصے کی دو مٹھی مٹی نہ ڈلی تو قبر مردہ قبول کرنے سے انکاری ہو جائے گی یا مردہ بے چین رہے گا۔ یہ محض محمد اکرم کا خیال تھا۔ مٹی سارے مردے قبول کر لیتی ہے کوئی مردہ میرے بغیر دفن ہونے سے اِنکاری نہ ہوا تھا۔ میرے پاس دل تو تھا مگر محسوس کرنے کا وقت نہ تھا۔ میرے پاس یادیں تو تھیں لیکن انھیں دہرانے کی فرصت نہ تھی۔ تعلق تو تھا نبھانے کی ہمت نہ تھی۔''

انکل کی بجھی ملگجی جھلی والی آنکھیں جیسے کھو چکے مناظر میں اٹک گئیں۔

''ماں کے ہاتھ کے تین پیڑوں والے پراٹھے دیسی گھی میں کٹی ہوئی چوری، کورے کجے میں بھری لسی، جس میں ہاتھ ڈال کر نمک کھورتی ہوئی ماں کی تصویر آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی۔ جو بھینس کا پچھلا تھن بھرا چھوڑ آتی تھی کہ میں جا کر دھاریں لے لوں۔ سردیوں میں میرے لیے میوے کھوپرے ڈال کر گڑ بنواتی اور گرمیوں میں کچی لسی کے کٹورے بھر بھر رکھتی لیکن ماں اور میرے بیچ سات سمندر حائل ہو گئے تھے۔ پانی ہی پانی خلا ہی خلا......احساس ضرور رہا کہ میرے پیچھے ایک گاؤں موجود ہے، جس طرح جہاز کے پیچھے دھوئیں کی دھاری۔ وہ چھوٹی سی دُنیا جو آج بھی مجھے خود سے باہر نہیں پھینک سکی، جو آج بھی مجھے خود سے جوڑے ہوئے ہے۔ میں نے کبھی محمد اکرم کو اپنی خیریت سے آگاہ نہ کیا لیکن وہ ہمیشہ میرے متعلق فکرمند رہا۔ میری خیریت جاننا چاہی اور اُس گاؤں کی خیریت مجھے دینا چاہی جیسے اُس گاؤں سے میری لمبی غیر حاضری نے میری اہمیت کم ہی نہ کی ہو۔ میری جگہ ابھی بھی برقرار ہو یہ گاؤں ہر ایک کو اُن کی اپنی اپنی جگہیں ہمیشہ

سونپے رکھتے ہیں۔ گھروں میں بھی اور قبرستانوں میں بھی ۔ نہ قبر پر کبھی قبر بنتی ہے، نہ قبرستان چھوٹے پڑتے ہیں نہ گھروں سے چارپائی باہر نکالی جاتی ہے۔ میری چارپائی موڑھا، صندوق ابھی بھی میرے کچے کوٹھے میں ضرور موجود ہوگا۔ جس کی حفاظت پر محمد اکرم مامور تھا۔ لیکن میری زندگی ہل پھال مال مویشی کسی کے مرنے جینے سے بہت آگے نکل آئی تھی۔

اس تیز رفتار جدید زندگی کو بس دوبار بریک لگی۔ پہلی بار اُس وقت جب شادی کے بارہ برس بعد کیرن نے مجھ سے طلاق کا مطالبہ کیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا ''کیوں''

میں تو کبھی اُس میں مخل نہ ہوا تھا۔ کبھی دخیل نہ ہوا تھا۔ میں نے تو دونوں بچوں کی تربیت حد مذہب میں بھی کبھی دخل نہ دیا تھا۔

اُس نے کہا کہ وہ مجھ سے Fed-up ہو چکی ہے۔ کچھ نیا چاہتی ہے۔

میرے مشرقی خدوخال میری جی حضوری اور وفا شعاری کی عادت سے تنگ آ چکی ہے، وہ چلی گئی آزاد فضاؤں میں اُڑنے کو۔۔۔ بچے میرے پاس چھوڑ گئی۔

میں خوش تھا کہ اب بچے مکمل میرے ہوں گے جن پر میں نے اپنی مشرقی شخصیت کبھی تھوپنے کی کوشش نہ کی تھی۔ جنھیں فطرت کے اصولوں پر پروان چڑھنے دیا تھا، لیکن چند برس بعد وہ بھی میری مشرقی شخصیت سے بور ہو گئے تھے۔ وہ میرے وجود سے Embarrass ہوتے تھے، کیونکہ ان کی انگریزیت پر شک کیا جا رہا تھا۔ وہ گاؤں جسے خود سے نکال پھینکنے کی تگ و دو میں عمر گزار دی۔ جہاں سے آنے والے کسی خط کو کبھی نہ کھولا کہ کہیں اس میں رچی بسی چارے، گوبر کی خوشبو یا بو میرے وجود کی حقیقت کی چغلی نہ کھائے۔ جس کی یادوں کو کبھی اظہار نہ دیا کہ کہیں یہ سوز میری صوت میں نہ جھلک جائے لیکن اُس نے میرا پیچھا سات سمندر پار بھی نہ چھوڑا......اپنی خوشبو اپنی صوت کے ساتھ موجود رہا۔ میرا وجود اُن کے لیے خطرناک ہو رہا تھا اُن کی نسل رنگ اور مذہب میں میرا شائبہ بھی نقصان دہ تھا۔

وہ چلے گئے اور میں اپنے متروک وجود کے ساتھ تنہا رہ گیا جس کے کونے کھدروں میں

کہیں اب بھی گاؤں موجود تھا اتنے بڑے یورپ میں بھی جسے میں نے پھینک دیا......روند دیا سات سمندروں کے اَن گنت پانیوں میں بہا دیا لیکن وہ سخت جان وفادار پلے کی طرح پھر بھی میرے ساتھ ساتھ لگا رہا۔۔۔''

غزل جان، محمد اکرم اور نذیر احمد کا موازنہ کرنے لگی۔ اُس طرف اِتنا بڑا خویش قبیلہ محبت احترام، چھ بیٹے چار بیٹیاں، داماد بھانجے بھتیجے عزیز واقارب دوست احباب ہمسائے سب ساتھ جڑے ہوئے...... جانے والوں کو رُخصت کرنے والے آنے والوں کو خوش آمدید کہنے والے بے شمار۔۔۔ ذرا ذرا خوشیاں غمیاں نسلِ انسانی کی اِرتقائی نیچر اور براہِ راست وجود سے پھوٹنے والے اصلی سچے احساسات......ایک طرف نذیر احمد بڑی یونیورسٹی کا بڑا پلیٹ فارم جدید علوم کا بحرِ ذخار، نئ ایجادات فلسفوں اور جدید تجربات سے بہرہ ور عالم پروفیسر......علم کے بھرے سمندروں کی تیز رو موجوں کی زد میں آیا حقیر تنکا تنہا۔ علوم کے نہنگ کا معمولی نوالہ......عجب کہانی تھی جس کا جواب سامع کو دینا تھا۔ کون خسارے میں رہا کون نفع میں۔

نذیر احمد NZD ریٹائرڈ پروفیسر فزکس جو اپنی پینشن پر خوشحال زندگی جیتے ہیں لیکن خوش نہیں۔ تنہا بیمار، نرسیں ہسپتال۔ ٹی وی، خود کلامی کتابیں نیٹ ورک ساری دُنیا گھر کے باہر۔ گھر کے اندر تنہا ویران، گھر سے باہر بینچ پر اُونگھتے ہوئے منہ پر ہیٹ گرائے کسی گورے کی شبیہ بنائے لیکن گورا ستان انھیں خود میں سمونے کو تیار ہی نہ ہوا۔

عجب المیہ جس مقصد کے حصول کے لیے عمر صرف کر دی وہی منہ چڑانے لگا۔ رد، انکار بے دخلی......سبھی مصنوعی رشتے اپنے اپنے ساحلوں پر پھاند گئے اور یہ اپنی شکستہ کشتی میں ہلکورے کھاتے ڈوبنے لگے۔ اس کشتی کو ڈوبنے سے بچانے کو اس کا سامان سمندر برد کرنا ہوگا، شاید ہلکی پھلکی ہو جائے تو کسی کنارے سے ٹک جائے۔

NZD انتہائی احتیاط سے لفافے کھولنے لگے، جیسے ڈر ہو کہ اُن کے اندر بند، دنوں مہینوں اور برسوں کے کبوتر پھڑ پھڑا کر اُڑ نہ جائیں۔ انکل NZD بند لفافوں کے کبوتر یادوں کی خالی

کا بکوں میں بند کرنے لگے۔اب شاید چاچا نذیر احمد کہنا زیادہ مناسب تھا کیونکہ Nzd نے چھینی ہوئی فرصتیں نذیر احمد کو لوٹا دی تھیں۔کبھی نہ پڑھے گئے۔پچھلے پچیس برس کے جمع شدہ خط وہ پڑھنے لگے درمیانی خلا ایک لمبا منقطع تعلق، تمام حالات و واقعات کی کڑیاں غائب، یہ اِنقطاع، یہ اسقاط، بہت طویل۔زندگی کے آخری اور ابتدائی صفحے تو موجود درمیانی سب غائب۔خلا ہی خلا............

''تم نے اچھا کیا غزل جان۔اس سے شادی کی جو تمہارا ہم نسل تھا۔تمہاری خالص اولاد کا خالص باپ کبھی تم اُن کے سامنے شرمسار نہ ہوگی۔تم دوہری نفرتوں کا شکار نہ ہوگی۔اپنے ہی بچوں کی نفرتیں جب وہ تمہیں کوئی دوسرا سمجھنے لگیں۔تمہارے نام اور رنگت سے شرمانے لگیں۔تمہارا جیون ساتھی تمہیں Others کہے تمہاری اجنبی شکل اور اطوار سے اُکتا جائے اور تمہیں رد کر دے۔''غزل جان کو نفرتوں کی تلچھٹ میں بھیگتی راتیں بے طرح یاد آئیں لیکن بھسم دنوں کی راکھ سے بھی چنگاریاں پھوٹ نکلی تھیں۔خالص والدین کی خالص اولاد، زرتاج، مہرتاج شاہ تاج، ماہ تاج، تاج دار، تاجور۔وہ لب جن سے کبھی کسی لفظ کی ادائیگی اُس کے لیے نہ ہوئی۔وہ ہاتھ جن کو دن کی روشنی میں کبھی چھوا نہیں۔وہ جسم جس کی بساند اس کے لیے اُبکائی بن جاتی لیکن اسی کیچڑ سے نکلے موتی سے یہ چھ عدد تاج۔اُن دونوں کی شناخت سے شرمائیں گے نہیں کہ وہ خود اُسی شناخت سے پہچانے جاتے ہیں۔

تاج ور، زرتاج، تاجدار، مہرتاج، شاہ تاج، ماہ تاج، اُسے یہ نام رکھنے کی کھلی اجازت تھی، ورنہ وطنوں میں تو پوتوں پڑپوتوں کے نام رکھنے کا حق صرف بزرگوں کو حاصل ہے۔ یہ اس معاشرے کی دَین تھی کہ اس کے رکھے ناموں پر کسی نے اعتراض نہ کیا تھا۔

ہاں کبھی کبھار عثمان خان جیسے ہواؤں فضاؤں پر طنز کرتا۔

اگلے بچے کا نام ہم تاجِ برطانیہ رکھیں گے۔اس سے اگلے کا تاج و تخت۔اُس نے بھی فضاؤں ہواؤں کو مخاطب کیا تھا۔اُس سے اگلے کا نام تاراج رکھیں گے۔غزل جان کو عجب آسودگی محسوس ہوئی تھی جیسے اِنتقام لے لیا ہو، لیکن اُس تاج سے اِنتقام کیوں نہیں جو ان تمام تاجوں کی وجہ

تسمیہ تھا۔شاید ایڈز سے مر گیا ہو۔ اُس نے انتقاماً سوچا۔ زرینہ جان شکیلہ جان، فاطمہ جان کیا کبھی
ایسا بھیانک کچھ سوچ بھی سکتی تھیں۔ ان مردوں سے متعلق جن کے نام اُنھوں نے اپنے ساتھ
جڑے ہوئے پائے تھے۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتی تھیں کہ کس نے کب اور کیونکر جوڑ دیا تھا یہ نام اُن کے
نام کے ساتھ۔ اب چونکہ جڑ گیا تھا اس لیے اس نام کی پرستش بھی لازم ہوگئی تھی۔ اُن تک صرف یہ
احساس پہنچا تھا کہ اُوپر خدا ہے جو اَن دیکھا تصور ہے اسی تصوّر کی تجسیم زمین پر اسی ایک وجود میں مجسم
ہے۔ وہ بھی خدا جیسا ہی بے نیاز لاپروا اور دور اَن دیکھی دُنیاؤں میں بسا ہوا ہے۔ لیکن تنہائیوں میں
تاریک راتوں میں جانکنی کے لمحات میں وہ قریب آ جاتا ہے پھر سے دُور جانے کے لیے...... یہ آنکھ
مچولی کا کھیل کتنا کرب ناک، کتنا سحر انگیز ---- سامنے پارک میں انکل بند لفافوں کو کھول کھول کر
پڑھ رہے تھے، جنھیں کھولنے کا کبھی وقت بھی نہ مِلا تھا۔ بس کسی دراز میں کسی باکس میں بھرے رہ
گئے تھے۔ پتہ نہیں تیس پینتیس برس کا کوڑا کرکٹ پھینکا کیوں نہ جا سکا۔ کوئی لاشعور کی سازش سی --
بچھڑے ہوئے اُس چھوٹے سے گاؤں کو وہ پھر سے جی رہے تھے۔ وہ واقعات، حادثات اور
معاملات کو برسوں کی منڈیر سے جھانک رہے تھے۔ اِک عمر کا خلا تھا جسے بھرنے کو یہ پرانی ردی
موجود تھی۔ یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیاں کانفرنسز، سیمینار، لیکچرز سب گزر چکے زمانے موجود ایک
ہی تعلق ہمیشہ رہنے والا وہ گاؤں...... جو یاد رکھتا ہے پُرکھوں کو، سلسلوں کو جہاں پہچان خاندان کے
حوالوں سے ہوتی ہے۔ نذیر احمد کی پہچان بھی ضرور کسی بھولی بسری گلی میں موجود ہوگی۔ چودھری کرم
دین کا پوتا چودھری علم دین کا بیٹا اور پھر کڑیاں گم...... چودھری نذیر احمد کا بیٹا، پوتا سلسلہ موقوف......
گاؤں کے میراثی بھی پریشان رہے ہوں گے کہ گاؤں کا ایک خاندان ایسا بھی ہے جس کے نسب
نامے کا ایک سلسلہ مفقود ہے۔ نذیر احمد اگر گاؤں جائیں تو وہ یہ سلسلہ جوڑنے کے لیے بے قرار ہوں
گے۔ اب وہ ان پرانے خطوط کا جواب لکھنا چاہتے تھے لیکن پچھلے پینتیس برس سے اُس زبان میں
اس رسم الخط میں کبھی کچھ نہ لکھا تھا، جس میں اپنا بچپن تحریر کرتے رہے تھے اب جس زبان میں وہ
لکھتے تھے۔ اُسے پڑھنے والا شاید اب کوئی اس گاؤں میں پیدا ہو گیا ہو تو پتہ نہیں پہلے تو بس محمد اکرم

ہی تھا، لیکن وہ جس زبان میں پڑھتا تھا اُسے لکھنا وہ بھول گئے تھے۔

غزل جان نے اُن کے لیے خط لکھا۔

خط میں وہ سارے حالات لکھ دیئے جو پینتیس برس کی تگ ودو کے نتائج تھے۔ دو بچے اڈم اور میری۔۔۔ جن کے نام دو تہذیبوں کے اِشتراک کا حسین اِمتزاج تھا۔ نذیر احمد چاہے اُنھیں آدم اور مریم سمجھتے رہے ہوں لیکن وہ پورے اڈم اور میری ہی رہے اور اس اجنبیت کو ترک کر دیا جو اُن کے باپ کا نام بن کر اُن سے وابستہ ہوگئی تھی۔ The Others کی Embarrssment وہی شناخت جو نذیر احمد ترک کر چکے تھے، جو اس چھوٹے سے گاؤں میں مکئی باجرے کے کھیتوں میں وہ چھوڑ گئے تھے۔ فرنس آئل کے ہیٹر کے کنارے بیٹھے کبھی وہ الاؤ یاد نہ کیے جہاں ہاتھ تاپتے کچا گڑ اور مکئی کے دانے چھیل چھیل کھاتے تھے۔۔۔ انھوں نے تو لاہور کی سڑکیں اور بتیاں بھی فراموش کر دی تھیں جنھیں دیکھے بنا کوئی پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ اِک زمانہ، نئی معاشرت زبان اور افراد کو اپنانے اور اپنی اصل کو بھلانے میں صرف کر دیا۔ کتنی محنت خود سے اغماض برتنے کو کرنا پڑی لیکن کھلا یہ کہ وہ چاہے خود کو بھول جائیں لیکن اُن کی اصل کھونٹی پہ ٹنگی اُن کے ہمراہ ہمیشہ لٹکتی رہے گی۔ فاصلے پر کھڑی ٹھٹھہ اُڑاتی بتیسی نکالتی ان سے پہلے خود بڑھ چڑھ اپنا تعارف کرواتی، بڑی ڈھیٹ ہے یہ اصل بھی، سخت جان جس قدر کمزور جان یہ آدمی اتنی ہی سخت جان یہ اصل...... جونک جیسی جو نہ پنڈا چھوڑتی ہے اور نہ خود مرتی ہے۔ جتنا مارو مر مر کے جی اُٹھتی ہے۔ بڑی ڈھیٹ ہے یہ بندے کی اصل بھی۔ وہ اس زبان کو لکھنا بھول گئے جس میں اُن کی حقیقت لکھی گئی تھی لیکن خود حقیقت بڑھ بڑھ یہ بولی بولنے لگی اور وہ بولی جو وہ اپنا چکے تھے جس میں کلام کرتے ہوئے وہ سہولت محسوس کرتے تھے۔ وہ پھر بھی اُن کی ثانوی زبان کہلائی۔ اپنی فکری، مادری اور اوّلین زبانیں چاہے وہ فراموش کر چکے ہوں لیکن یہ زبانیں خود انھیں کبھی نہ بھولیں۔ اَن دیکھے خلیات کی طرح دل و دماغ میں حلول رہیں، جس طرح اُن کا ملکیتی فلیٹ گھر میں تبدیل نہ ہو سکا۔ وہی گھر جو اس ذرا سے گاؤں میں آج بھی موجود تھا، جس کا پتہ کبھی تبدیل نہ ہوا تھا، جب کہ یہاں وہ کئی پتے تبدیل کر

چکے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد والا پتہ یعنی آخری پتہ محمد اکرم کو معلوم نہ تھا اسی لیے پچھلے کچھ عرصے سے خط پہنچ نہ پا رہے تھے۔

کیا بڑی بڑی یونیورسٹیاں، کانفرنسز، تقریریں، لیکچر، سب ڈلیور ہونے کے بعد بھی گھر چاہیے ہوتا ہے۔ ایک ایسے گھر کی ضرورت جس کا پتہ مستقل ہو، جس کا ایڈریس کبھی نہ بدلے کہ جب بھی جو بھی پتہ لینا چاہے تو یہ مستقل پتہ موجود رہے، کبھی تبدیل نہ ہو، جو کبھی بھلایا نہ جا سکے۔ جو پرانے ملنے والوں کو مُدّتوں بعد بھی زبانی یاد رہے کہ ایسے پتے مکانوں کے نہیں آبائی بستیوں کے ہوتے ہیں۔ بستیاں بڑھتی پھیلتی تو ہیں پر ختم نہیں ہوتیں۔ اُن میں موجود مکانات نمبر نہیں مستقل پتے رکھتے ہیں۔

مستقل پتے والے اس گھر میں خط پہنچتے ہی جواب آیا۔

''گھر لوٹ آؤ جس کے دروازے پینتیس برس سے تمہارے اِنتظار میں کھلے ہیں۔ تمہارے مکان کی صفائی میری بہوئیں پچھلے پینتیس برس سے کر رہی ہیں۔ ساری برساتوں میں چھت پر مٹی ڈلواتا ہوں مرمت کرواتا ہوں۔ ہر چیز اپنی اپنی جگہ امن وامان سے پڑی ہے کچھ بھی ساتھ لانے کی ضرورت نہیں، سب موجود ہے۔ تمہاری منجی پیٹی موڑھا سب استعمال کے قابل ہے۔ بہت حفاظت کی ہے ہم نے تمہاری تمام اشیاء کی، سب چیزیں تمہارے اِنتظار میں بچھی ہیں۔ میری بیٹھک آج بھی بھری رہتی ہے۔ آج بھی پشاوری تمباکو کے حقے تازہ ہوتے ہیں۔ الا پچی والی چائے کے دور چلتے ہیں۔ میری بہویں ڈیرہ نبھانے کے سارے سلیقے جانتی ہیں۔ آج بھی سالن تمہاری بھرجائی سے پوچھ کر پکتا ہے۔ آج بھی فیصلے بزرگ ہی کرتے ہیں اور نوجوان تعمیل کرتے ہیں۔ یہاں زمانہ بدل کر بھی نہیں بدلا جب کچھ بدلا ہی نہیں تو تمہیں اجنبیت کا احساس کیسے ہوگا۔ نذیر احمد! میرے یار بڑھاپا بڑا ظالم ہے۔ سارے تعلق، سرگرمیاں، مصروفتیں چھین لیتا ہے بس یہ اپنے ہی ہیں، جن کے بوتے پر کٹ جاتا ہے۔ آؤ بڑھاپا مِل کر کاٹیں پرانی یادیں دُہرا کر نہیں نئی یادیں بنا کر''

''آؤ اپنی زمینوں میں نئے باغ لگائیں۔ آم امرود، مسمّی، کینو، کھجور کے باغ جن کے

پھل ہمارے بچے کھائیں، آؤ مویشی پالیں۔ دودھ دیتی بھینسیں، نسلی گائیں اوراعلیٰ اُون کی کھال والی بھیڑیں پالیں۔ کتنی مصروفیتیں تمہارے اِنتظار میں جھولی پھیلائے کھڑی ہیں۔ لوٹ آؤ کہ تاش کی بازیاں لگائیں اورالاؤ کے گرد بیٹھ کر کہانیاں کہیں سنیں۔'' آج پھر ہارٹ کور کی کینڈی سنگھ سے لڑائی ہوگئی تھی وہ واقعی اپنا اکلوتا بیگ اُٹھا کر چلا گیا تھا پھر سے لوٹنے کے لیے۔

''تسی جی اپنے ہسبنڈ نال گل بات نہیں کردے۔ میرا مطلب اے وا ئی ڈے ٹائم..... نائٹ ٹائم تے کھل کے کردے او، اُدھا رزلٹ تے سامنے آجاندا اے۔''

اُس کا جی چاہا کہے تم دن میں بھی کھل کر کرتی ہو لیکن رزلٹ پھر بھی نہیں آ رہا۔ نیچے پارک میں انکل بند لفافوں کو کھول کھول کر پڑھ رہے تھے، جیسے پینتیس برس کے درمیانی خلا کو پاٹنے کی کوشش میں ہوں۔ دونوں سروں کے بیچ سب خالی کو بھرنے کی کوشش ......مردہ کٹڑے کی کھال میں بھوسہ بھر کر ''مورا'' بنانے کی کوشش تھی۔ وہ دراز وقفہ جو NZD اور محمد اکرم کے بیچ آن پڑا تھا۔ وہ وقفہ جو اُس پسماندہ گاؤں اوراس جدید ترین یورپی شہر کے بیچ آن پڑا تھا۔ وہ زمانے جو نذیر احمد اور NZD کے بیچ حائل ہو گئے تھے۔

وہ رابطہ بحال کرنا چاہتے تھے کیونکہ کل صبح اُن کی فلائیٹ تھی جو اُنھیں خود سے ملنے خود اپنے آپ کے سپرد کرنے کو لے جانے والی تھی۔ وہ NZD سے نذیر احمد کی پوری شناخت پانے والے تھے۔ کوڈ ورڈز سے پورا نام مکمل پہچان وہ NZD سے پھر نذیر احمد بننے والے تھے۔ نذیر احمد کی پکار کچھ وقت کے لیے تو اُنھیں چونکا دے گی لیکن پھر خوشی محسوس کریں گے۔ اُن کا گھر ابھی موجود تھا۔ اُن کی اُڈیک ابھی باقی تھی یہ احساس ان سرد موسموں میں شاید پہلی بار حاصل ہوا تھا کہ کوئی ہے جو اِنتظار میں ہے۔

وہ رات گئے تک باہر لان میں بیٹھے اَن پڑھے پرانے خط پڑھتے رہے۔ سارے منقطع رابطوں اور حالات سے آگاہی حاصل کرتے رہے کہ وہاں کسی ناواقفیت کا احساس نہ ہو۔ غزل جان نے رات ہی وعدہ کرلیا تھا کہ وہ اُنھیں ایئرپورٹ تک پہنچائے گی۔ اگلی صبح انکل جاگے نہ

تھے۔ وہ بیل دیتی رہی دروازہ کھٹکھٹاتی رہی پر وہ تو گہری نیند سو گئے تھے، شاید خود سے ملنے کی خوشی برداشت نہ ہو سکی تھی۔ سارے اَن پڑھے خطوں کے سبھی حالات، مناظر واقعات شاید دماغ کی گنجائش سے زیادہ تھے۔ اتنی طویل قطع تعلقی تعلق نہ بن پائی تھی۔

اردگرد بکھرے ہوئے پرانے خطوں میں پھڑ پھڑاتے رابطے تعلق واسطے حالات وواقعات سارے حیران۔۔۔ وہ پھر ایک خط لکھے گی۔ ایئرپورٹ سے مایوس لوٹنے والے چودھری محمد اکرم کو اُردو زبان میں خط لکھے گی۔ نذیر احمد کے صفائی ہو چکے گھر میں پھوڑی پڑے گی۔ عورتیں اک دُوجی کے گلے لگ لگ دردناک بین ڈالیں گی۔ مرد توصیف بیان کریں گے۔ انکل نذیر احمد کے دُور پار کے رشتے داروں سے تعزیت کریں گے۔ سوئم، چار جمعراتیں باری باری عزیز و اقارب کروائیں گے، پھر پانچویں جمعرات پر چہلم ہوگا۔ قرآن خوانی، سورہ یاسین گٹھلیوں پر لکھ نکالتی عورتیں۔۔۔ لیکن یہ کیا کہ مقامی مسجد میں جنازہ تو سب نے پڑھا لیکن آٹھ دس مسلمان مرد ہی اس گمنام جنازے کی آخری رسومات نبھانے کو رہ گئے۔ ہر ایک کو اپنی اپنی ڈیوٹی پر جانے کی جلدی تھی۔ اس اجنبی میت کا کوئی نام تک نہ جانتا تھا۔ جنازہ پڑھنے کے بعد سبھی بکھر گئے۔ اسلامک سنٹر کے صحن میں میّت پڑی رہ گئی۔ جس کی قبر پر اب کبھی پھول نہ چڑھائے جائیں گے کبھی کوئی قرآن یا فاتحہ پڑھنے، مغفرت کی دُعا کرنے نہ آئے گا۔ کون جانے ان سبھی تکلّفات کا فائدہ مرنے والے کو کس قدر حاصل ہوتا ہے لیکن عزیزوں شریکوں کے سامنے وارثین کی عزت تو بن جاتی ہے۔ یہاں کون عزیز رشتہ دار ہیں۔ کونسا شریکہ برادری ہے۔ ہر کوئی آبائی قبرستان میں کیوں دفن ہونا چاہتا ہے۔ شاید یہی عزت جو شر موشری ہی سہی پر ملتی تو ہے ناشریکے برادری سے۔۔۔ غزل جان کو گراں کے قبرستان کا خیال آیا۔ گھر سے قدم باہر رکھو تو قبرستان بچھا تھا، گویا گھر آنگن ہو۔

یورپ کی کمائیاں قبرستان پر بھی کھل کر خرچ ہوئی تھیں۔ بڑے بڑے تعویزوں اور تھڑوں والی اُونچی لمبی قبریں انسانی جسامت کی نہیں بلکہ مشرقِ وسطیٰ کی کمائیوں کی پیمائش کے مطابق بنی ہوئیں۔ کتنے درود ختم ہوئے، رمضان میں کس کس قبر پر شبینے ہوئے۔ کون روزانہ قبر صاف کرنے

اور اگر بتیاں جلانے آتا ہے۔ کس نے بوندی بانٹی کہ دیگ چڑھائی۔ دیگ گوشت والی کہ چنوں والی چنے قابلی کہ کالے۔ حلوہ کھوپرے باداموں والا کہ خالی۔ قبروں سے محبت اور ارادت کے معیارات متعین تھے۔ رمضان اور محرم کے دنوں میں گھر کی عورتیں قبریں دھونے، انہیں ٹھنڈی کرنے پھول ڈالنے کو کتنی بار آئیں۔ کتنے قرآنِ پاک ختم کروائے۔ سب حسابات سبھی کو معلوم ہوتے تھے۔ خاندان کی عزت اور توقیر کے معیارات۔

انہی قبروں میں زرینہ جان کے فوجی کی قبر بھی تھی، جسے وہ روز عرق گلاب سے دھوتی چنبیلی کی عطر خوشبو سے معطر کرتی تھی ہر روز گھنٹوں تلاوت کرتی۔ قرآن پاک کے حرف کثرتِ قرأت سے مٹ گئے تھے لیکن غائب حرف اُسے زبانی یاد تھے۔ دوسری باعزت قبر امیر جان کے شہید کی قبر تھی۔ یہ قبریں تو شاید عورتوں کے رونے کے لیے بنائی جاتی ہیں کبھی زمین پر، کبھی دلوں میں دیوارِ گریہ۔ اُس کے دل میں بھی ایک قبر بڑی پرانی کھدی ہوئی ہے، جس پر اُس نے کبھی پھول نہ چڑھائے تھے، کبھی فاتحہ نہ پڑھی تھی۔ بوندی نہ بانٹی تھی کبھی بال کھولے روئی نہ تھی، لیکن وہ قبر موجود تھی۔ زرتاج، مہرتاج، شاہ تاج، ماہ تاج تاجور اور تاجدار۔

اس قبر کے تعارفی تعویز تھے یہ سارے تاج۔

دن رات ٹیکسی چلانے والا شاید کبھی نہ سوچتا ہوگا کہ آخر اُس کی ہر اولاد کے ساتھ یہ تاج کون ہے جو جڑ جاتا ہے۔

تاج جو خواب کی طرح آیا اور بھیانک تعبیر کی طرح اس کی زندگی سے نکل گیا، لیکن اُس کے دل کے کورے کاغذ پر پڑنے والے وہ پہلے پہل قدم نقش کالحجر ہو گئے۔

کیا وہ بھی زرینہ جان شکیلہ جان کی طرح سینے میں کھدی اس قبر پر بال کھولے بین ڈالتے مجاور بنے خود ہی اپنی میت پر روئے۔

کئی بار تو غزل جان نے میّت کے احترام میں دردناک بین کرنے بھی چاہے لیکن یورپ کی ٹھنڈی برفیلی فضاؤں میں آنسو بھی یخ ہو کر جم گئے تھے شاید۔ اپنے دیسوں کی گرمی ہے کہ یہ

نمکین پتھر ہمیشہ سیال حالت میں رہتا ہے۔ جب چاہو گرم کھارا پانی، آنکھوں کی باؤلیوں سے بہا دو۔ یہاں سب یخ جما ہوا برف زار آنسو ہیں کہ آئیس کیوب میں فریز۔

جسبیر کور کا فلیٹ مٹھائیوں کی خوشبوؤں میں رچا تھا۔ شیرے میں لتھڑی مٹھائیوں کی باقیات کوڑے دان میں ڈالنے کو وہ باہر نکلی تھی۔

''ویر جی ٹھیک ہیں۔ ہائے ربا سب کو ہرانے والا یہ ملک ان ظلمی بیماریوں کو نہ ہرا سکا، دیکھو تو اِتنی خالص غذائیں خالص ہوائیں اور دوائیاں پھر بھی کیسی کیسی مرضوں میں جکڑے گئے ویر جی شوگر، بلڈ پریشر، گردے، جگر۔''

جسبیر کور نے گند کا شاپر کوڑے دان میں ڈالا اور راز داری والا چہرہ اُس کے قریب لے آئی۔

''گڈی گلی زنانی فیروی جیوجاندی اے پر کلا مرد اکلاپے دی کاڈ نہیں کڈ دا۔۔۔ تیری ماں نال ہوندی نا تے حالی وی اے جوان ہوندے۔'' غزل جان کا جی چاہا کہے آپ بھی تو ساتھ ہی تھیں۔

یہ دونوں پچھلے تیس برس سے زائد عرصہ سے ایک بلڈنگ میں ایک روزگار میں بندھے چلے آئے ہیں لیکن اتنے ہی دور اور الگ الگ جتنے دور اسلام اور ہندومت، ہندوستان اور پاکستان جیسے دونوں کے بیچوں بیچ کشمیر آن پڑا ہو۔ فرق اِتنا ہے کہ جسبیر کور کی کمائیاں یہیں ہارٹ کور کے لیے جمع ہوتی رہیں اور اصغر خان کی کمائیاں دیسوں میں کوٹھیاں بنانے اور کاریں خریدنے میں صرف ہوئیں، بڑی بڑی تعمیریں کروانے والے خود اِنہدام کا شکار ہونے لگے۔ تعمیریں پھولنے پھلنے لگیں۔ اِک عرصہ چوہوں کی طرح غیر قانونی بلوں میں گھسے رہنے والے جب قانونی باشندے کہلاتے تو یورپی نیشنلٹی رکھنے والے یہ دیسی مرد اُن بیماریوں میں جکڑے جاتے ہیں، جنھیں اب تو وطنوں میں بھی شکست دی جا چکی ہے، لیکن اکلاپے کی مار سہنے والے ان بیماریوں سے ہار جاتے۔ جن کی کمائیوں سے اُن کے گراں بھی یورپ کا نقشہ پیش کرنے لگے تھے لیکن اس نقشے کی تعمیر کے لیے اپنے خوابوں کا سودا کرنے والے، خود کتنے تہی دست اپنے سارے لگتے لانے

یہاں سیٹل کرنے والے خود کتنے تنہا۔

نہ بیٹھکیں نہ چوپالیں نہ ڈیرے نہ ویہڑے۔

غزل جان کو عجیب سا خیال آیا اگر دونوں اکیلے ایک ہو جائیں۔۔۔ پر دونوں کبھی نہ مانیں گے۔

ویر جی۔بہن جی۔۔۔کا مصنوعی تعلق نبھاتے تین دہائیوں سے زائد گزر گیا۔

اب لوگ کیا سوچیں گے یہی نا کہ پہلے روز سے ہی ناجائز تعلقات استوار تھے۔بس صنوبر جان کی رکاوٹ دور ہونے کے منتظر تھے۔ جسے غزل جان، مریم جان کی رخصتی کی وسل نے باندھ رکھا تھا جیسے ہی یہ وسل بجی اس کی گاڑی بھی چھوٹ گئی۔ جینے کا کیا جواز باقی تھا۔نہ بیماری نہ ہسپتال نہ تیمارداری نہ عیادت داری۔جیسے چپکے سے جی ویسے چپکے سے مرگئی اور چھوڑ خود غزل جان منہ پر نہ پہنچ پائی تھی،لیکن اصغر خان تو ابھی زندہ تھا اور مرد تھا۔کیا یہاں بھی لوگوں کے پاس اِس طرح سوچنے کا وقت ہے یہ جو دِن رات بالکنیوں سے لٹکتی ہاٹ کور اور کینڈی سنگھ کی لڑائی کا لطف اُٹھاتی اور وطنوں سے منگوائی گئی بہوؤں کو گول پھلکا نہ پکانے کے طعنے دیتی رہتی ہیں۔ان کے منہ میں تو چیونگم آ جائے گی،دن بھر جگالی کرنے کو اگر وہ ڈیڈی کو واپس گراں لے جائے تو کون ہوگا جو اِس دولت مند بوڑھے کو اپنی نوجوان لڑکی نہ دے گا۔پھر ہوسکتا ہے کہ اسلام آباد اور پنڈی میں بنائی گئی بڑی بڑی کوٹھیوں کو کوئی نرینہ وارث بھی مِل جائے۔ستر سال کا بابا یہ تھوڑی سوچے گا کہ جائز کہ ناجائز۔۔نر بچے سے نسل چلے گی۔باپ دادا کا نام قائم رہے گا۔

غزل جان کو ولائت پلٹ وہ بابا یاد آیا جو ”صاحب“ کہلاتا تھا۔صاحب ہر وقت سوٹ میں ملبوس ہاتھ میں چھڑی اور سر پر ہٹ رکھے صبح وشام چہل قدمی کرتا انگریز معلوم ہوتا تھا۔جس پر سے مغرب کے بے شمار موسم گزرے اور اپنا رنگ ثبت کر گئے تھے۔جس کی دیسی جِلد پر یورپی برف کے جھالوں نے سرخ وسفید غازہ مَل دیا تھا۔جس کی دراز قامت اور کھلے ہاتھ پیر والے وجود پر مغربی لباس ایسے ہی فٹ آتا تھا جیسے کوئی انگریز ڈیوک،جس کی پوٹھواری زبان پر انگریزی لب ولہجہ اس

قدر چڑھ گیا تھا کہ ہر کوئی دیکھتے ہی پکار اُٹھتا۔

''صاحب۔''

لیکن صاحب بننے انگریزی بولنے، پہننے اوڑھنے خود پر اِشتہار بنا کر سجانے کے باوجود اُس کی انگریز بیوی اُسے چھوڑ گئی تھی۔ دونوں بچے بھی چھوڑ گئے تھے۔ سب کچھ بدل ڈالنے پر بھی اس مٹی اس زمین نے بدیسی نسلوں کو باہر اُچھال مارا تھا۔ یہ دیسی پودا یورپی زمینوں میں گا چی پکڑ کر بھی آخر سوکھنے لگا تو اپنی گا چی اُٹھائے اپنی مٹی میں لوٹ آیا۔ یہ صاحب جو اپنے ہمراہ یورپ اُٹھائے پھرتا تھا۔ اسی یورپ کے جلوے سے رُعب سے دیسی سڑکوں کے لوگ راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

دُکان دار قیمتیں ڈالروں میں بڑھا دیتے تھے اور وہ بنا بھاؤ تاؤ ادائیگی بھی کر دیتا تھا۔ بھانجے بھتیجے نوکر ڈرائیور گھر کی عورتیں اُسے ایسے ہی بے وقوف بناتے، جیسے یہاں آنے والے گوروں کو۔۔۔ چالیس برس کا خلا بہت کچھ اپنے ہمراہ لپیٹ لے گیا تھا۔ ترقی اور لالچ کے ان چالیس برسوں میں پاکستانی معاشرہ جس قدر شاطر، بے حس اور خود غرض ہو چکا تھا وہ کیسے جان پاتا۔ وہ تو وہیں سے شروع کر رہا تھا جہاں سے چھوڑ کر گیا تھا۔ گویا جو سرا چھوڑا تھا، وہ چالیس برس میں گنجلک اٹی بن چکا تھا۔ ان برسوں نے یہاں انسانوں کو جس قدر تبدیل کر دیا تھا۔ اتنا تو یورپ کی سائنس اور ٹیکنالوجی نے بھی وہاں کے انسانوں کو تبدیل نہ کیا تھا۔ جس قدر ذاتیات میں اِنقلاب برپا ہوا تھا۔ اُسی قدر معاشرے میں تخریب حرص و جاہ آسائشات کی تمنا منہ زور ہو چکی تھی۔ چالیس برس کا خلا دماغ کا، سوچ کا، تسلسل برقرار نہ رکھ سکتا تھا، لیکن صاحب وہیں سے شروع کر رہا تھا جہاں سے منقطع کر کے گیا تھا۔ ریشم کا کیڑا خود دو جودائی پر ریشم بُن رہا تھا۔

صاحب کی سات بہنوں درجنوں بھانجوں بھانجیوں نے صاحب کی شادی اٹھارہ برس کی حسینہ سے دھوم دھام سے رچائی تھی۔ ڈھول اور شہنائی والوں کو ویلیں بھی ڈالروں میں کروائی گئی تھیں۔ اُس روکھی پھیکی شادی کا جیسے ازالہ کرنا ہو، جو کبھی چرچ کے میکانکی ماحول میں انجام پائی تھی۔

صاحب نے بھی دل کھول کر ڈالروں کی ایکسچینج لٹائی تھی۔

ویر میرا گھوڑی چڑھیا
دیساں دا راجا میرے بابل دا پیارا
امبڑی دے دل دا سہارا
ویر میرا گھوڑی چڑھیا

وہ ارمان جو پیپر میرج اور چرچ کی سنسان وسعتوں میں گم ہو گئے تھے پھر سے جوان ہو گئے تھے۔ بہنوں بھانجیوں کی ڈھولک بھانجوں سالوں کے بھنگڑے، پھولوں کی چنگیریں گیندے چنبیلی گلاب کے ہاروں سے سجی ہوئی سیج۔ جس میں گہنوں سے لدی اٹھارہ برس کی نوخیز ارمانوں میں گندھی دُلہن......اس چھپر گھٹ میں گزری سہاگ کی راتیں نجانے کتنی جوان تھیں۔ شراب میں گچ کتنی بھیگی یا خشک تھیں، لیکن اگلے ہی برس چاند سا بیٹا وارث بنا دیا تھا۔ صاحب کی کوٹھی جو لندن کے کسی ڈیوک کے محل کی نقل میں بنائی گئی تھی۔ اپنوں اور شریکوں سے بھری رہنے لگی۔ ساتوں بہنیں اپنے وسیع وعریض کنبوں کے ہمراہ یہیں مقیم ہو گئیں جن کی کفالت صاحب جیسا ڈیوک کر سکتا تھا۔ ''صاحب کی کوٹھی'' پورے پوٹھوار میں مشہور تھی۔ دُور دُور سے لوگ دیکھنے کو آتے تھے۔ صاحب کی دُلہن کا خاندان بھی یہیں مقیم تھا۔ صاحب کو خاندان میں پہلی بار وہ مرکزیت حاصل ہوئی تھی جس کا یورپ میں تصور بھی ممکن نہ تھا۔

وہ بیوی جو اُن سے بے لوث محبت کرتی تھی۔ وہ بیٹا جو ولائت کی دولت سے بنائی گئی پوری جائیداد کا تنہا وارث تھا۔

صاحب کو پہلی بار گھر گرہستی کی بے پناہ خوشی میسر آئی تھی کہ ایک روز ٹرین کے سفر کے دوران، دروازے میں کھڑے صاحب کو کسی نے پنڈی کی پہاڑیوں میں سے گزرتی گاڑی میں سے دھکا دے دیا۔ گاڑی دھڑک دھڑک یورپ پلٹ کو دیسی پٹڑیوں پر کوٹتی کاٹتی قیمہ بناتی گزرتی چلی گئی۔ چھک چھک چھاں چھاں......

اب جو ولائت کی دولت سے بنی جائیداد کے لیے لڑائیاں اور اِلزامات شروع ہوئے گرد

پورے پوٹھوار میں اُڑی، جسے کم مِلا اُس نے صاحب کی ہلاکت کا الزام اُس پر لگایا جسے زیادہ ملا ٹین ایجر بیوی اس الزام کی زد میں زیادہ شدت سے آئی جس کا چند ماہ کا بیٹا وارث تھا۔ اُسے خوف تھا کہ گھر میں بھری سات پھوپھیاں اور اُن کے بے شمار بچے اس وارث بچے کو کہیں زہر نہ دے دیں۔ اس بچے کی حفاظت کے لیے اُس نے اپنے کڑیل جوان کزن کو گارڈین کے طور پر رکھ لیا۔

بوڑھے صاحب کے نومولود بچے کی حفاظت پر مامور کر دیا۔ غزل جان کے اِرادے ڈھ گئے۔

وہ اپنے باپ کی عمروں برابر تنہائی کا جو مداوا سوچ رہی تھی۔ وہ صاحب کی یاد نے کٹھائی میں ڈال دیا تھا۔

جسبیر کور کا فلیٹ مٹھائیوں روغنیات اور عرقیات کی خوشبوؤں میں رچا ہوا تھا۔

''ویرجی ٹھیک ہیں کل سے دیکھا نہیں۔''

غزل جان کے حوصلے پھر ڈھ گئے۔

یہ مشرق نہ کبھی اپاہج رشتوں، منہ بولے بہن بھائیوں اور عقیدتوں مذہبوں سے باہر آئے گا نہ ہی انسانوں کو اپنی مرضی سے کھل کر جینے دے گا۔ موت تک پیچھا کرے گا۔ مار کر چھوڑے گا۔ قبروں میں ساتھ ہی جائے گا۔

ڈیڈی جی کی تنہائی کا کوئی علاج ممکن نہ رہا تھا۔

ڈیڈی جی کی نسل تو اپنے پیچھے لگے گاؤں سے کبھی چھٹکارہ نہ پا سکی تھی۔

بیویاں وطنوں میں اِنتظار کے چرخے میں وجود کی پونی کت کت اُلجھی اٹی کے دھاگوں میں ریشم کے گھونگے سی گھٹ مرتیں۔ یہ اجنبی زمینوں کے کھردرے لمس میں پاؤنڈز ڈالروں کو گن گن کر وطنوں میں بھیجنے والے، جیسے ان گڈیوں میں اپنی سانسیں بھی مقید کر کے بھجوا رہے ہوں۔ یہ مشرقی مرد بیویوں سے دُور چوپالوں بیٹھکوں سے الگ، لیکن شراب خانوں اور نائٹ کلبوں کے دروازے بھی جن پر یہاں مذہب اور مشرق دونوں مِل کر بند کر دیتے ہیں۔

مذہب اور معاشرت میں ناجائز قرار پانے والا وہ حوصلہ اور عیاشی کو انجوائے کرنے والی خود اعتمادی یہاں بھی مفقود رہتی ہے۔

بیوی والی عیاشی بھی وطنوں میں ہی چھوٹ گئی۔ ولائتوں کے پیسے گنتی ساس نندوں اور شادی کی واحد نشانیاں دو تین بچے جو برسوں بعد ولائت پلٹ شوہر کوکھ میں رکھ واپس پرواز بھر جاتا تھا۔ چند دِنوں کے وصل کی یہ نشانیاں جیسے جیسے بڑھتی تھیں اُسی طرح وہ سکڑتی اور مرتی رہتی تھیں۔ ریل گاڑیوں کی سیٹیوں کا اِنتظار فضاؤں میں مدغم جہازوں کی گڑگڑاہٹ میں سمٹ گیا تھا لیکن اِنتظار کے اَن گنت دِنوں کا شمار عمر کا حاصل بنا رہا۔ لیکن صنوبر جان نے تو اس انتظار والی اکلوتی مصروفیت کو بھی وجود کے کھکھل سے دیس نکالا دے دیا تھا جب جینے کا کوئی لوبھ بچا ہی نہیں تو پھر زندگی نے اُسے دیس نکالا دے دیا۔

پھر ڈیڈی جی کا کیا ہوگا۔

یہ کیسی کلاس ہے جس کے لیے دونوں براعظم تنگ پڑ گئے ہیں۔

ڈیڈی جی اب اولڈ ایج الاؤنس پر ریٹائرڈ زندگی جی رہے تھے، اگر وطنوں میں چلے جائیں تو اُنھیں چاند سی دلہنیا مِل جائے گی جو زرتاج سے تھوڑی بڑی ہوگی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ایک چاند سا بیٹا وارث کے طور پر دے دے۔ ڈیڈی جان اولادِ نرینہ کا تفاخر اور اعتماد بھی مرتے مرتے حاصل کر سکتے ہیں۔ پھر صاحب کی ریل گاڑی کے پہیوں تلے رُندھی ہوئی لاش نظروں میں گھوم گئی۔

''ہاٹ کور اس بار کرسمس پر نہیں آئے گی کیا۔'' وہ چاہتے ہوئے بھی جسبیر کے اصرار کے باوجود اُسے ماسی چھوڑ آنٹی بھی نہ پکارتی تھی۔ ''نہ وہ تو پیرس جا رہی ہے۔ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ حرام جادی ساری عمر بوائے فرینڈ ہی رکھے گی۔ تو اُس کی عمر میں چھ بچوں کی ماں بن چکی ہے بھرا بھکنا گھر۔۔۔ وہ بس کدکڑے لگاتی پھرے گی۔ دولتیاں جھاڑتی رہے گی۔''

اُس نے سوچا یہ سارے تاج اُس کی کامیاب ازدواجی زندگی کے گواہان ہیں۔ وہ جہاں جائے گی اپنے ایال کے ہمراہ ایک بھرپور زندگی کا تاثر لے کر جائے گی۔

''اچھا ہے انجوائے کر رہی ہے۔''

''کھہہ انجوائے سارا گناہ۔۔۔ ہمارے ویلوں میں کوئی ایک بار پکڑی جائے تو وڈ کاٹ کے ٹوٹے نہر میں بہا دیتے۔۔۔۔

مناتی رہے اکیلی کرسمس۔''

غزل جان نے سوچا اس یورپ میں جہاں وطنوں کے طور طریقے ہجرت کر آئے ہیں۔ جو قدآور درختوں کے تنوں سے خودرو بیلوں کی طرح لپٹنے لگے ہیں، وہیں تہواروں اور خوشی کے دنوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہے۔

کرسمس، ایسٹر، عیدیں شب راتیں، ہولی دیوالی ایک دوسرے کو محسوس کرنے کے لیے ان کے علاوہ کتنے دن مزید مقرر کر لیے گئے ہیں۔

مدرز ڈے، فادر ڈے، چلڈرن ڈے، ویلنٹائن ڈے پتہ نہیں کیا کیا۔ اتنے دن کہ پکڑ پکڑ یاد دلاتے ہیں کہ ہم ہیں ہم ہیں۔ رِشتوں کی یاد آوری سے بندھے ہوئے دن۔ سامنے پارک میں سارے تاج کھیل رہے تھے۔

جنگلے کے ساتھ ساتھ برف کے ڈھیر چڑھے تھے۔ بڑی تاج، زرتاج چمڑے کے دستانے پہنے برف کا سنٹا کلارک بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ باقی پانچوں تاج برف کی مٹھیاں بھر بھر اپنا اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چھوٹا تاج اُس کی گودی میں تالیاں بجا رہا تھا۔ بڑی تاج چھوٹے بہن بھائیوں کو ڈانٹ رہی تھی کہ اُس کی تعمیر کو وہ خراب کر رہے ہیں۔ ناک کو زیادہ بھدا بنا رہے ہیں۔ گال زیادہ چپٹے کر رہے ہیں۔ لال ٹوپی پر برف ڈال رہے ہیں۔ وہ سبھی یورپین لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے لڑ رہے تھے۔

باسٹرڈ۔

بڑی تاج کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔

F##k you.

غزل جان نے جھپٹ کر اُس کی لمبی پونی نوچ لی۔ چھوٹا تاج دھاڑ دھاڑ رونے لگا۔

''بے حیا۔ بے شرم۔''

''مام''

زرتاج چیخ پڑی جیسے کہتی ہو آپ پاگل ہو مام! میں ابھی پولیس کو کال کرلوں گی اُس کا احتجاج بڑا شدید تھا۔ یہ گالیاں یہ Slang زبان اس کے سکول میں عام مروّج تھی۔ یہ اُس کا بنیادی حق تھا کہ وہ اُس زبان کو اپنائے جو مروّج ہے اگر یہ ماں باپ نہیں چاہتے تو بچوں کو وہیں لے جائیں، جہاں اُن کی پسند کی زبان لباس اور ماحول مروّج ہے۔

وہ اُن کے ساتھ ہمیشہ پوٹھواری بولتی تھی۔ وہ سمجھتے بھی تھے، لیکن بولتے ہرگز نہ تھے۔ وہ کوشش کر کر تھک ہاری۔ جس زبان کو بولنے میں اُنھیں سہولت تھی۔ اُن کے اردگرد سکول میں شاپنگ مالز میں جو باسہولت ہے وہی تو استعمال کریں گے۔ ایک یا دو افراد کی بولی کتنی مشکل ہے چاہے وہ اُن کی مادری زبان ہی کیوں نہ ہو۔ گروہ کی سماج کی زبان آسان ہے چاہے وہ اُن کی ثانوی زبان ہو۔ رابطے کی زبان زیادہ اہم ہے۔ اُن کی مادری زبان تو اُن کی فکری زبان نہیں ہے، وہ انگریزی میں سوچتے اور خواب دیکھتے ہوں گے۔ جس زبان میں وہ خواب دیکھتے ہیں وہی اُن کی زبان ہے۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ عثمان خان کو کہے کہ اَب وقت آ گیا ہے کہ ان بچوں کو یہاں سے شفٹ کروا دیا جائے۔ اُسے ورکنگ ریلیشن شپ قائم کرنا چاہیے۔ وہ ایک ہیجانی فیصلے کے ساتھ اس سمت بڑھی، جہاں وہ اُونگھ رہا تھا۔ وہ رات دو بجے کے بعد ٹیکسی واپس لایا تھا اور اُوین میں پڑا باسی کھانا گرم کر کے کھایا تھا۔ وہ بنچ پر جا کر بیٹھی تو وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا، جیسے کوئی غیر شرعی فعل ہو گیا ہو۔ وہ دونوں دن کی روشنی میں اکٹھے ہو گئے تو گناہ سرزد ہو جائے گا اُسے اس تیزی سے بھاگ نکلنا چاہیے کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ دن کی روشنی میں اُن دونوں نے کبھی ایک دوسرے کی طرف نگاہ نہ اُٹھا کر دیکھا تھا۔ شب کی نیم تاریکیوں میں بھی کبھی نگاہیں نہ ملی تھیں۔ غزل جان نے غصے بھری سیدھی نگاہ پہلی بار ڈالی۔ اُس پر اِنکشاف ہوا۔ اس عرصے میں عثمان خان کے بال سفید

ہور ہے ہیں۔جھڑ بھی رہے ہیں وہ بھی اس سرد خانے میں جم رہا ہے۔کمزور ہورہا ہے۔

''میں چاہتی ہوں اور بچہ نہ ہو۔

''جیسے تمہاری مرضی۔''

''اس کا کوئی علاج کروانا ہوگا۔''

جو تمہاری مرضی۔''

اگر وہ کہتی کہ اس کا علاج یہ تجویز کیا ہے میں نے۔۔۔کہ تم آئندہ میرے بستر کے قریب پھٹکو گے بھی نہیں تو وہ جواب دیتا۔

''جیسے آپ کی مرضی۔''

پھر اس جواب کے بعد تو وہ بہت قلاش ہو جاتی پھر کچھ عرصے میں نفسیاتی مریضہ بن جاتی۔

وہ شب کی تاریکیوں میں جسے تاج کے مغالطے میں چوم لیا کرتی تھی اُس سے دُوری کیسے جھیلی جاتی۔اگر یہ سیرابی رُک گئی تو وہ پھر کرنڈ ہو جائے گی۔خشک بھوکی پیاسی کلراٹھی زمین۔۔۔

یہ کاروبز جاری رہنا چاہیے۔

''جیسے آپ کی مرضی۔''

وہ اُٹھ گیا۔

اُس کا جی چاہا وہ چیخے چلائے اُس پر حملہ آور ہو جائے منہ نوچ لے۔

میری مرضی تو یہ بھی ہے کہ تم میری مرضی سے اِختلاف کرو مجھ پر چیخو چلاؤ۔زدوکوب کرو۔ شب کی تاریکیوں میں سیندھ لگانے کی بجائے سیدھے چلے آؤ،جس طرح پارک کے دوسرے بینچ پر جڑا وہ گورا جوڑا......دُنیا و مافیہا کو بھلا چکا تھا۔اسی طرح تم بھی خود کو بھلا دو مجھے بھی خود کو بھلانے دو جس طرح یہ جوڑا۔

وہ بچوں کو یکبارگی ہیجانی انداز میں پکارنے لگا۔''اندر چلو گھر چلو ہوم ورک کا وقت،قاری صاحب کا وقت،نماز کا وقت۔۔۔اُٹھو اُترو۔۔۔جھولے سے۔۔۔''

وہ زرتاج کو گھسیٹتا ہوا لفٹ میں داخل ہو گیا۔ پیچھے پیچھے وہ باقی سارے تاجوں کو سمیٹے ہوئے۔ کتنا بھراپُرا گھرانہ، خوشحال ازدواجی زندگی کا نمونہ، اتنے ڈھیر سے تاجوں سے چھلکتا ہوا جو نام دے گیا تھا ان سب کو، پتہ نہیں اُس کا اپنا نام کیا تھا۔ پوچھنے جاننے کا تو وقت ہی نہ ملا تھا۔ وہ تاج محل کی سرزمین کا باسی تھا تو یہ نسبت ہی محبت کے لیے کافی تھی۔ اس ورکنگ ریلیشن شپ کی چھپی خواہش نے خود کو لفظوں میں اُنڈیل دیا۔

''بچیوں کا ساتھ ہے۔ واپس وطنوں کو لوٹ چلیں۔''

''لیکن وہاں کریں گے کیا۔''

یہ جملہ اُس نے خود سے زیریں زباں میں پوچھا تھا، جیسے کہتی ہو فیصلہ تو سنا دیا انجام کیا ہوگا۔ مٹھائی کی یہ دُکان جس کی مٹھائیوں کا ذائقہ اب گوروں کو بھی لگ چکا تھا۔ اُس کے سارے مزے اور ذائقے تو جسبیر کور کے ہاتھوں کے محتاج تھے وہ تو یہیں رہ جائیں گے۔

یہ ٹیکسی جو دن رات ان کشادہ سڑکوں پر دوڑتی پھرتی ہے وہاں تو اسے چلانا نیچ پیشہ سمجھا جائے گا تو پھر۔۔۔ ورکنگ ریلیشن شپ کیا اتنی مضبوط ہو سکتی تھی کہ چند دنوں کے تعلق کی بنیاد پر وہ دونوں خانگی مسائل کو زیرِ بحث لانے لگیں۔

پتہ نہیں اُس نے یہ فیصلہ پوٹھوار کی باقی ماندہ صفات کی منہ زوری پر تن تنہا کر لیا تھا۔ شاید مقصد غزل جان کے حکم کی فوری تعمیل تھی کہ فیصلے کی محض اِطلاع، جس طرح فیصلوں کی اِطلاعات عورتوں کو پوٹھوار میں دی جاتی تھیں۔ اب چاہے روتی پیٹتی رہیں کہ خوشیاں منائیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے چوے میں تڑپتی مچھلیاں غوطا کھا جاتی تھیں، جیسے پہاڑی ندی میں بھری جونکیں پانی پیتے مویشیوں سے چپک جاتی تھیں۔ ایسے ہی یہ فیصلے اچانک غیر متوقع کیا...... وہ چلے جائیں گے اپنی مذہبی اور مشرقی روایات کو محفوظ کرنے کو۔ بچیوں کو اس Incubator میں آکسیجن لگانے کو جہاں وہ اُن کی خواہش کے مطابق زندہ رہ سکیں، بگڑی نسل زندہ تھوڑی ہوتی ہے۔ ان کے لیے تو ماں باپ خود بددعا کرتے ہیں، جب اُن کی دُعائیں بے کار ہونے لگتی ہیں تو پھر بددعا، اپنے یا پھر

اُن کے مرجانے کی بددُعا۔۔۔زندہ رہنے کے لیے جو دستور معاشرے نے ساخت کر دیا ہے اس سے اِنحراف بغاوت ہے بگاڑ ہے، لیکن ڈیڈی جی تو کبھی اس شہر کو نہ چھوڑیں گے جس کی اجنبیت کلبوت ہو چکی ہے۔اس یورپ کا یہی تو فائدہ ہے۔تنہائی کی عمر میں سنئیر سٹیزن کی سہولیات کی سنگت میں مرنا آسان ہو جاتا ہے۔وہ نہیں جائیں گے کہ جن مٹھائیوں کا ذائقہ خوشبوئیں، روغنیات اور عرقیات نے پوری عمر کو سینچا تھا وہ سیرابی تو یہیں بہتی تھی۔ یہ زمینیں تھوڑا تھوڑا نوچ لیتی ہیں، اپنے پاس گروی رکھ لیتی ہیں۔مٹی کو مٹی سے چاہ ہوتی ہے۔ ہر زمینی مٹی انسانی مٹی سے چھووا چھووا توڑ لیتی ہے۔خود میں سمو لیتی ہے، پھر اس دھول کے ڈھیروں سے اپنے انگ اپنی مٹی تلاش کرنا اور شناخت کر کے اُٹھا لینا ناممکن ہو جاتا ہے۔

کیا غزل جان اس زمین کو چھوڑ جائے گی یہاں کی مٹی اس پر بھی تو اپنا حق جمائے گی، جس کی فضاؤں ہواؤں میں تاج کی خوشبو رچی ہے۔وہ ناک بند کرتی ہے۔نتھنوں پر بہتیرا ہاتھ دھرتی ہے لیکن افیون سی مہک سر کو چڑھتی ہے۔ یہ تاج تو کسی سستے نشے جیسا افیون جیسا گھلی ہوئی بھنگ جیسا، جو ہوش مار دیتا ہے۔

وہ نوچ ڈالے گی اپنے پورے وجود کو بالوں کو۔۔۔نوچ نوچ گنجی ہو جائے گی۔ ماجی جیسی گلابی گلابی لاروؤں جیسی ننگی جلد......اُن گرم زمینوں اور سنگلاخ چٹانوں والی خشک ہوائیں اُسے اُڑا لے جائیں گی۔

پھر ایک اجنبیت......ایک جلاوطنی کے مقدر میں کئی جلاوطنیاں لکھی گئی ہیں۔ یہ شاید آبائی زمینوں کی بددُعا ہے جو سیدھی براعظموں کو چیر جاتی ہے، جن زمینوں کی مہک برسوں عمروں میں بھی چھٹتی نہیں ہے۔اُن بھٹوں کی خوشبو جو سوسو پردوں میں لپٹی نو لاکھ موتی جڑی مچھلیاں ٹانڈوں میں ہی لگی چھوڑ دی جاتیں۔ بوٹے زمین سے اُکھیڑ کر دیواروں سے ٹکا دیئے جاتے بارشوں میں بھیگی زمین کی مٹھاس چوستی میٹھی کھنڈ چھلیاں۔

اِنتظار کی سولی پر لٹکتی برھا کی ماری ساری بنجر خزاں رسیدہ عورتیں یہ بھٹے بھون بھون کھاتیں

اور و چھوڑے کے گیت الاپتیں۔

لٹی ہیر وے دلاں دی

حال وے ربا ماری ہوئی تیرے غماں دی

عصر کے وقت ایک چنگیر ان میٹھی مکئی کے دانوں سے، ایک چنگیر کچی مونگ پھلی کی بھر بھٹی سے بھنوائی جاتی۔ چولہوں میں تڑختی چیڑ کی پچی لکڑیاں اور انگیٹھیوں میں دہکتے پکے کوئلے کانگڑیوں میں بھنتی کیری، چائے کے دیگچے کے گرد بیٹھی لڑکیاں سویٹر، کروشیے کی لیسیں اور دوسوتی کی چادریں کاڑھتی ہوئیں، ساتھ جڑے ناموں کو ایک ایک سلائی میں کروشیے کے ایک ایک خانے میں کڑھائی کے ایک ایک توپے میں پروتی ہوئیں اور مل کر گیت کے سُر اُٹھاتی ہوئیں۔

صبح ناں ویلا قیدی کھڑے تحصیلاں نال

ماہی میرا افسر جھگڑا کرو وکیلاں نال

اس ماہی کے لیے کیسے کیسے گیت گمنام شاعروں نے گھڑ رکھے تھے۔ یہ شاعر یقیناً عورتیں ہوں گی۔ اسی لیے تو کسی شاعر کا کبھی کوئی نام متعارف نہ ہو سکا۔ یہ ریزہ ریزہ چپہ چپہ جیتی مرتی پوٹھوار کی عورتیں۔ اپنے اپنے تاج کی پرستش میں ماتھے ٹیکتی، کبھی ریل گاڑی کی سیٹیوں کی صوت پر کبھی ہوائی جہازوں کی گڑ گڑاہٹ پر تو کبھی مٹی کی خاموش ڈھیریوں پر۔

غزل جان کے ہمراہ بھی کسی نام کی جھنکار تھی جو چھتاجوں میں جھنجھناتی ہوئی کسی انجان مٹی کی ڈھیری سی، باسی پھولوں سے ڈھکی ہوئی۔۔۔ چاہے اس قبر کا مردہ غائب تھا لیکن ڈھیری تو موجود تھی مردہ دفن ہوا کہ گل سڑ گیا کون جانے۔

میری کالی مرغی کھو گئی!

سار یہ جان نے اس بھر پور گھرانے کا خوش دلی سے اِستقبال کیا تھا۔

پوٹھوار والی مخصوص گرم جوشی اور ولولہ انگیزی بھرا اِستقبال جس میں پوٹھوار کے پتھریلے سلسلوں سے نکلتی حرارت اور سختی رچی ہوتی ہے۔ گلے ملتے جذبوں کی ساری گرمی بانہوں میں بھر آتی ہے کہ بعض اوقات تو پسلیوں کی کڑک کڑک سنائی بھی دے جاتی ہے۔

بچوں کے گالوں پر اتنے بوسے ثبت کیے گئے کہ یہ یورپ پلٹ بچے پریشان ہو گئے۔ ہر گال پر تین تین بوسے یہ بوسوں کی تعداد محبت کی شدت کا پیمانہ ہے۔ تین تین، پانچ پانچ کہ سات سات بوسے، بوسوں کی تعداد ہمیشہ طاق میں ہوتی اکثر ہر بوسے کے بعد گنتی بھی کی جاتی ''دو تین چار پانچ اب جا اللہ کی حفظ وامان میں تجھے دیا۔ ماں صدقے، پھوپھی واری۔ خالہ ہاری۔''

ایک ہی عورت کے اندر کئی رِشتے موجود ہوتے تھے جو سارے ہی نثار کر دیئے جاتے تھے۔ پوٹھواری عورتوں کی جانب سے محبت کی گرم جوشی کا ناپ تول ان بوسوں کی تعداد ہے۔ ان یورپ پلٹ بچوں کے گال لالو لال ہو گئے۔

غزل جان کو اس رسم کا خیال نہ رہا تھا یا شاید اس لمبے عرصے نے بھولا ہی دیا تھا۔ ورنہ وہ

بچوں کو خبر دار ضرور کر دیتی کہ جب وہ خود بچی تھی تو کہیں جاتی یا پھر باہر سے عورتیں گھر میں آتیں تو سبھی بچوں کے دونوں دونوں گالوں پر اتنے بوسے ثبت ہوتے کہ کڑ یڑا زدہ دانتوں کی بد بو، نسوار کھائے مسوڑھوں میں پھنسی داڑھوں کی کرچیاں، نسوار اور تمبا کو سے سیاہ پڑتے ہونٹ اور زبان کبھی صاف نہ کیے ہوئے بیمار دانتوں اور نتھنوں سے چھٹتی ہواڑ اور کھٹی ڈکاریں تیورا دیتیں لیکن یہ عورتیں دونوں ہاتھوں میں سر کو جکڑ لیتیں اور ہر گال پر سات سات بوسے دیئے بنا ہرگز نہ چھوڑتیں جب چھوڑتیں تو بچہ دم گھٹنے اور بے ہوش ہونے کے قریب دوسری خالہ یا چاچی پھوپھی یا بڑی بہن بھابھی کے شکنجے میں چلا جاتا، لیکن کیا کیا جائے یہ پوٹھوار کی پرانی رِیت تھی جو محبتوں کی امین تھی۔

فلیٹ کے ایک کمرے میں اُن کا سامان رکھا گیا تھا۔ ڈرائنگ رُوم، لیونگ رُوم، تین بیڈ روم سب کارپٹڈ ہر کمرے میں اے۔سی چل رہے تھے کوئی موجود ہو کہ نہ ہو۔

''بھاوی (بھابھی) بند کیوں کرتی ہو۔ فرق تھوڑی پڑتا ہے۔ سارے فریج اے سی چلتے چھوڑ دو خود باہر چلے جاؤ۔ بجلی پٹرول کا بوجھ عوام پر تو ہے ہی نہیں۔ یہی تو مزا ہے یہاں کا۔'' غزل جان نے سوچا۔

دوسرا مزا یہ خوراک کی افراط، چھوٹا سا کچن انواع واقسام کے کھانوں، مشروبات دُنیا بھر کے برینڈڈ پھلوں، سبزیوں، اناجوں سے بھرا تھا۔ خوراک اتنی اضافی اور فالتو کہ مشرقِ وسطیٰ کی کمائیوں کا سمبل یہ باورچی خانہ لبالب تھا۔ آگ اُگلتے صحراخوراکوں بھرا کولڈ سٹور جہاں روزانہ ٹنوں کے حساب سے خوراک بہادی جاتی ہے، ضائع کر دی جاتی ہے۔ اس افراط نے بے اندازہ منگتے پیدا کر دیئے ہیں۔ خدا کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھیلاتے اس کے بندوں کے سامنے پھیلانے لگے ہیں۔

''بھاوی! یہاں مانگنا کوئی عار نہیں ہے۔ خوشحال عزت دار پاکستانی خیراتی صفروں پر بیٹھتے اور بٹتی ہوئی خوراک کے لیے دھکم پیل کرتے ہیں۔ اصل میں یہاں لوگ آتے ہی مانگنے کا ذہن بنا کر ہیں۔ یہاں غریب نہیں منگتے ہوتے ہیں۔ اصل میں اِس زمین کو حضرت ابراہیم کی دُعا ہے۔

اس شہر کو رزق کی فراوانی کی دُعا ہے۔ اب رزق اِتنا ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھل رہا۔ باہر سے آنے والوں کا پیٹ بھر بھی جائے تو بھی نیت نہیں بھرتی۔ جب افراط ہوگی تو بخشش اور ضیاع بھی ہوگا۔"

ساریہ جان نے اُس کی محویت دیکھ کچھ پڑھ کر باورچی خانے پر پھونکا۔ شاید نظر کی کوئی دُعا۔

"نظر تو پیار کرنے والوں کی ہی لگتی ہے نا بھاوی! جو شئے اچھی یا پیاری لگے، اُسی کو نظر کھا جاتی ہے۔ یاد ہے نا بھاوی تمہاری کشمیری شال کو موڑھے کی کشمیرنیں دیکھ ہی رہی تھیں کہ پلّو چولہے میں گر گیا۔ کم سے کم آدھی شال تو جھلس گئی ہوگی نا۔۔۔ ہائے نظر۔۔۔ نظر تو پتھر پھاڑ دیتی ہے۔"

"یاد ہے بھاوی "زمرد" نکے کو دُودھ پلا رہی تھی گوڑھے کی راجیاں اُسی وقت آئیں بس اتنا کہا "بہت دُودھ اُترا ہے۔" لے وہیں نکے کو اچھو آیا وہیں آنکھیں تاڑے لگ گئیں سو کہتی رہیں دودھ زیادہ تھا۔ سانس کی نالی کو چڑھ گیا لیکن اصل میں تو نظر۔۔۔ کھا گئی پھول بھر بچے کو۔۔۔ اور پھر تائے باقر کی کوٹھی کو جو نظر لگی۔۔۔ آگ......توبہ ککھ نہ چھوڑا۔۔۔

ویسے بھاوی یہ زمینیں تو ہیں ہی دیالو یہاں مانگنے ہی کو تو آتے ہیں لوگ۔ عمروں عرصوں میں کوڑی کوڑی جوڑ کر کرائے بھاڑے بھرتے ہیں تو بدلے میں کچھ لینے کچھ مانگنے ہی تو آتے ہیں۔ دوروں کے سفروں کے بعد عمروں کی پونجی لٹا کر دُعاؤں سے عمروں بعد نصیبوں سے یہاں پہنچنے والے بڑے لالچی، اُتاولے اور بھک منگے ہو جاتے ہیں۔ بس چھین لینا چاہتے ہیں سب۔"

میں تو پیا کی دیوانی، یثرب کی فقیرنی گدا نبی جی کے در کی مسکینی۔ غزل جان نے سوچا ساریہ درست ہی تو کہہ رہی ہے، یہاں تو لوگ ایک ہی نیت سے آتے ہیں مانگنا تھوڑا لگا کر بدلے میں بہت چاہنا۔ پھر ان عورتوں کے تو خمیر میں مانگنا رکھ دیا گیا ہے۔

فقیر بے نوا کسی در کی گدا، کسی ہستی کی دیوانی۔

ثواب سے لے کر خوراک تک پورا فلسفہ ہی مانگنا ہے، جو ملتا ہے سمیٹتے چلے جاؤ، حجرِ اسود کے بوسے سے لے کر تقسیم ہوتی کھجوروں تک کا حرص بے پناہ، جس طرح حطیم میں نفول کی ادائیگی اور حجرِ اسود کے بوسے کی حرص میں دھکم پیل، ایسے ہی خوراک سے بھری گاڑیوں کے گرد بھی چھینا

چھٹی۔ ہر گزرتا ہوا کچھ اُچکا لینا اپنا حق سمجھتا ہے، چاہے جوتے ہی کیوں نہ ہوں۔ جتنی خوراکیں اسی قدر منگتے۔ دیدار مانگیں کہ جنت مانگیں کہ خوراک مانگیں۔ اُس نے سوچا ہم دوسروں کی زمینوں میں ایک ذہن بنا کر جاتے ہیں جیسے یورپ و امریکہ میں پیسہ اور گرین کارڈ کا مقصد ہے، وہاں مانگنا بےعزتی سمجھتے ہیں لیکن یہاں واحد مقصد مانگنا ہے تو پھر اس میں بےعزتی کیسی۔

خدا نے ان زمینوں کو اِتنا نواز دیا ہے کہ ہر ایک بخشش وصول کرنے کے واسطے چلا آتا ہے۔ ثواب کی صورت کہ خیرات کی صورت بخشش وصولنے کا ذہن بنا کر آتا ہے۔ اُن کی گاڑیاں، کوٹھیاں، کاروبار، بینک بیلنس جس خزانے کی عطا ہے اس کا منبع اسی سرزمین سے پھوٹتا ہے تو پھر مانگنے میں بخشش وصول کرنے میں عار کیسی۔۔۔ یہ عورتیں تو پھر جس کی دیوانی ہیں، اُس سے سب چھین بھی لینا چاہتی ہیں۔ چاہے وہ مرد ہو جس کی چھاپ دل اور بدن پر کندہ ہو چاہے بنی جی کا در ہو کہ کعبہ کا غلاف ہو۔ چھوڑتی نہیں ہیں، پھر ان زمینوں کو برکت کی دُعا ہے کہ کچھ ختم ہوتا ہی نہیں ہے۔ ثواب ہو کہ غذا ہو۔ ہمیشہ جاری رہنے والا چشمۂ فیض ہے۔

''کباڑیئے کے کاروبار میں بھی تو بڑی برکت ہے نا یہاں۔۔۔'' غزل جان نے خوشحال گھرانے کو ستائشی نگاہوں سے دیکھا۔ ساریہ جان نے نظر کی دُعا دل ہی دل میں پڑھ کر سہ بارہ پھونک ماری۔

''نظر تو پیار سے ہی لگتی ہے نا۔'' دوپٹے کی لمبی لیس کانوں کے پیچھے اڑسی اور کھسیانی سی ہنسی۔

''بھاوی برکت تو بہت ہے پر یہ کفیل! کسی جلم کی طرح لہو چوس لیتے ہیں یاد ہے نا بھاوی! کسوں کے پانیوں میں کتنی جلمیں (جونکیں) ہوتی تھیں، جو بھینسوں کے تھنوں سے چمٹ جاتی تھیں۔ جب تک لہو چوس چوس کر پیٹ پھولا نہ لیتیں الگ نہ ہوتی تھیں، جتنا کھینچو، درھوؤ۔۔۔ بالکل اسی طرح یہ عربی کفیل بھی ہے۔۔۔''

''اور بالکل ایسے ہی یہ گورے بھی۔۔۔'' جب اپنے وطنوں نے ہمارے لیے گنجائش نہ

چھوڑی تو پھر غیر زمینوں سے شکوہ کیا، جب اس زمین کی فطرت دیالو ہے تو کفیل بھی یہی نیچر لے کر کیوں پیدا نہ ہوں گے۔ وہ بھی یہی سمجھتے ہوں گے کہ ربِ کعبہ نے اُن کے لیے اپنی رحمت سے چشمۂ فیض کا اہتمام کر رکھا ہے۔ جو اُنھیں بنا محنت کیے بنا خرچ کیے صرف شخصی ضمانت پر نواز رہا ہے کیونکہ اس زمین کے وارث ہونے کی بنا پر یہ اُن کا پیدائشی حق ہے کہ اس زمین سے کمانے والے پہلے اُن کا حصہ زر مزرت رکھیں۔

''سب سے وکھرا ملک ہے۔'' نسلیں گزار دو عمریں غرق کر دو۔ ہاتھوں میں چنڈیاں پڑ جائیں ان کا گوموت اُٹھاتے مر کھپ جاؤ قبر کی جگہ تو دے دیں گے پر شہریت نہ دیں گے۔ دفن کروا کر لواحقین خوش جنتِ معلیٰ میں جگہ مِل گئی۔ مکہ مدینے میں دفن ہونے کی ازلی خواہش تو پوری ہو گئی۔ پر رہے عمر بھر خارجی۔۔۔ اقامے کے انتظار میں کفیل کے رحم و کرم پر۔۔۔ ان کی خدمتیں بھی کرو اور خوف کی تلوار پر بھی چلو۔۔۔ پتہ نہیں کب نکال باہر پھینکیں۔۔۔''

لوچ دار لہجے اور چہچہاتی آواز میں ٹھیٹھ پوٹھواری بولی۔ ان یورپ پلٹ بچوں کی سمجھ سے باہر تھی، جیسے کول تار کے تیل میں باریک، باریک بجری مکس کرنے والی مشین لگا تار کول تار بنا رہی ہو۔ بے وطنی کے سیاسی و سماجی مسائل کے انبار میں سے یکدم سارہ یہ جان کو مہمان بچے دکھائی پڑے۔

''ہائے صدقے واری ہائے چاچی ہاری۔ یہ سٹابری کا جوس پیو نا خالص اور فریش ہے۔''

شیشے کی صراحی نما بوتل کے پیندے پر سٹابری کے تازہ پھل چپکے تھے۔ دوسری بوتل میں آم کا گودا تیسری میں انگوروں کا رس۔ یہاں کسی پھل سبزی کا کوئی موسم تھوڑی ہے۔ ہر فصل ہر ایک موسم میں موجود رہتی ہے۔ ایسا تو شاید یورپ میں بھی نہ تھا، تھا تو اِتنا ارزاں نہ تھا۔ یہ زمینیں جو کچھ اُگانے کے قابل نہیں لیکن غذاؤں اور خوراکوں سے لبالب...... اشیائے صرف کی سب سے بڑی اور تیز ترین منڈیاں۔

کام والی پاکستانی ماسی نے میز سجا دیا تھا۔ انواع و اقسام کے کھانے خوشبوئیں اِشتہائیں اڑوس پڑوس کے بیسیوں فلیٹوں میں گھسی پڑ رہی تھیں۔ ثریا عبائے اور سکارف میں لپٹی سب کو سرو

کر رہی تھی۔ یہ اِسلامی لباس اس مُلک میں پہننا لازمی تھا۔

سار یہ جان نے ایک بار پھر چھ تاجوں کے گالوں پر پٹاخ پٹاخ بوسے دیئے اور سب سے چھوٹے تاج کو گود میں بیٹھا کر اُسکے منہ میں نوالے ڈالنے لگی۔

''ہائے سارے تاج کتنے سوہنے۔اللہ بُری نظر سے بچائے زرتاج، تاجدار، مہرتاج، شاہ تاج، ماہ تاج۔ تاجور، بھاوی سب کے نام کیسے یاد ہوتے ہیں تمہیں، ہائے اللہ جی! کتنے سوہنے جیسے کسی انگریز کے بچے۔ میں تو بس سب کو تاج ہی کہہ دوں گی۔ تاج کے ساتھ لگی ان کی اپنی اپنی پہچان یاد تھوڑی رہے گی۔'' بس سارے تاج۔۔۔ تاج محل کے کنگرے اور مینارے۔ لیکن خود تاج۔۔۔ کہاں ہوگا۔۔۔ وہ تاج! غزل جان کے سینے میں دھواں دھکاتی مرچوں کی دھونی سی مچی ناک، منہ، آنکھوں سے چھٹی ساری مرچیلی فضا۔۔۔

غزل جان جانتی تھی یہ شدید محبت چند دنوں بعد اسی شدت اور سرگرمی کے ساتھ لڑائی جھگڑے میں تبدیل ہوجائے گی۔ ان پوٹھوار کی عورتوں میں محبت اور نفرتوں کے جذبے از حد شدید ہوتے ہیں، جہاں مرجاتی ہیں وہیں مار بھی رکھتی ہیں۔

شاید انہی شدید جذبوں سے ایک دوسرے کو مثبت یا منفی محسوس کرنے کا احساس بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ عورتیں چھوڑ پوٹھوار کی تو جـنـنـیـاں بھی ایسی ہی جذباتی رقت آمیز، لڑنے جھگڑے پر آئیں تو سارے کوہستانی سلسلے سر پر اُٹھالیں محبت کرنے پر آئیں تو سارے نشیب گف کرلیں۔

پوٹھوار کی جنیاں بھی پوٹھوار کی عورتوں کے ڈھنگ سیکھے ہوئے تھیں، لڑتی بھڑتی۔ محبتوں کے چشمے بہاتی سُریلی آواز میں گیت گاتیں گیت بھی یہی پوٹھواری لوک گیت۔

صبح ناں ویلا قیدی کھڑے تحصیلاں نال

بن کے حاکم جھگڑا کرو وکیلاں نال

دن بھر کی کارروائی جوانسانوں کے بیچ ہوتی اُس کی نقل شب کی گھور تاریکیوں میں، نشیبوں کی گہرائیوں میں پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر جنات کی سرگرمیوں میں منتقل ہو جاتی۔ جنیاں بھی

آپس میں لڑتی مرتی، جھگڑتیں چیختی چلاتیں، یہاں کے مردوں کی طرح یہ جنات مرد بھی اپنی عورتوں کو لڑنے جھگڑنے سے کبھی نہ روکتے، جس طرح یہاں کے مرد کلف لگے سفید بھاری شلوار اور کف کالر والے کرتے، پہنے ادھر پنڈی، روات کو نکل جاتے۔ بالکل اِسی طرح یہ جنات مرد بھی شاید ادھر پنڈی، روات، گوجر خان کو نکل لیتے ہوں گے کہ لڑو مرو ہم تو بھائی بھائی تم احمقوں کی وجہ سے لڑنے مرنے والے نہیں ہیں۔ بالکل ان پوٹھواری مردوں کی طرح بھائی چارے اور رِشتوں میں جکڑے ہوئے جن کے لیے بیوی بچے بہت دُور کے رشتے۔

رینٹ اے کار کے حساب کرنے اسلام آباد کے بنگلوں ''لال کرتی اور راجہ بازار'' میں دُکانوں کے کرائے وصول کرنے کو نکل جاتے۔ شاید ان جنیوں کے مرد بھی ولایت کی کمائیوں سے اِسلام آباد کی نوتعمیر شدہ کوٹھیوں اور رینٹ اے کار کا کاروبار کرتے ہوں گے۔

مغرب کے بعد گھر لوٹتے تو اُس وقت تک سب شانت ہو چکا ہوتا۔ عورتیں سر باندھے تھک ہار کر اپنے اپنے چوکوں میں دال سبزی پکا رہی ہوتیں۔ میرے (کھیت) سے کسوں (پہاڑی سلسلے) سے ڈھونڈ کر لائی گئی اَل، جنگلی کڑوے کریلے، چوہنگیں، ساگ، خودرو پالک، کھمبیاں کھود لاتیں۔ سبزی دم پر رکھ کر باریک خستہ پھلکے لوح پر سینک رہی ہوتیں۔ پھونکنی سے کچی چیڑ کی گیلی لکڑیاں پھونک پھونک چنگاریاں اُڑا رہی ہوتیں۔ دھوئیں آنکھوں میں مرچیں بھرتے لیکن دن بھر نکلنے والے آنسو قطرہ بھی آنکھوں میں نہ چھوڑ جاتے کہ چیڑ کی لکڑی کا تیز گاڑھا کڑوا دھواں ایک آنسو بھی نکال سکے۔ باپ، چاچا، تایا یا ماموں جیسے رشتے، نوعمر بیٹیاں لوٹے بھر سوراخ دار ڈھکنوں والی چلمچیوں میں ان کے ہاتھ پیر دھلواتیں۔ تولیہ پیش کرتیں، بوٹ اُٹھا کر چپلیں سامنے رکھتیں اور پھر وہ باہر مردانے میں چلے جاتے۔ شب بسری کے لیے جہاں آدھے مرد پہرے پر جاگتے اور آدھے سوتے باری باری سوتے جاگتے...... ڈھائی بجے والی تیز رو کے گزرنے کے ساتھ اوائل شب میں سونے والے پہرے پر مامور ہو جاتے اور اوائل میں جاگنے والے پچھلی شب سو جاتے لیکن مُلاّ کی اذان اور پشاور ایکسپریس کی سیٹی کے ساتھ سبھی بیدار ہو جاتے۔

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی مزید کتب حاصل کرنے کے لیے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لیے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: +92- 334 0120123

جنات کی نوعمر لڑکیاں بھی یقیناً یہی سب کچھ کرتی ہوں گی۔غزل جان نے سوچا اب تو گیس اور بجلی والے چولہے جلتے ہیں۔اب تو دھوئیں کا بہانہ کر کے آنسو نہیں بہائے جا سکتے ہوں گے۔جنات بھی انہی گیس کے پائپوں سے چولہے جلاتے ہوں گے، وہاں بھی بجلی کے قمقمے جلتے ہوں گے۔ان کے ہاں بھی جدید عہد کی سہولتیں موجود ہوں گی۔یہ جو ہمارے ہاں سے چیزیں گم ہو جاتی ہیں، بل زیادہ آتے ہیں تو اس کی وجہ یہی تو ہے کہ جنات بھی تو یہیں سے کھاتے پیتے ہیں۔اپنا پورا حصہ ہمیں سے وصول کرتے ہیں۔

پوٹھوار کے جنات بہت نقال تھے۔انسانوں کی ریس میں شادیاں رچاتے، ماتم کرتے، ہنسی مذاق میں پڑ جاتے۔کس طرح تائے صفحان کو پکڑ کر لے گئے اور مخول میں پڑ گئے۔کہنے لگے تایا تجھے مہندی لگاتے ہیں اور جب غریب گھر آیا تو سفید داڑھی پر سارا گو بر ملا ہوا تھا۔

رات ایک بجے یا دو تین بجے والی تیز گام یا تیز رو سے اُترنے اور کسوں سے گزرنے والوں کے ساتھ اکثر ایسا مخول وہ کرتے رہتے۔پوٹھواری باشندے ان کے عادی تھے۔انھیں اپنے ساتھ رہتے بستے محسوس کرتے اُن کے لیے گنجائش چھوڑتے۔ان کے مخولوں کا نہ بُرا مانتے نہ خوفزدہ ہوتے۔اب ڈھائی تین بجے بعد از نصف شب یا صبح سویرے پانچ بجے ریل گاڑیوں سے اُترنے والے مسافر یہ سوچ کر پہاڑی سلسلے اور نشیب پار کرتے کہ ان کا ٹکراؤ اس دوسری مخلوق سے ضرور ہوگا۔

پوٹھوار میں مرد کم ہی گاتے تھے، ہاں البتہ کوئی ایک شوقین مرد ایسا ضرور ہوتا جو عورتوں کے ساتھ مِل کر لمبا سر اُٹھاتا۔ بہت سی باریک چیختی آوازوں میں سے ایک بلند آہنگ مردانہ آواز برآمد ہوتی جو زنانہ آوازوں کو دبا جاتی، لیکن تاثر دو چند ہو جاتا۔ایسا کوئی زنانہ خصائص کا حامل مرد ہر گھرانے میں ضرور موجود ہوتا جو شادی بھی کرتا بچے بھی پیدا کرتا۔فوج کی نوکری بھی کرتا۔ چھٹی پر گھر آتا تو زیادہ وقت زنان خانے میں گزارتا۔شادی ختنے سگائی پر وہی ڈھولک پیٹتا پرات بجاتا۔گھر کی عورتیں اُس کے ساتھ ایسی ہی سہولت محسوس کرتیں جیسے وہ اُنہی جیسا ہو۔یہ زنخا مرد سر

پر دوپٹہ اوڑھے عورتوں کے ساتھ عورت بنا ماتموں میں سب سے بلند لحن والے بین اُٹھاتا۔ شادیوں میں عورتوں کے ساتھ مِل کر گاتا اور اُس کی بھاری سُریلی آواز زنانہ آوازوں کے لوچ کو بلند آہنگ کر دیتی۔ بالکل ایسے ہی کسوں میں بستے جنات کے ہاں بھی ہوتا تھا۔

چیختی آواز والی جننیاں پوری رات گاتیں اور بھاری سُریلی آواز والا کوئی ''مرد جن'' ان کا ساتھ دیتا۔ ڈھولک پیٹتا اور پرات بجاتا جس کے ساتھ ریل گاڑیوں کی تیز سیٹیاں اور پہیوں کی چھک چھک طویل پہاڑی سلسلوں میں بجتی باز گشت لوٹتی، نشیبوں میں گونجتی اور چوٹیوں سے ٹکراتی سونے والوں کو جگا دیتی۔ نیند میں خلل ڈالتی۔ یہاں سے گزرنے والی ریل گاڑیاں ان پہاڑی بستیوں کے اوقاتِ کار مرتب کرتیں۔ ریل گاڑیوں کے گزرنے کے اوقات سے یہاں کے باسیوں نے اپنے روزمرہ کے کاموں کو متعین کر رکھا تھا۔ صبح چار بجے والی کراچی ایکسپریس کے ساتھ مرد بیدار ہوتے۔ کھونٹیوں سے ٹنگے اوورکوٹ اور فوجی سویٹر پہنتے۔ مٹی کے کوزے بھر کر لڑی (ڈھلان) میں رفع حاجت کے لیے نکل جاتے۔ چھ بجے والی عوامی ایکسپریس میں سوار ہو کر پنڈی جاتے۔ عورتیں بارہ بجے والی اباسین کے گزرنے تک گھر کے معاملات نمٹا کر کپڑوں کی پنڈیں اُٹھا کر کسوں میں دھونے کو نکل جاتیں۔ جب ڈھائی بجے والی تیز رو گزرتی تو تن کے کپڑے دھو کر پہاڑی ڈھلانی ندی میں نتھار رہی ہوتیں۔ عورتوں کو مسافر دوروں سے دیکھتے لیکن اُنھیں کوئی پرواہ نہ ہوتی بس وہ ایک چیلا (دوپٹہ) لپیٹ لیتیں۔ چار بجے گزرنے والی پشاور ایکسپریس کے ساتھ مونگ پھلیوں کی چنگیریں اور مکئی کے دانوں کا چھکو بھر کر بھٹی سے بھنواتیں۔ گُڑ کے مُرنڈے بناتیں۔ مغرب کے وقت گزرنے والی کوئٹہ ایکسپریس کے ساتھ مرغیوں کو ڈربوں میں بند کرتیں۔ ڈربوں سے انڈے اکٹھا کرتیں۔ بیٹھیں صاف کرتیں، سردیوں میں کوئلوں کی انگیٹھیاں اور کانگڑیاں دھونکاتیں۔

لیمپ اور لالٹینوں کے شیشے سہاگے کی چٹکی میں ذرا سا لعاب تھوک کر دھجی سے چمکاتیں۔ جلے ہوئے واٹ قینچی سے کاٹ کر تیلی دکھاتیں۔ گرمیوں میں تنور تپتے۔ سردیوں میں لوح پر سے

پھلکے اُترتے لحافوں میں بیٹھ کر کشمیری شالوں کی بُکل مار سویٹر بنتیں۔ غلط بُنتی بن بن اُدھیڑتیں۔ گرمیوں کی لمبی دوپہروں میں دوسوتی چارسوتی کی چادریں کاڑھتیں، اُن کے نام کے ہجے چھاپتیں جن ناموں سے جڑی تھیں۔ اُن ناموں کے ہجوں سے بھی شرماتیں۔ کسوں میں جنات کی لڑکیاں بھی یہی کچھ کرتی ہوں گی۔ وہ بھی اپنے نام سے جُڑے کسی جن کے نام کے ہجے تکیوں کے غلافوں پر کاڑھتی ہوں گی۔ کروشیے کی لیسوں میں پروتی ہوں گی۔ جہیز کی پٹیوں میں سینت سینت رکھتی ہوں گی۔ وہ نام جو کسی شب روکی طرح دزدی کرتے لیکن نہ واردات نظر آتی نہ واردکھتا نہ نقش پا ملتا۔

شب بھر جو پہاڑی نشیب گیتوں سے گونجتے ہیں تو جنات کی لڑکیاں پیار کے گیت ہی تو گاتی ہیں۔

آ بہو طوطا ماڑی تے ماڑی نہیں پیاری تے
ماہی مہنڈا حقہ چھکیندا مہنڈا دل نسواری تے

(میرا محبوب حقے کا عادی ہے جب کہ میرا دل نسوار چھینکنے کو چاہ رہا ہے)

دونوں مخلوقات نے اپنی اپنی حد بندی بنا رکھی تھی۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا بڑا حوصلہ تھا ان دونوں مخلوقات میں۔ طویل پہاڑی سلسلوں کے نشیبوں میں جنات کی عملداری تھی اور چوٹیوں پر انسانوں کی بستیاں آباد تھیں۔

کھانوں کی خوشبوؤں نے اشتہا بڑھا دی تھی۔ زرتاج نے آلوبخارے کے شربت کی صراحی نما بوتل سے کرسٹل کے گلاس میں عنابی مشروب اُنڈیلا۔ برف کی ٹھنڈک گلاس کی سطح پر پسینے کے قطرے چمکا گئی تھی۔ عربوں جیسے چغے پہنے عربی لہجے میں پوٹھواری بولتے بچے......شاید ابھی پچھلے ہفتے ہی عمرہ ادا کیا تھا اُنھوں نے۔۔۔۔منڈھے ہوئے سر تھوڑے تھوڑے پوٹھواری تھوڑے تھوڑے بدوی۔ یہ موسم اور جغرافیہ انسانوں کی شکلوں کو اپنے رنگ پہنا دیتا ہے۔ سیاہ عبائے میں ملبوس ثریا نے دم پخت مچھلی کی بھاپ میں مہمانوں کو کھانے کی دعوت دی۔

''باجی کھائیں خالص سمندر کی مچھلی ہے۔''

''یہاں نوکرانیاں بھی ملتی ہیں کیا۔''

''بہت ہیں انڈونیشین، ملائشین، بنگلہ دیشی، پاکستانی۔۔۔عمرے یا حج کے ویزے پر آئیں اور پھر اِدھر اُدھر ہو گئیں۔ کام اور پناہ کی تلاش میں کسی گھر میں چھپ چھپا گئیں ایسی بہت ہیں یہاں غیر قانونی۔ پتہ نہیں کب چھاپا پڑ جائے دھر لیے جائیں۔ ساری عمر جیل میں سڑیں یا پھر سفر کروایا جائے۔''

نہ آج کا اعتبار نہ کل کی خبر، خوف اور جرم کی بُکل میں سہمے ہوئے۔ آئے تو تھے کالی کملی والے کے در پر منگتے بن کر پر فقیر گدا بن گئے اس مغرور قوم کے جن کے پاس گھمنڈ کرنے کو بہت کچھ ہے۔ الہامی کتاب، پیغمبرِ عربی، قرآنی زبان، پیغمبری نسل، قومیت پر تفاخر، تاریخ عالی شان، سب سے اعلیٰ عظیم برتر شاہِ ذوالقرنین کی نسبت خانۂ خدا کے متولی، گنبدِ خضریٰ کے جانشیں جنت البقیع، جنت المعلّٰی کے کنجی بردار۔ سارے اجازت نامے انہی کے نام سے۔ ریاض الجنہ، مکہ مدینہ، طائف بدر وحنین اعلیٰ مقامات، قدموں تلے تو پھر مغرور کیوں نہ ہوں۔ پوری خلقت کے دیالو، امریکہ اور یورپ بھی جن کی زکوٰۃ پر پل رہے ہیں۔

ہاں درست ہے اللہ کچھ قوموں پر سدا مہربان رہا۔ عرب کی سرزمین کو پیغمبروں کی بعثت، الہامی صحیفوں اور الوہی پیغامات کے لیے چُن لیا۔ یورپ وامریکہ کو دولت، ذہانت، علم ودانش سے سرفراز کر دیا۔ پیغمبر چاہے نہ اُتارے پیغام رساں بہت پیدا کیے اور ہماری زمینوں کو ان دونوں کے بھورے چننے کی سعادت بخش دی۔ لیکھ لکھنے والے کی مرضی، کچھ قوموں کو عامل اور کچھ کو معمول بنا دیا۔ کچھ کو براہمن کچھ کو شودر بنا دیا۔ کچھ کو جاگیر دار کچھ کو مزارعے بنا دیا۔ اب رب کی مرضی کہ ہمارے خطوں کو سب کا محتاج کر دیا۔ چوروں کی طرح ہر پل جان ہتھیلی پر رکھے خوف کے تابوت میں جڑے نہ نام نہ پہچان سب جھوٹ۔ سب ملمع۔۔۔ یہاں کی بے عزتی کے عوض وطنوں میں عزت، یہاں کی بے نامی کے بدلے وطنوں میں نام، چلے آتے ہیں سب جھوٹ جینے کو نام شناخت کھونے کو۔ زبان لباس گم کرنے کو۔ ناخالص ہونے کو۔۔۔ مہاجر باہری خارجی جلاوطن،

Asylum، آخر کیوں، رج کھانے کو نہیں بلکہ کھلانے کو۔۔۔

''یہ پاکستانی نسلیں کب تک مستعار زندگیاں جئیں گی۔ شاید اُس وقت تک جب ان کے بچے اپنی شناخت گم کر کے محض باہری رہ جائیں گے۔ خود کو اپنے آپ کو بھی باہری کے نام سے پکارنے لگیں گے نہ ذات نہ قومیت صرف ایک نام خارجی، مہاجر، پناہ گزین۔ ذاتوں کا گھمنڈ، علاقوں کی برتری، زبانوں کے تعصب، صرف وطنوں تک محدود، دوسروں کے وطنوں میں صرف ایک ہی شناخت باقی۔ ایک قومیّت، ایک زبان، خارجی، مہاجر، پناہ گیر، باہری۔'' آج عثمان خان کھل کر بول رہا تھا، جیسے یورپ کی ٹھنڈ نے منہ میں بھی برف ٹھونسی ہوئی تھی، جوان صحراؤں کی گرمی نے پگھلا دی ہو۔ یہ دونوں کم تعلیم یافتہ یورپ و مشرقِ وسطیٰ کی سیاست و معیشت پر بحث کر رہے تھے۔

اپنے گراؤں سے نکلنے والے اُس پناہی خطے کی سیاست کو آبائی باشندوں کی نسبت زیادہ سمجھنے لگتے ہیں کیونکہ اُن کے پاس وہاں جینے کا کوئی آبائی استحقاق نہیں ہوتا۔ اسی سیاست اور قانون کی موشگافیوں میں سے گنجائش ڈھونڈتے ہیں۔ خود اُس مُلک کے باشندے جینے کا آبائی اور فطری حق رکھتے ہیں۔ اُنھیں قانون اور سیاست کی پناہ میں نہیں جینا۔ اپنے پورے وجود کے ساتھ اپنی مٹّی کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ زندگی دست بستہ اُن کے رُوبرو حاضر رہتی ہے۔ جب کہ یہ خود زندگی کے رُوبرو دست بستہ حاضر...... دونوں بھائی خوش تھے جیسے قیدِ تنہائی کے پنجرے میں بند قیدی کے ہمراہ کوئی دوسرا قیدی ڈال دیا گیا ہو۔ مُدّتوں بعد کوئی ہم صغیر مِلا ہو جیسے، زبان کے بند تالے کھلے ہوں۔ قیدی کو اپنے ہونے کا اعتبار مِلا ہو۔ اسیر نے ہم اسیروں کی آواز سے آواز ملائی ہو۔ یہ اپنی بولی بولنے کی سرشاری بھی عجب ہے جیسے رُوح نے وجود کے بند تار چھیڑے ہوں، جیسے نطق کے ساز یے بج اُٹھے ہوں، جیسے حلقوم کے باجے سے گیت بہہ نکلے ہوں۔ سیکھی ہوئی زبانوں میں وہ رچاؤ اور سکون کہاں، وجود میں، رُوح میں، اُترتی ہی نہیں۔ خود سے کوشش کر کے سیکھی ہوئی بولی فاصلے پر ہی کھڑی رہتی ہے۔ بولنے والے کو پرایا ہی سمجھتی رہتی ہے، جس طرح وہاں کی زمینیں پرایا سمجھتی ہیں، جیسے پھیپھڑوں میں ہوا بھرنے سے نہیں دماغ میں غبار بھرنے سے برآمد ہوتی ہوں یہ پرائی بولیاں۔

''تم کیا کرتی رہتی ہو سارا یہ جان۔'' مٹھائیاں بنانے میدہ گوندھنے شیرہ اُبالنے کی

مصروفیت غزل جان کو بے طرح یاد آئی۔

''یہ شیطان کچھ کرنے دیں گے تو کروں گی نا۔ سارا دن بھگاتے ہیں ابھی تو شکر ہے یہ آپا ملی ہوئی ہیں۔'' غزل جان نے سوچا عثمان خان اور اُس کے درمیان حائل پولی تھین کی تہ بچوں کی فطرت میں بھی بچھ گئی ہے۔ الگ تھلگ خاموش اپنی اپنی حد میں سمٹے ہوئے، اندر اور باہر سے سہمے ہوئے چپ بیٹھے تھے۔

''یہاں گھروں میں ختم اور میلاد ہوتے رہتے ہیں، جانا پڑتا ہے یہاں سب پاکستانی بہت اتفاق سے رہتے ہیں۔ کیا وہاں ایسا نہیں ہے۔''

''اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ تو ہر اُس جگہ پر ہوگا جہاں کوئی اقلیت میں ہوں گے۔ ان کی بقا اکٹھا ہونے میں ہی ہوتی ہے، جہاں مذہب کو بھی ایک ڈھال بنا لیا جاتا ہے۔ زیادہ عبادت گاہیں، زیادہ مذہبی وثقافتی تہوار، اکٹھ کرنے، جمع ہونے زیادہ قریب ہونے کے بہانے۔ باہر ہر سو خطرات بھرے ہیں۔ خود کو کمیونٹی کے قلعے میں محصور کرنا مجبوری ہے۔ وطنوں میں تو پڑوسی بھی عمر بھر ایک دوسرے کو نہیں پہچانتے، یہاں پوری قومیّت اِک دُوجے سے جڑی ہوتی ہے۔ فنڈز جمع کیے جاتے ہیں۔ قانونی، سیاسی، معاشرتی، مذہبی تشخص کے لیے لڑائی مِل کر لڑی جاتی ہے۔ عبادت گاہیں سب سے بڑا تحفظ، عیدیں، شب رات، میلاد، تشخص کی ڈھالیں، عورتیں، مرد، بچے سب جمع ......مہندیاں لگوائیں، کھانے کھائیں۔ ایک دوسرے سے میل ملاقات رشتے طے پا رہے ہیں۔ بزنس زیرِ بحث آ رہے ہیں۔ محبتیں، قربتیں بڑھائی جا رہی ہیں کہ یہی قلعے کا حصار ہے جس کا محاصرہ ہو چکا ہے۔ محصور رہنے میں ہی بقا ہے، معبد گاہوں میں، روایتوں میں رواجوں میں۔

وہاں وقت کی تقسیم زیادہ کڑی تھی۔ میدہ گوندھتے شیرا اُبالتے مٹھائیوں کا آمیزہ سانچوں میں بھرتے اور پھر بیک کرتے ...... چھ تاجوں کی خاموش موجودگی میں آگرہ کے تاج کی شبیہ وہی کچھ اُس کے ساتھ کرتی تھی جو شکیلہ جان کے ساتھ اس قصباتی ریلوے اسٹیشن پر رُکنے والی ریل گاڑیاں ...... ہر گاڑی کے پہیوں کی چڑ چڑاہٹ اور بریک کی کھرج کے ساتھ جب وہ منڈیر سے

لٹک جاتی اور بجتی ہوئی سیٹی کے ساتھ نیچے لڑھک جاتی ''ساری گاڑی خالی۔۔۔'' خالی خولی وجود میں سے بھری گاڑیاں سیٹیاں بجاتی پہیے جھنجھناتی گزر جاتیں۔''ساری خالی خولی۔۔۔''

وہاں حرکت کم نظر آتی ہے لیکن سفر زیادہ طے ہو جاتا ہے۔ یہاں حرکت زیادہ ہے مگر سفر کم ہے۔ جیسے شکیلہ جان زرینہ جان کی عمر بھر کی بے پناہ حرارت صرف منڈیر اور بغلی قبرستان کے طواف میں صرف ہوتی تھی۔ عمر بھر کی فعالیت صرف ایک چکر میں محصور۔ چھ کے چھ تاج اپنے اپنے وجود میں سمٹے تھے۔ چاروں جان اس خود اعتمادی سے اُچھل پھاند رہے تھے جو ملکیت کا زعم عطا کرتا ہے۔ چھ تاج شاید اپنی حقیقت سے آشنا نہ ہو پا رہے تھے۔ انگریزی پوٹھواری، عربی، بچپنا معلق۔ ساریہ جان بچے ہوئے کھانے ڈیپ فریزر میں سمیٹ رہی تھی۔

''اسے ساتھ لے جانے کے لیے نہ دو گی کیا۔''

غزل جان ثریا کی بے اعتنائی سے حیران رہ گئی۔

''اس نے کس کے لیے لے جانا باجی۔ اکیلی جان اور یہ بچہ بھی اس کا تھوڑی ہے۔ یہ تو ایک انڈونیشین عورت اور پاکستانی مرد کا بچہ ہے۔۔۔''

''باجی بڑے بے وفا یہ پاکستانی مرد توبہ توبہ۔۔۔''

''یہاں ان انڈونیشین، ملائیشین، بنگلہ دیشی عورتوں سے شادیاں رچا لیتے ہیں۔ بچے بھی پیدا کرتے ہیں اور پھر ایک روز بنا بتائے چپکے سے واپس لوٹ جاتے ہیں۔ اپنی نسل کو یہاں رُلنے کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔''

غزل جان نے سوچا۔ اپنے کنبے کے پاس جو، ان بیس تیس برس میں اُن کے بغیر رہنا سیکھ چکے ہوتے ہیں، لیکن یہ مرنے کو لوٹ جاتے ہیں، وہاں جہاں ان کے لیے اب گنجائش ختم ہو چکی ہوتی ہے۔ یہ جن کے ساتھ مرنا چاہتے ہیں وہ ان کے بغیر جینے کے عادی ہو چکے ہوتے ہیں۔ اُن کی کمائیوں کو اپنی مرضی سے خرچ کرنے کی عادت پڑ چکی ہوتی ہے۔ حساب کتاب دینے کسی کے ہاتھ سے لینے اور پوچھ کر خرچ کرنے بتا کر کہیں آنے جانے کا حوصلہ کبھی پیدا ہی نہیں ہوتا۔ جہاں

خودمختاری اور خودکفالت کا طریق رہا ہو۔ وہاں عمر بھر بھیجی گئی رقوم اور اشیاء کا حساب لینے کو کوئی اچانک آن دھمکے تو خرچ کرنے والے استعمال کر چکنے والے اُس کے وجود کا جواز ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ جو صرف رقوم بھجوانے، تحائف لانے اور پھر سب کچھ سپرد کر کے لوٹ جانے کا واحد جواز رکھتا ہے۔ وہاں اُس کے لیے مقیم رہنے کی جگہ نہیں رہتی۔

جس گھر کی تعمیر کے لیے اُس نے سالوں پٹرول پیا اور ٹیکسی کے ٹائروں سے چھٹتی دھول پھانکی ہو۔ اکلاپے کی راتوں کو اس شیش محل کے تصورات سے سجایا ہو۔ جس کے مکیں جدید آسائشوں کے عادی ہو چکے ہوں، جو نئی دولت کی خیرگی میں خود کو ایلیٹ کلاس کہتے ہوں۔ وہ اس مزدور شکل، اَن پڑھ اُجڈ دیہاتی کو گھر کا سربراہ بنا کر کیسے متعارف کروا سکتے ہیں، جو اس گھرانے کا سودا سلف لانے والا بابا تو ہو سکتا ہے، فرد نہیں...... وہ تو اسی سن میں اسی مالی حیثیت میں اُس ذہنی سماجی کیفیت کے قالب میں مقید ہو چکا ہوتا ہے۔ جس حالت میں وہ یہاں سے کبھی رُخصت ہوا تھا۔ وہ کیا جانے کہ اس دولت کے منبع کو گھر والے بھول چکے ہیں۔ پتہ نہیں یہ سوتا کہاں سے پھوٹتا ہے۔ کن پہاڑی سلسلوں سے گزرتا نشیب و فراز کو پاٹتا آبشار کی شکل اختیار کرتا ہے۔ دیکھنے والوں کو بس اُسی آبشار کے حسن و آب سے فیض یاب ہونا ہے۔ میلوں قرنوں کے کشٹ کو کس طور اُس نے جھیلا ان گھر والوں کو تو یہ معلوم بھی نہیں ہو پاتا۔ وہ جاننا ہی نہیں چاہتے۔ اُن کی گاڑیوں، کوٹھیوں، پارٹیوں، ہوٹلنگ، بدلتے ماڈلوں کے کیمرے، ٹی وی، فریج، اے سی، ٹیلی فون اور بے شمار امپورٹڈ برینڈز کے بیچ اس کے لیے جگہ رہتی ہی نہیں۔ یہ بیمار بوڑھا کسی خیراتی اولڈ ہوم میں جائے، یہاں کیا کام اُس کا۔ وہ کیونکر لوٹ آتا ہے۔ اُس کے لیے یہاں کچھ بھی تو نہیں بچا ہوتا، جن بچوں کو وہ پیدا کروانے میں حصہ دار رہا۔ اُن کی شکلوں میں چاہے اُس کے نقوش چھپے ہوں لیکن خود وہ اُس چہرے کی اجنبیت سے اُکتا جاتے ہیں۔ اُن کی بیس پچیس سالہ زندگیوں میں وہ کہاں موجود تھا۔ اُن کے سکول کی ٹیچر پیرنٹس میٹنگز میں، اُن کی سال گرہوں پر، اُن کے پاس فیل ہونے پر اُن کے قدم قدم چلنے پر، سکول کے پہلے دن پر، جوانی کے اِبتدائی ایام میں محلے کے لڑکوں

سے جھگڑے پر، قاری صاحب کی دست درازی پر، پہلی پہلی محبت پر کب کبھی وہ موجود ہوا۔ اگر اُن پیسوں میں قائداعظم کی تصویر کے پیچھے کہیں وہ جھانکتا بھی ہوگا۔ نوٹوں کے اصلی ہونے کی تصدیق کے لیے تو قائداعظم کی شیروانی کے کالر کو رگڑنے کی ضرورت ہوسکتی ہے لیکن ان قائداعظموں کو بھجوانے والے کی تصدیق کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ بیوی جو ساس کی چکی میں لال مرچوں سی دن رات پستی رہی، وہ کیا یاد کرے اُن تنہا راتوں کی طوالت کو، بیمار بچوں کی اکیلے نگہداشت کو۔

اس سب کا اِنعام یہی خود مختاری اور خوشحالی ہی تو ہے۔ اور اس خوشحالی کے زائیدگان وقار اور جوانی۔۔۔ یہ قبل از وقت بوڑھا ہوجانے والا دوسروں کی دھتکار کھانے والا مزدور کیا جانے اس عادت کو۔ آزادی کی اسی عادت نے تلخ ماضی کی یاد کو بھلا دیا۔ اب یہ سودا منافع کی ایسی بلند شرح پر تھا کہ اس سے دستبرداری ممکن ہی نہ رہی تھی۔ اب یہ کیوں چلے آتے ہیں اگر ان کا تابوت کسی فلائیٹ سے پہنچے تو اُن کی توقیر میں کتنا اضافہ ہوجائے گا۔ کس گرم جوشی سے تدفین ہوگی۔ ایلیڈ کلاس کے لوگ سوئم چہلم میں بہترین کھانے میں شریک ہوں گے۔

کتنی ستائش، اَن دیکھے شخص کی اَن گنت خوبیاں، اعلیٰ شخصیت، صاحبِ کردار، صاحب گفتار۔ اعلیٰ سماجی علمی مقام، جو چاہیں منسوب کرلیں کسی نے مرے شخص کی تفتیش تھوڑی کرنی ہے۔ بہترین قبر، قبر پر شیشے، مدرسے میں خیراتی دیگیں۔

کبھی کبھی مرنا جینے سے کتنا زیادہ ضروری ہوجاتا ہے۔ کتنا باوقار پُرتوقیر، سب کمیاں خامیاں پوشیدہ سب مٹی، مٹی پر عالی شان قبر، لیکن یہ لوٹ آتے ہیں، بےتوقیر ہونے کو اپنی اصل دکھانے کو، جن کی غیر موجودگی میں محض خیالی ارادت سے اعلیٰ عہدے، اعلیٰ شخصیت، اعلیٰ مقام عطا کیا جاچکا ہوتا ہے۔ اُن کے صارفین کی طرف سے، وہ اُن کے بنائے ہوئے بت کو پاش پاش کرنے کو چلے آتے ہیں۔

مفسد، چغل خور، عزت راس ہی نہیں اُن کو۔۔۔ وہ تو بےعزتیوں کے دور میں بےعزتیاں سمیٹے کسی دوسری زمین میں اپنے حصے کی بےعزتیاں وصولنے چلا جاتا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ بے

عزتیوں سے کمائی گئی اُس دولت نے پیچھے والوں کے وجود سے ساری بے عزتیاں دھو دی ہیں۔ پاش علاقے کا جدید گھر مہنگی گاڑیاں، اسٹیٹس سمبل سکول کالج کلب، وہ یہ معجزہ با آسانی انجام دے چکے ہوتے ہیں، لیکن وہ لوٹ آتا ہے اُن کے بیچ ایلین بننے کو۔ کسی تنگ و تاریک کمرے میں ایک چارپائی کی گنجائش پانے والا اور دن بھر اور رات میں چھپ چھپا کر محنتیں کرنے والا کیا جانے کہ وطنوں میں تو ایک نئی دُنیا دریافت ہو چکی ہے۔ اسٹیٹس سمبل رہائشی کالونیاں، امپورٹڈ گاڑیاں، برینڈڈ کپڑے جوتے، سکول، یونیورسٹیاں سب لگژری سمبل۔ امارت کی اشتہاری کمپنیاں جن کے صارف یہ نئی دولتوں کے مالک نئے جدید وسائل کے گاہک یہ نئے نئے امیر ہیں، جنھیں دولت نے تمام عزتیں بخش دی ہیں۔

یہ راز فاش کرنے کو واپس آ جاتے ہیں۔ غریب صورت اتنی دولتیں کما کر بھی چہرے سے مظلومی ٹپکتی ہے۔ اُنھیں معلوم ہی نہیں کہ زمانہ کس قیامت کی چال چل گیا ہے۔ وہ اپنی ذات میں یکتا اور تنہا رہ گئے ہیں، اگر پیسے کمانے کی اپنی اکلوتی معنویت بھی کھودیں گے تو پھر اپنے ہونے کا جواز بھی کھودیں گے۔

''کیا اس کا باپ۔۔۔'' غزل جان نے ثریا کے بچے کو ترس بھری نظروں سے دیکھا۔

''وہ بھی لوٹ گیا چھوڑ گیا۔''

''نہیں پکڑا گیا۔ جیل میں سڑ رہے ہیں دونوں۔''

باورچی خانے کے سنک میں برتن دھوتی ثریا بڑی دُکھی تھی۔ بیوگی کی چادر اوڑھ کر یہاں آئی کہ خانۂ خدا اور درِ رسول کی فقیرنی بن عمر گزار دے گی۔ اللہ رسول کے مہمانوں کو دسترخوان کی کیا تنگی۔ حرم سے بڑی کیا پناہ گاہ۔ جہاں مجرم بھی امان لے لے تو پھر سزا ساقط، لیکن حرم کی پناہ گاہیں جتنی وسیع ہو چکی ہیں اُتنی ہی تنگ پڑ گئی ہیں۔

''نہ نہ باجی وہ رات بڑی بھیانک تھی، جب چھاپا پڑا تو یہ بچہ میرے پاس سو رہا تھا۔ ہم آدھے آدھے کرائے پر ایک ہی فلیٹ میں رہتے تھے۔ دونوں بچے میرے ساتھ ملے ہوئے تھے۔

یہ عبداللہ میرے ساتھ سوتا تھا۔ وہ دونوں دوسرے کمرے میں۔۔۔بس چھاپا پڑا پکڑ کر لے گئے۔ چار سال ہو گئے کچھ پتہ نہیں کیا گزری اُن کے ساتھ یہ دو سال کا تھا اب چھ سال کا ہے۔ اس کی چھوٹی بہن دو مہینے کی تھی پتہ نہیں بچی بھی کہ نا۔ اسے تو ماں باپ کی شکلیں بھی یاد نہیں ہیں۔ بتاتی تو رہتی ہوں کہ یاد رکھے اپنے ماں باپ کے نام پر۔ یہ مجھے ہی اپنی ماں سمجھتا ہے بیچارہ۔''

کیا معلوم کدھر گئے اس کے لگتے لانے جیل میں سڑ رہے ہیں کہ سفر کروا دیئے گئے، جن کے لیے زمینیں تنگ ہو گئیں اپنی زمینوں نے چھت نہ دی۔ غیر زمینوں نے شناخت نہ دی۔ انسان کے لیے سب سے اہم کیا ہے۔ چودھریوں کی زمینوں میں کمی کاری بن کر گھس بیٹھیا بن کر کھانا پینا کہ اپنی کلی میں بھوک ننگ کاٹنا۔ بھوک اوڑھ کر مر جانا کہ جوٹھن اور اُترن کا عادی ہو جانا اور اُن کی شکلوں اور طور اطوار کی چھاپ وجود پر لگا کر بدلے میں اپنی شناخت کھو دینا۔ جیسے جانوروں کی کھال پر مالکوں کے نام کے ٹھپّے لگے ہوتے ہیں۔ خام دھات پر چڑھا سونے کا پانی جسے جوہری پہچان کر رد کر دیتا ہے۔ لباس، زبان، لہجوں کی نقل، جو بمثل اصل کبھی نہیں بن پاتی لیکن اسی نقل میں اُن کی بقا ہے۔

تھوڑے دِنوں میں ہی سبھی تاج عربی عربی سے لگنے لگے تھے۔ انگریزی لہجہ اور الفاظ بھولنے لگے تھے۔ وہ پوٹھواری اور عربی سیکھنے لگے تھے۔ شناختیں اپنی اپنی خصوصیات انسانوں کو بخشنے لگتی ہیں۔ P.R کی لاپروائی لاعلم سی معصومیت پھر بھی چہرے پر عجب اعتبار، رنگت اور بالوں میں سنہرا عکس لاپروا لاپروا سے دیالو، دیالو سی قناعت، پورا اعتبار۔۔۔

اقامے والوں سے مختلف۔۔۔آنکھوں سے چہرے مہرے چال ڈھال نشست و برخاست میں بالکل الگ فرق۔ اُس زمین کے وافر اعتبار، عدالتی انصاف، معاشرتی لاغرضی، کتنی بھی سمٹ جائے ان تارک الوطنوں تک کچھ نہ کچھ بچا کھچا پہنچ ہی جاتا ہے، لیکن یہ اقامہ پریشانیوں اور تفکرات سے لکھا ہوا اقامہ۔ نقال بننے کی کوشش میں جوکر سے عجیب الخلقت۔ وقتی ملازم عارضی قیام۔ نکال دیئے جانے کا خوف، کانپتے ہوئے دل عالمِ برزخ میں معلق۔

ان چھتاجوں کے وجود میں بھری برٹش نیشنلٹی کی ساری کرامتوں پر اقامے کی بے اعتباری اور خوف کی لرزش چھا رہی تھی، لیکن یہ انعام کیا کم تھا کہ وہ مقدس مقامات رُوبرو تھے جن کا ذِکر محض قصے کہانیوں میں، قرآن، حدیث میں بزرگوں کی زبانوں سے سننے کو ملتا تھا۔ اب انہی مقامات میں انہی زمینوں پر اسی مٹی میں اُن کے قدم پڑتے تھے، جس سرزمین سے اُنھیں نسبت رُوحانی ہے، جس کے قصے سن سن کر عمریں فیض یاب ہوتی ہیں، جس کی دید کی چاہ میں کتنی نسلیں آنسو بہاتی ہجر و چھوڑے کے حزنیے الاپتی، مِلن کی حسرت میں خاک ہو گئیں۔ لیکن اِتنا کسی نسل کو نہ جڑتا تھا کہ پانی والے جہاز کا بھاڑا بھر سکیں، ان نظاروں کی حسرتوں میں تمام ہو گئیں۔ بے شمار نسلیں

مونگ پھلی کے کھیتوں میں سے بس اِتنا ہی بچ پاتا کہ تن کے دو جوڑے بن پائیں۔ بس اِتنی گندم باجرہ جوار کہ سال بھر اناج والی کوٹھری خالی نہ ہو، جہاں گندم کی روٹی بڑی ضیافت تھی۔ مکئی باجرے کی روٹیاں آنسوؤں کے نمک سے لگا لگا کر نگلتی تھیں اور مدینے کی نعتیں پڑھتی تھیں۔ سردیوں کی یخ راتیں لیمپ کی روشنی میں سویٹر بنتی اور دوسوتی کی چادریں کاڑھتی اُس کسی خاندان کے ایک بزرگ کے گرد جمع مکہ مدینے کے سفر کی داستانیں سنتی تھیں جب وہ کبھی پانی کے جہاز میں کئی مہینے سفر کے بعد خاک پاک کو چوم سکی تھیں۔

ایسی رومان پرور داستانیں اُون سلائیاں آہوں اور آنسوؤں میں گچ ہو جاتیں۔ کروشیے کی جھالریں اور دوسوتی کی چادریں بھیگ جاتیں اُن کا مقدر کہاں کہ ان سبز جالیوں کو چوم سکیں، جب مشرقِ وسطیٰ کی کمائیاں پوٹھوار کے ان پہاڑی گراؤں کو بھرنے لگیں تو بھی حج کی سعادت صرف بزرگ مردوں کو ہی نصیب ہوتی۔ عمرے کا تو اُن وقتوں میں فیشن ہی نہ تھا۔ آج اس پوٹھواری خاندان کے چھوٹے چھوٹے بچے احرام لپیٹے خانہ کعبہ کے گرد چکر کاٹ رہے تھے، جس کی سیاہ گردن سے لپٹی انسانی مالا کی اَن گنت لڑیاں اِک دُوجے میں اُلجھ رہی تھیں۔ تاگے گنجلک ہو رہے تھے۔ ڈر لگتا تھا کہ کہیں لڑی ٹوٹ کر موتی بکھر نہ جائیں۔ پیروں تلے روندے نہ جائیں۔ اس بھیڑ میں اَن گنت قدموں کی لتاڑ میں، پھر اُنھیں سمیٹنا ممکن نہ رہے گا۔ کچلے مسلے جائیں گے۔

عثمان خان نے چھ تاجوں کو اور خود اُسے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ خانہ کعبہ کے گلے میں پڑے انسانی ہار کی بے شمار لڑیاں مسلسل چکرا رہی تھیں۔ وہ کبھی پانچویں لڑی میں پروئے جاتے۔ کبھی اکیسویں لڑی میں وہ ہر لڑی میں انھیں اپنی پناہوں میں لیے تھا۔ غزل جان کو پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ کفیل ہے۔ اس خاندان کا نگہبان۔

ان بچوں کا محافظ جس کا نام باپ کے خانے میں لکھا ضرور گیا تھا، لیکن کسی بچے کی پہچان کا وہ حصہ نہ بن پایا تھا۔ کسی بچے کے نام کے ساتھ اُس کا نام نہ جُڑنے دیا تھا اُس نے۔۔۔ اُسے اِس مقام سے بے دخل کر دیا تھا اور یہ اعزاز اُس سے چھین کر تاج کے سپرد کر دیا تھا۔ گویا اُس سے اِنتقام لیا ہو اُس زیادتی کا جو پوٹھوار میں خاندانی وراثت کی طرح چلی آتی تھی کہ باپ کے خانے میں ایک جز وقتی باپ کا نام لکھا جاتا تھا۔ اگر یہ ضروری نہ ہوتا تو پھر دادا پردادا کا نام رقم ہوتا لیکن اُس نے تو بہت دوروں سے نام چُرا لیا تھا ''تاج۔۔۔ تاج محل'' نجانے کدھر رہ گیا تھا۔

نجانے کتنے تاج مزید اسار کر کسی دوسرے کی کفالت میں چھوڑ گیا ہو گا اور خود کہیں بھی کفیل نہ ہو گا۔ پوٹھوار کی عورتوں پر ایک نام کی جب چھاپ لگ جاتی تھی تو پھر عمر بھر یہ اُس میں خیانت نہ ہونے دیتیں۔ نہ خیالات و محسوسات میں نہ بدن کی اقلیم میں، جو جس نام سے جُڑ گئی اُسی نام کی مجاور بن گئی۔ اگر کسی دوسرے نام کا کھوٹ ڈالا تو پھر وہ عورت نہ رہی فحاشہ ہو گئی۔ تو کیا وہ فحاشہ ہے بچے کسی اور کے نطفے سے پیدا کرتی ہے اور نام کسی اور کے لگا دیتی ہے جو کفالت کے تصور سے واقف ہی نہ تھا لیکن اُس کے دل و دماغ پر تو چھاپ لگا گیا تھا۔ پھر وہ شکیلہ جان، زرینہ جان کیوں نہ بن سکی، جو پہاڑوں کی گود میں سمٹی اس ذرا سی بستی میں اُسی کو خدا مان بیٹھیں جس پتھر سے پہلے پہل پیشانی آن چھوئی، پھر جیتے جی اُسی سے سر ٹکراتی رہیں۔ جھڑ بیریاں سی جو صرف برسنا جانتی تھیں۔ کسی کو ان میٹھے پھلوں کی خواہش نہ تھی کوئی نہ چکھتا تھا۔ کوئی نہ سمیٹتا تھا اُنھیں، لیکن وہ تو مکئی باجرے کی روٹیاں اُنہی کے نام سے گھڑتیں۔ اُنہی کے نام کے نقش و نگار ان روٹیوں پر بناتیں۔ کبھی ماچس کی ڈبی رکھ، کبھی تیلی کبھی انگوٹھی کبھی چوڑی اور کبھی پوروں کے نشان ثبت کرتیں۔

شاید نوالہ توڑتے ہوئے ان نشانات کی تاثیر بھی حلق کے رستے دل میں اُتر جائے۔ کیا وہ بھی نئے عہد کی پڑھی لکھی عورت ان اَن پڑھ عورتوں کی طرح کسی پتھر کے آستانے سے لگ عمر گزار دیتی۔

یہ سوال اُسے اکثر راتوں کو بے چین رکھتا تھا۔ کیا اقدار جذبے اور احساسات زمانوں، خطوں اور معاشرتوں کی قدغن میں جکڑے رہتے ہیں۔ اس قدغن کا محافظ سماج مذہب رسم ورواج اور لوکیت ہے۔ کیوں اس پنجرے کی مٹھی میں بند بالعموم عورت ہی ہوتی ہے۔ کیا وہ اس پنجرے سمیت یورپ منتقل ہوتی یا پنجرے کا در کھول کر اُڑان بھر جاتی۔ اُڑان بھرنے کے باوجود پنجرے کی شبیہ اُس کے بدن پر کیوں کندہ رہ گئی ہے۔

سار یہ جان دُنیا جہان کے پکوان تیار کر کے ہمراہ لے آئی تھی۔ بیرونی صحنِ حرم میں صفرے بچھے تھے۔ پکوان سجے تھے۔ اِرادت وعقیدت کے سارے رنگ موجزن تھے لیکن کھانوں کی خوشبوئیں حرص میں مبتلا کر رہی تھیں۔ بھرے پیٹوں میں بھی خالی سرنگیں بنا رہی تھیں جن میں اِشتہا کی آندھیاں چل رہی تھیں، جو حرم کے نظاروں میں خلل ڈالتی تھیں۔

''ہم کتنی لیکھوں والیاں ہیں بھاوی!''

''ہماری ماؤں ماسیوں نے اُن کسوں کے سوا پنڈی چھوڑ روات بھی نہ دیکھا اور ہم دونوں جہانوں کے سب سے اعلیٰ مقاموں پر بیٹھی اللہ جی کی نعمتیں کھا پی رہی ہیں۔ اُنھوں نے کبھی بس میں پیر نہ دھرا ہم جہازوں میں اُڑتی پھرتی ہیں۔''

چھ تاج اور چار جان مِل کر کھیلیں گے تو لڑائی تو ہوگی۔

غصے کے عالم میں انگریزی جڑنے والے نسبتاً بڑی عمر کے بچوں سے چاروں میزبان بچے تنگ آ چکے تھے۔

''نکلو ہمارے گھر سے پتہ نہیں کہاں سے آ گئے ہیں انگریز کے پتر۔۔۔''

''اگر ہمیں آپس میں اسی محبت سے رہنا ہے تو اپنی الگ رہائش کا اِنتظام کرنا ہوگا۔'' اس

ورکنگ ریلیشن شپ پر وہ عثمان خان پھر شرما گیا تھا۔

اس الگ گھر میں کتنے کام تھے جو ورکنگ ریلیشن شپ بن رہے تھے۔

شروع شروع میں تو وہ بچوں کے ذریعے ایک دوسرے کو پیغامات دینے لگے۔

''امی سے کہو۔''

''ابو سے کہو۔''

پھر پاکستانی ایمبیسی کی پڑھائی ورکنگ ریلیشن شپ بڑھانے لگی۔

یورپی سکول کے بچے یہاں ایڈجسٹ نہ کر پا رہے تھے۔ ٹیچر پیرنٹس میٹنگ رزلٹ میٹنگ پھر یہ فراغت، بوریت۔

دس بارہ برس کے عرصے میں میدہ گوندھنے آٹا توڑنے مروڑنے اور گھڑنے کے عادی ہو چکے ہاتھ اُونٹھنے لگے۔ وہ اپنے اس ہنر کو کاروبار کی شکل کیسے دے سکتی ہے۔ یہ بھی ورکنگ ریلیشن شپ کی ایک وجہ تھی۔

وجود کی بھٹی میں کتنا فالتو کاٹھ کباڑ پڑا سڑ رہا تھا جس کو جلانا ضروری تھا۔

وجود خود کباڑیئے کی دکان۔ سب فالتو بے کار کچرا، زائدالمیعاد آؤٹ آف فیشن سامان، جسے ڈھالنا، توڑنا بھٹیوں میں پگھلانا اور فیکٹریوں سے نئے مال میں تبدیل ہو کر نکل آنا ضروری ہوتا ہے۔

یہ کچرا وجود بھی کسی بھٹی میں پگھلنا اور کسی نئی شکل میں ڈھلنا چاہتا ہے، ورنہ گل سڑ کر محض فاسفورس لیکن اس کی بھٹیاں تجاوزات میں شمار ہوتی ہیں۔ غیر قانونی ناجائز جیسے شراب کی بھٹیاں حرام، ناجائز، مذاہب کی لاگو حد بندیاں، کہیں شراب حرام اور سگریٹ حلال کہیں سگریٹ حرام تو شراب حلال کہیں گوشت حرام تو کہیں حلال۔ اِنسانی وجود کو انہی حکمی بھٹیوں میں گلنا ہوتا ہے۔ نیچر کی بھٹیوں میں نہیں۔ کباڑ خانے میں نیا سودا آتا تو وہ دونوں دیورانی جیٹھانی جائزہ لینے جاتیں کہ شاید کوئی کارآمد چیز اُنھیں مِل جائے۔

ایکسیڈنٹ شدہ گاڑیاں پچھلے ماڈل کے ٹی وی، فریج، اے سی، ڈیک، فرنیچر، بے شمار مشینیں۔

یہ عربی کتنے عجلت پسند ہیں نئے ماڈل کے متعارف ہوتے ہی پرانے کو پھینک دیتے ہیں۔
ایک ہم ہیں کہ پرانے بوسیدہ سے چپکے رہتے ہیں۔ کبھی یادگار بنا کر کبھی یادیں کہہ کر، کبھی سگھڑ پن کبھی سلیقہ شعاری۔ کتنے نام دے ڈالتے ہیں اپنی کنجوسی یا تنگ دستی کو ہم۔ ہماری خسیس فطرتیں خود کباڑ خانہ ہیں۔ آخری سانس تک ساتھ چپکنے والی فطرتیں...... ایک مکان کے ساتھ ایک شخص کے ساتھ ایک گراں کے ساتھ، کبھی چوے کے پانیوں کے ساتھ کبھی ایک انگوٹھی کے ساتھ کبھی ایک چھاپ کے ساتھ، کبھی ایک نام کے ہمراہ۔ کباڑ خانہ وجود، خانۂ دل میں جمع کاٹھ کباڑ، جسے نہ کبھی باہر پھینکتے ہیں نہ جلاتے ہیں جلے تو ساتھ خود بھی جل مرتے ہیں۔
''بھاوی انھیں کسی چیز سے محبت ہی نہیں ہوتی وابستگی ہی نہیں رہتی۔ ہر شئے پھینک ڈالتے ہیں۔ گھر کا سامان ہو کہ بیوی شوہر ہو۔'' ان تپتے صحراؤں میں ملبوسات اتنے تہ دار اور دراز کیوں کچھ حکمت تو رہی ہوگی۔ یہاں موسموں کی شدت سے بدنوں کو بچانا مقصود ہے کہ شدتِ جذبات کی نیرنگی کو سہارنا۔

باہر نکلتے وقت ساری بچیوں کو بھی عبائے اور سکارف میں مخفی کرنا پڑتا تھا۔
عجب معاشرتوں کا فرق ہے۔ کہاں بدن کا لباس بھی نوچ پھینکیں اور کہاں لباس در لباس پردہ در پردہ، جن کے پرت فطرتیں اوڑھ لیتی ہیں۔ یہ پردے رکھ رکھاؤ، حزم و احترام اصول قاعدے کہ چوری، پوشیدگی، منافقت، خوفزدگی، مجبوری، عجب خیال آیا تھا غزل جان کو۔ اگر اس کی ملاقات اس مقام پر ہوئی ہوتی تو تاج محل کا انجام وہ نہ ہوتا جو لندن کے قرب و جوار میں کہیں ہوا۔
یہ محبتیں اور قربتیں بھی اپنی معاشرت کے ڈھنگ سیکھے ہوئے ہیں۔ وہ ڈھیروں کھانے اور مٹھائیاں بنا چکی تھیں۔

کل پھر حرم کو روانگی تھی، یہاں تفریح کے لیے بھی پسندیدہ مقام حرم ہی ہے۔ گاڑیوں میں

قالین پکوان برتن گلاس بھرے جاتے تھے۔ صرف پانی ہمراہ نہ ہوتا تھا کہ اُس شفایاب پانی سے سیر ہونے کو ہی تو دوروں سے مسافر پہنچتے تھے۔ آبِ زم زم بھرنے کو خالی کین رکھے گئے تھے۔ غزل جان کو چوے کے پانی کا ذائقہ زبان پر محسوس ہوا۔ معدنی پانی شفایاب پانی، کسی بزرگ کی دُعا سے پھوٹا ہوا چشمۂ شفا جو صدیوں سے اُبل رہا ہے کبھی نہیں سوکھتا، ہاڑ جیٹھ میں جب سارے کنویں سارے تالاب اور آبشاریں اپنے سنٹھ حلق کھولے مر جاتے یہ اُس وقت بھی اُبلتا رہتا۔ پتہ نہیں اس کا سوتا کس تقدیس کے غلاف میں لپٹا ہے۔ یہ پانیوں کے عناصرِ ترکیبی کیسے بدل جاتے ہیں۔ عام پانی کب شفا کے منبع میں بدل جائے کسی بزرگ کی دُعا کہ انسانی فطرت کی کوئی خفیہ سازش۔

''بھاوی! اتنے مہینوں سے میں نے آپ کو اور بھائی جان کو کبھی جھگڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ یہ زیادہ محبت ہے کہ لاتعلقی۔''

صحنِ حرم میں چٹائی بچھائے ساریہ جان ساتھ لائے انواع واقسام کے کھانے چُن رہی تھی۔ ''ساریہ جان! تم دونوں طرح سے سوچ سکتی ہو۔'' کس مقام پر کیا پوچھ لیا تھا، جہاں سچ کہہ نہ سکے اور جھوٹ بولا نہ جا سکے، ایسی باتیں بھلا ایسے مقامات پر پوچھنا جائز ہے، جہاں انسان اپنی فطرت کے رُوبرو ہو۔

ہر سُو صفرے بچھے تھے جن پر افطاری کا سامان چنا تھا۔ آبِ زم زم کی بوتلیں بھری تھیں، جہاں افطاری کے ڈبے بٹتے تھے وہاں عورتیں اِک دُوجی کے بال اور عبائے نوچ نوچ کر ڈھیر ہو رہی تھیں۔

افطاری تو ایک کھجور سے بھی ممکن تھی لیکن یہ ہر ہر روز کلووٴں کے حساب سے کھجوریں چھینا جھپٹی سے جمع کرتی رہتی تھیں۔ یہ انسانی فطرت بھی عجب ہے۔ لاکھوں روپے، عمروں کی پونجی ذرا ذرا بوند بوند جوڑ جوڑ کر جوانی کو اُدھیڑ عمری کی ٹھنڈی لحد میں اُتار کر پھر کہیں ہجر میں برسوں رونے والی آنکھوں کو حرم کا دیدار نصیب ہوتا۔ وہ دیدار جس کے قصے کہانیاں سنتے فرقت کی نعتیں

پڑھتے نسلیں دفن ہوتی رہیں پھر کسی نسل کو ان آنسوؤں اور ریاضتوں کا اِنعام میسر آتا، لیکن یہاں ساری توجہ تگ ودواور سوچ ان کھجوروں کا حصول۔ وہ یہ سوچ کر تو نہیں آئی ہوں گی کہ اُن کا ارفع مقصد اس ارزل مقصد میں تبدیل ہو جائے گا، لیکن خیرات کی افراط لالچ کی اِشتہا کی وجہ ہے۔ یہاں کچھ بھی خیرات کرنا ممنوع ہونا چاہیے۔ مقصد سے منہ پھیر دینے والے دُنیاوی لالچ کا داخلہ بند ہونا چاہیے ورنہ عقیدتیں اور اِرادتیں بھی پیٹ کی سرنگ میں اُتر جاتی ہیں۔ وہ مقامات رُوبرو تھے، جن کی قسمیں سچائی ثابت کرنے کے لیے کھائی جاتی تھیں۔

مدینہ پاک کی قسم، مکہ پاک کی قسم، خانہ کعبہ شریف کی قسم، نبی جی کے روضے پاک کی قسم۔ بہت دُور اَن دیکھے مقامات اور ان جانی فضاؤں کی قسمیں کھانے والیاں کیا جانیں کہ یہاں جھوٹ بھی بولے جاتے ہیں۔ فریب کے جال بھی پھینکے جاتے ہیں۔ افطاری اور جوتے چرانے کو چوری نہیں سمجھا جاتا، شاید اس لیے کہ یہاں سب پہنچ میں ہے جو پہنچ میں آ جائے اُس کا خوف جاتا رہتا ہے۔ اَن دیکھے مقامات کی قسمیں کھاتے ہوئے جو لرزہ طاری ہوتا ہے وہ رُوبرو آ کر معمول ہو جاتا ہے یعنی حصول کی تگ وتاز مقصد لیکن حاصل معمول، وہ دونوں دیورانی جٹھانی دونوں چچیری بہنیں افطاری لوٹتی عورتوں پر فقرے اُچھالنے لگیں۔

''توبہ توبہ کتنے مذہب اُترے کتنے نبی پیغمبر آسمانی کتابیں اللہ جی نے بھیجیں ہر ایک نے ایک ہی بات سمجھائی۔

برائی مت کرو، لالچ مت کرو، کسی کا حق مت چھینو کسی کو تکلیف مت دو، لیکن سب جھوٹ ہوا یہ بندہ سچا ثابت ہوا کہ وہ اپنی غرض کے ساتھ تنہا ہے۔'' ذات میں تنہا۔ قبر میں تنہا۔ روزِ محشر تنہا۔ روزِ اجل تنہا۔ خود اپنی اپنی موت اور اپنی اپنی قبر میں تنہا۔ اپنے اعمال نامے میں تنہا۔ اپنے اپنے گناہ اپنے اپنے ثواب۔ پھر خود غرضی اور لوبھ اور آپا دھاپی کیوں نہ غلبہ کرے کہ بندہ اپنی فطرت میں اکلاپے کے بنجر میں تنہا ہے پیاسا ہے۔ وہ دوسروں کی فکر کیوں کرے کہ ایک روز ایسا آنے والا ہے، جب ہر سُو نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ مائیں اپنے بچے چھوڑ کر بھاگ نکلیں گی، جب ہر فرد صرف

اپنے کیے کا جوابدہ ہوگا، یعنی اپنی فطرت کے رُوبرو ہوگا۔ شاید اسی لیے اس قدر خودغرض تنہا اور لالچی ہے یہ بندہ۔ تنہائی کی زمین پر خوف اور لالچ کا کھیل کھیلتے ہوئے کتنا ننگا بچا۔ آپا دھاپی کھجوروں سے لے کر حجرِ اسود کے بوسے تک۔ افطاری سے لے کر حطیم میں گھسنے تک، کھانے سے ثواب تک جنت سے دوزخ تک، سب خوف اور لالچ کا گول چکر۔ کھانے سے جنت کے حصول تک سب ٹارگٹڈ۔ جنت کے ٹکٹ میں بھی شارٹ کٹ۔ دوسروں کو روندکر پچھاڑ کر گرا کر جنت کا حصول، کن عبادات اور وظیفوں سے جنت کے حصول میں تپلی گلی سے داخل ہو جائیں گے۔ کن تعویذوں اور چلوں تسبیحوں سے حاجات جلد از جلد پوری ہو جائیں گی۔ بابے بیبیاں، درگاہیں، قبریں، حاجات اور جنتوں کے کتنے چور دروازے، معافی نامے، این۔ او۔ سی، یہ انسان لمبی ریاضت اِنتظار لاغرض عبادت سے کتنا دُور۔ خودرب تعالیٰ نے بھی اپنی مخلوق کی فطرت کو ایسا ہی اُوتاولا اور خودغرض پایا تو پوری کائنات لالچ اور خوف کی طنابوں کے بیچ بچھادی۔

جنت کا لالچ اور دوزخ کا خوف، خود اپنے کیے کا جوابدہ کوئی مددگار نہیں، کوئی اپنے اعمال نامے سے کچھ عطا کرنے پر قادر نہیں اگر ہوتا بھی تو کون یہ قربانی دیتا۔ خود فطرت اِتنی ہی تنہا۔ خودغرض اور خوف زدہ یا پھر خوفناک، جیسا یہ بندہ اور جیسی اُسے بخشی ہوئی سیرت۔

بے شمار محرابوں اور میناروں میں اللہ اکبر کی صدا آسمانوں میں گونجی اور فرشِ زمیں پر اُتری۔ شفق کے خونی تالاب میں غوطائے دن اور بھسم ہوتے سورج کو ٹھنڈا کرتی یہ آواز یہ لحن یہ تاثیر...... دُنیا کے کسی خطے کی کسی صوت میں کسی قوم کے کسی فرد کے گلے میں کیوں نہیں ہے۔ یہ اس مٹی کی تاثیر ہے جس پر یہ الفاظ اُترے ہیں۔ یہ تاثیر اتنی جان لیوا ہے کہ کسی کو اپنے اثر سے نکلنے نہیں دیتی۔ کسی اِنکاری کے پردۂ سماعت سے ٹکرا جائے تو اقراری بنا دیتی ہے، پھر یہ افطاری لوٹنے والیاں اس تاثیر سے بے خبر کیوں ہیں۔

''بھاوی یہ زیادہ تر منگتیاں ہیں جنھیں سیزن لگانے کو ان کے ٹھیکیدار یہاں بھیجتے ہیں۔ باقاعدہ کاروبار ہے۔ ان کا حصہ تو کم ہی ہوتا ہے۔ سپانسرز کو اصل منافع جاتا ہے۔۔۔'' عبادات کو

کاروبار اور کاروبار کو عبادات بنا دینا کتنا آسان ہے۔ ہر مذہب میں کتنی گنجائش موجود ہے۔ عبادت کے کاروبار ہو جانے میں۔۔۔تعویذ دھاگے، دم پھونک، قبریں مزار، درگاہیں، خانقاہیں، مسجد مندر گرجے اسٹوپے سب کے تہ خانوں میں دُکان گھسی ہے۔ بیشتر دُکان دار مرد ہیں اور گاہک عورتیں۔ پہلے پہل متاثر ہونے والی بھی عورتیں ہیں پھر وہ نظام تاثریت میں مردوں کو بھی کھینچ لاتی ہیں۔

غزل جان آبِ زم زم کا پیالہ تھامے اس اُمرت رس کے ذائقے کو گھونٹ گھونٹ حلق میں اُتار رہی تھی۔ صفیں درست ہو رہی تھیں بھاگ بھاگ کر لوگ بیچوں بیچ گھس رہے تھے۔ صحنِ نبوی میں پھیلی پھول نما چھتریاں اپنی پنکھڑیاں پھیلائے اِک دُوجی سے گلے ملتی اور سنہری دروازوں پر چمکتی دھوپ کے لمبے پڑتے سائے سمٹ چکے تھے۔ افطاری کے طول وطویل صفرے، عربی، پاکستانی، ہندوستانی، لبنانی، سوڈانی، شامی، ترک، ایرانی، کس کس خطے کے نقش ونگار اور کھانوں کی مہکاریں، لہجے اور زبانیں مقصد ایک۔۔۔ زندگی میں زمینی خواہشات کی تکمیل کی حسرت اور مرنے کے بعد جنت کے حصول کی تمنّا کوئی عمل لاغرض یا طمع کے بغیر نہیں ہے۔

مسجدِ نبوی کے صحن میں عشاء کی نماز کے بعد بہت سے خاندان پکنک منا رہے تھے۔ انواع واقسام کے کھانوں کا باہم تبادلہ کیا جا رہا تھا۔ حرم کی فصیل کے ساتھ ساتھ ریڑھیاں اور پتھارے سجے تھے۔ عجیب مقامِ حیرت ہے یہ۔ جہاں عبادت کاروبار اور تفریح سب یکجا ہے۔

چھ تاج جین شرٹ پہنے اور چار جان عائشہ جان آمینہ جان عبداللہ جان، حمزہ جان عربی چغے پہنے مسجدِ نبوی کے صحن میں بھاگتے دوڑتے ایک دوسرے کی بولی سمجھے بنا کھیل کود رہے تھے۔ سبھی بچوں کی بنیاد پوٹھواری تھی۔ دونوں کے ماں باپ پوٹھواری بولی میں محوِ گفتگو تھے، لیکن سبھی تاج انگریزی اور سبھی جان عربی سبھاؤ میں ڈھل چکے تھے۔

جائے نماز، تسبیحاں، ٹوپیاں، عطر، چاکلیٹ، شالیں، سستے داموں بہت مال سجے تھے۔ پانچ دس ریال کی لوٹ سیل سیاہ فام عورتیں عبائے اور حجاب لپیٹے ٹرالیاں دھکیلتی، گاہکوں کو سستے

مال کی سمت متوجہ کر رہی تھیں اور عربی عورتیں نخوت سے اُنھیں دیکھتی تھیں، جن پر ابھی شرطے ٹوٹ پڑیں گے اور ان کے مال آدھے فٹ پاتھوں پر آدھے ریڑھیوں پر، آدھے قدموں تلے روندے جائیں گے۔

چھوٹا تاجدار کئی چیزیں جمع کر چکا تھا، جس صفرے کے قریب سے گزرتا وہی کوئی چیز تھما دیتے۔ عربی کلچر کی محبت کا خاص انداز جو اچھا لگے اُسے کوئی کھلونا کھانے پینے کی کوئی چیز یا ریال تحفتاً دے دیتے ہیں۔

تمام بچوں میں سے چھوٹا تاجدار سب سے زیادہ چیزیں وصول کر چکا تھا یعنی سبھی بچوں میں سے سب سے پیارا تاجدار تھا۔ اُس کے ساتھ تاج جو جڑا تھا۔ ساری محبتیں ساری خوبصورتیاں ساری کشش، تاج کا حصہ۔ روئے زمین پر انسانی ہاتھ کی صناعی کا بہترین نمونہ...... پھول نما چھتریاں اپنی پنکھڑیاں سمیٹ چکی تھیں۔ اب وہ پنکھڑیاں سمٹ کر کلیاں بن گئی تھیں۔ تیز روشنیاں سنہری دروازوں سے ٹکرا کر شعاعیں چھوڑتیں۔ حرم کے آسمانوں کو منور کرتیں جیسے سونے کی کٹھالی میں سورج اُتر آیا ہو۔ بنی انسان کی تمام نسلوں کے لوگ اس ایک صحنِ زمیں پر جمع تھے۔ سونے کی کانوں کے کان کن، اس خالص دھات سے جھولیاں بھر بھر لے جانے کو کہاں کہاں سے کھنچے آئے تھے۔

چھوٹی چھوٹی عمر کی لڑکیاں اور لڑکے نو بیاہتا عربی جوڑے، لڑکے کے کندھے سے لگا ہوا بچہ۔ لمبی ٹیل والے عبائے میں چھپی عربی لڑکی، شارٹ سکرٹ ذرا سی نیکر بنا آستینوں والی شرٹ۔ اس بڑے سے عبائے کے اندر وہی لباس ڈھکا ہوا جو یورپ کے ساحلوں پر اَن ڈھکا دِکھائی دیتا ہے۔ ظاہر دوٹوک سامنے۔

یہاں سب پردے میں چھپا۔ پوشیدہ، مخفی، پسِ پردہ۔ تاثیر کے رُوحانی حوضوں سے شرابور آواز بے شمار گنبدوں اور میناروں سے باوضو ساری کائنات میں پھیل رہی تھی۔

فلاح کی طرف آؤ اِصلاح کی طرف آؤ۔

صفوں میں گھسنے کی کوشش میں دھکم پیل، عورتیں زیادہ پھیل کر زیادہ جگہ گھیر رہی تھیں جو

عرصے سے بیٹھی تھیں۔ بعد میں آنے والیوں کے لیے کیوں تنگ ہوں۔

سیاہ عبائے دستانوں اور جرابوں میں پوشیدہ پہرے دار لڑکیاں اضافی تعداد کو رستوں سے ہٹا رہی تھیں۔ دروازوں سے باہر دھکیل رہی تھیں۔ نماز کے لیے جگہ مِل جانا بھی مشکل۔ نئے آنے والے گھسنے کی کوشش میں، پہلے کھڑے ہونے والے مزید پھیلنے کے لیے کوشاں۔ ہر ایک کو اپنے اپنے جوتوں کی فکر، جوتوں کی پوٹلی ساتھ ساتھ۔ حرم میں اِتنی سہولیات کی موجودگی میں اگر روزانہ دو تین لاکھ جوتے بھی رکھ دیئے جائیں تو شاید جوتوں کی فکر عبادت میں مخل نہ ہو۔ کیا پھر بھی لوگ جوتوں پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تھیلے بھر بھر لے جائیں گے اور ردّی میں بیچ دیں گے۔ پھر حرم کے باہر اپنے ہی جوتوں کو دوبارہ خریدنے کا بھی اہتمام ہونا چاہیے تاکہ جوتوں کی چوری کی بدعت ختم ہو سکے۔ لمبی ترنگی مصری، افریقن ترک عربی عورتیں ان کے بیچ یہ کوتاہ قامت برصغیر کی دیوانیاں بدعتی محبت اور احترام میں سب سے بڑھ کر بدعتیں کرنے والیاں، عقیدت کو شرک سے مِلا دینے والیاں، جن کی خصلتوں میں بت پرستی چھپی ہے۔ عقیدتوں میں پیر پرستی، حسیات میں لمسیات، قبریں، درگاہیں، خانقاہیں، مقدس شجر و حجر، پیری فقیری، کتنے بت چھپے ہیں اوڑھنیوں میں...... کتنے سجدے تڑپ رہے ہیں جبینوں میں جو کسی پتھر سے ٹکرانا چاہتے ہیں۔ اَن دیکھے خدا پر یقین تو ہے لیکن یہ گنہگار آنکھیں کچھ مجسم دیکھنے کی ضد میں ہیں۔

اُردو زبان کے درس میں یہی سب سمجھایا جاتا تھا کیونکہ سب سے جاہل، بدعتی، فقیرنیاں بےنوا، بدنظم، بےہنگم یہ اُردو زبان والیاں ہی سمجھی جاتی تھیں۔

پیر پرستی، قبر پرستی، ختم درود، ہاتھ اُٹھا کر مرے ہوؤں کو بخشش کی سفارشیں کروانا یہ سب بدعت بتایا جاتا تھا۔ کسی نام پر صدقے قربانی حج سب دل کی تسلی، جو مر گیا اپنے اعمال ساتھ لے گیا۔ پیچھے روانہ کیے گئے صدقے خیرات میّت کو تھوڑی پہنچتے ہیں، یعنی دل آسائی کا بہانہ بھی چھن گیا۔ قبر کی ڈھیری کی محافظت بھی گئی۔ زرینہ جان محمد جان جیسی کتنی ہوں گی جن کا قبروں کی ہمراہی

میں جینا دراصل تنہا جینا تھا۔ ان ڈھیریوں میں رہنے والے نہ اُن کی محبت محسوس کرتے تھے نہ وفا نہ یکتائی۔ نہ اُن کے دُکھوں شکوؤں کو سنتے تھے۔ ہواؤں کے جھونکوں پر سوار جو خوشبوؤں کے لپکے اُنھیں محسوس ہوتے تھے تو وہ عالمِ ارواح سے اُنھیں ملنے کوئی نہ آتا تھا، محض اُن کے اپنے بے اختیار جذبوں کی مہکاریں تھیں جو مشکِ نافہ کی طرح ان کستوری ہرنیوں کو عمر بھر وحشت میں گریز پا رکھتی تھیں۔ یہاں تو یہ ڈھیریاں بھی ہموار۔ سرٹکا کر رونے والی سِل بھی غائب۔ ڈھیری کے ہمراہ نام بھی نابود کوئی نشان تک باقی نہیں۔

اس کائنات کا اِستعارہ یہ قبرستان جو پہلے آیا وہ گزر گیا۔ ختم، جو بعد میں آیا سمجھا وہی سدا رہنے کو آیا۔ دُنیا اسی کے لیے بنی۔ کتنی بڑی غلط فہمی کے ساتھ جیتا ہے یہ بندہ بھی۔ ایک زنجیر ہے انسانی، طولانی بے اَنت، کڑیاں ٹوٹتی گرتی جھڑتی ہیں۔ زنجیر کہیں نہیں ٹوٹتی۔ چاہے ایٹم بم گریں کہ طاعون پھیلیں، جنگوں کی غارت گری ہو کہ سماوی آفات اُتریں۔ بس کڑیاں جھڑتی ہیں زنجیر نہیں ٹوٹتی۔ سدا باقی رہتی ہے جس کے خاتمے کے لیے قیامت کا تصور، پر کون جانے۔۔

برصغیر کی بدعتی، مریدیت زدہ عورتیں، ریاض الجنہ کی زیارت کے لیے بھی یوں ہی ٹوٹ پڑتیں، جیسے کھجوروں اور افطاریوں پر ٹوٹتی تھیں۔ دھکم پیل روندتے، رگیدتے چھینتے جھپٹتے بازی مارتے مات دیتے۔

ہرے رنگ قالینوں پر پیر رکھتے سجدہ کرتے اور تادیر جالیوں کی سمت منہ کیے دُعائیں مانگتے، جنتوں کا وعدہ لیتے شفاعت کی یقین دھانی کرواتے، یعنی جنتوں کو بھی یوں اُچک لینے میں اتاولی جیسے کھجوریں، ذراسی کوشش کے بدلے زیادہ سا خراج وصول کر لینے کی تگ و دو میں ایک دوسرے سے اُلجھتی، محافظوں کی نگاہوں سے چھپتی دوسروں کو گرا کر اوندھا کر کچل کر روند کر جنت کو چُرا لینا، جیسے نگاہ بچا کر افطاری کے ڈبے، یہاں بھی اپنا اپنا جنتی لوبھ جیسے اپنا اپنا زمینی حرص۔

افطاری ہو کہ ریاض الجنہ حطیم ہو کہ حجرِ اسود کا بوسہ جو پہنچ گئی وہ دوسرے کے لیے جگہ کیوں چھوڑے، نہیں جب تک گھسیٹ کر باہر نہ نکالا جائے۔، جہاں ایک گھس جائے وہیں دوسریاں ٹوٹ

پڑیں کہ شاید وہیں زیادہ ثواب بٹ رہا ہے۔ دوسرا اُن سے زیادہ سمیٹ رہا ہے، جہاں دھکم پیل زیادہ، وہیں گھسے پڑتے ہیں کہ شاید وہیں جنت بٹ رہی ہے۔ثواب تقسیم ہو رہا ہے کہ افطاریاں۔

صفا و مروہ کے بیچ دوڑتے ہوئے اس خاندان کے چھوٹے بڑے پیاس سے نڈھال ہو ہو جاتے تھے۔ احرام سنبھالتے بیچوں بیچ نصب ٹھنڈے پانیوں کی ٹونٹیوں سے منہ دھوتے۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے کرتے۔ اصل عبادت تو وہ پیاس ہے جو ایک معصوم بچے اور ایک تنہا عورت نے جھیلی تھی۔ اُس کا رُوحانی ذائقہ، سنگلاخ پہاڑیوں کے بیچ پانی کی تلاش میں بچے کو پیاس سے مرنے سے بچانے کی سعی...... اسی ریاضت کی رُوح کو پانا مقصود تھا لیکن اُونچی چھتوں اور طویل و عریض دیواروں کے بیچ اس مقامِ ریاضت کو مقید کر دیا گیا تھا۔ صفا و مروہ کے بیچ ایئر کنڈیشنڈ سنگِ مرمر کی شفاف سڑکیں، کاش یہ اُسی حالت میں محفوظ کر لی جاتیں۔ وہی سنگلاخ پہاڑیاں ناہموار کٹھن رستہ جب دو پہاڑیوں کے بیچ ایڑیوں کی رگڑ سے چشمۂ شفا پھوٹ نکلا تھا، پھر ان کٹھن راہوں میں شاید عمرے کا فیشن اس شدت سے نہ بڑھ پاتا۔

زم زم، جو صدیوں سے جاری ہے نہ ختم ہوتا ہے نہ پانی کم پڑتا ہے نہ تاثیر۔

عجب معجزہ ہے۔ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا معجزہ۔ یہاں ہر آنے والا اپنی زندگی میں ایسے ہی کسی معجزے کا منتظر ہوتا ہے۔ جتنا خرچ کر کے آتا ہے اُس سے کہیں بڑھ کر طلب کرتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں شکوہ کناں رہتا ہے۔ہم کچھ بھی بنا منافع کے خرچ نہیں کرتے وہیں لگاتے ہیں، جہاں واپسی ڈھیر سارا منافع ملے۔ عبادت ہو کہ کاروبار۔۔۔ وہ دونوں بھائی حج کا منصوبہ بنا رہے تھے، لیکن یہاں رہنے والوں پر خاص عرصے کے اندر دوبارہ حج کرنے پر پابندی عائد تھی، لیکن اکرم خان اُن خفیہ بلوں کو جانتا تھا جہاں سے وہ گھس سکتے تھے۔ وہ تمام حفاظتی باڑوں کو چوہے کے سے باریک دانتوں سے کاٹ سکتے تھے۔ وہ محافظوں کو چکمہ دے کر حج کا ثواب حاصل کر سکتے تھے۔ وہ کونسا ذاتی منفعت کے لیے جُل دیں گے۔ حج جیسے فریضے کی ادائیگی کے لیے کچھ

بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب خدا کی راہ میں ہوگا۔ اللہ قبول فرمانے والا ہے۔ یہ اُس کی رضا کے لیے ہوگا۔ اُسے راضی کرنے کے لیے کیا گیا ہر عمل جائز اور مسنون ہے۔

اکرم خان تفاخر سے بتا رہا تھا۔

''جب سے یہاں آئے ہیں کوئی ایسا حج نہیں جو اللہ کے فضل سے نہ پڑھا ہو۔ بس منیٰ میں داخل ہونا مشکل ہے لیکن جب کسی طور منیٰ کی پہاڑیوں میں روپوش ہو جاؤ تو پھر پکڑے بھی جاؤ تو شرطے بے عزت کر کے چھوڑ دیتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ اب یہ حج کی نیت سے گھروں سے نکل آئے ہیں تو میدانِ عرفات کی راہ میں مزاحم ہونا گناہ ہے۔''

یہ کیسے ممکن ہے کہ عرب کی سرزمین پر انسان بسے اور حج کے موسم میں گھر بیٹھا رہے۔ چاہے مقامی افراد کے لیے یہاں حج کی مُدّت مقرر تھی لیکن بہت لوگ گھس بیٹھیا حج کرتے تھے۔ لاکھوں افراد کے قلب میں گھس جانے والوں کو کون شناخت کر سکتا ہے۔ چوری حج قانون سے چھپ کر مذہبی فریضے کی ادائیگی، قانون تو انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ حج حق تعالیٰ کا نافذ کردہ فرض۔

وہ اس بار بھی موجیں مارتے سفید جھاگیں اُڑاتے منیٰ کے سمندروں میں قطرہ سا گم ہو گئے تھے۔ راتیں فٹ پاتھ بدل بدل کر گزارتے کہ کہیں پوچھ گچھ نہ ہو جائے۔ قالین گاڑیوں میں بھر کر لائے تھے۔ اُسی میں گچھا مچھا ہو جاتے تھے۔ فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد دِن بھر چھپنے کے منصوبے بناتے رہتے۔ سلیمانی ٹوپی پہن کر وہ تمام فورسز کو جُل دے جاتے۔

منیٰ کے کسی خیمے میں براجمان ہونا اور دن بھر انواع و اقسام کے کھانے تناول کرتے رہنے کی نسبت کھلے آسمانوں تلے تاحدِ نگاہ پھیلے خیموں کے شہر کا نظارہ کرنا زیادہ رُوح پرور تھا۔ اَن گنت قطار در قطار خیمے، جیسے رُوح کے کبوتر سفید بُراق کنوپیوں پر سے عرشوں کی سمت پرواز بھرنے کو پر پھیلائے ہوں۔ سفید احراموں میں ملبوس حاجی چوڑی صحرائی سڑکوں میں دودھ کی نہروں سے موجزن۔

ہر سُو سفید پنکھوں والے مور چھتریاں تانے سفید کلغیوں کے تاج سر پر سجائے۔ پورا شہر جیسے

سفید مور پنکھوں سے بنا ہوا۔ جیسے بُراق سنگِ مرمر سے تراشے پہاڑی سلسلے جن کے بیچ سفید چادروں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا بہتا تھا۔ سفید خیموں کا شہر عارضی پڑاؤ۔ دُنیا کی حقیقت زندگیوں کا مفہوم اسی کفنی لباس میں مضمر۔ کھانوں کے انبار، جتنا کھا سکو کھاؤ، لیکن باندھ کر رکھنا کہیں کچھ پس انداز کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں۔ انواع واقسام کی خوراکیں نچھاور ہو رہی ہیں۔ باسی پرانا بچا کر سنبھال کر کیوں رکھا جائے۔ ذخیرہ اندوزی کا جواز ہی نہیں۔ زندگی کی حقیقت اسی عارضیت میں محدود۔ عارضی لباس، عارضی جوتے عارضی گھر عارضی خوراکیں۔ انسان کی حقیقت یہی عارضیت۔ اسی حقیقت کی عملی تفسیر فلسفۂ حج ہے۔ پتہ نہیں اس چوری چھپے کے حج سے حج کا ثواب ملتا بھی ہوگا یا نہیں لیکن ثواب کے لالچ کا موقع کیونکر گنوا سکتے تھے۔ اس وافریت سے خود کو کیسے محروم رکھ سکتے تھے۔

سفید خیموں کے شہر میں رُوح کے نرم بُراق پروں والے کبوتر اُڑانیں بھرنے لگے۔ نازک کلغیوں پر رکھے پر جلنے لگے۔ دفعتہً منیٰ کا میدان، میدانِ حشر میں تبدیل ہو گیا۔ خیمے تڑ تڑ بھڑ کنے لگے۔ صحرائی ہواؤں کے پنکھے جھلسی ہوئی ہوا دینے لگے۔ روزِ محشر والی چیخ و پکار جب مائیں بچے چھوڑ رہی تھیں جسم لڑھک رہے تھے۔ لباس جل رہے تھے۔ دوان سلی جلتی چادریں جسموں سے نوچ نوچ پھینک رہے تھے۔ عبائے اُتر گئے تھے۔ ساحلوں سے لگے بحری جہاز سے خیمے آگ کا بگولا بن گئے تھے۔ بادبان صحرائی ہواؤں کے دوش پر رقصاں تھے اندر باہر سب بھسم۔

عثمان خان سارے تاجوں کو بحفاظت نکال لایا تھا۔ اُس کے حوالے کر کے وہ پھر لوٹ گیا تھا۔ سامان بچانے کو، قالین نکالنے کو، وہ اپنے فرائضِ منصبی سے کیسے غفلت برت سکتا تھا۔ وہ تو کسی سپاہی کی طرح ہر پل حفاظت پر مامور رہتا تھا۔ کسی فوجی کمانڈر کی طرح اپنی چوکی کی نگرانی میں چوکس۔ اپنی حدود، زمین اور لوگوں کی رکھوالی پر تعینات۔ اپنے فرض کی ادائیگی میں جان نچھاور کرنے والا مستعد سپاہی۔ ایک ایک اِنچ ایک ایک ذرّے پر مر مٹنے والا۔ وہ بھلا کیسے اپنے فرض سے غافل ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا ساز و سامان کیسے غارت ہونے دیتا۔ دھویں کی سیاہ گاڑھی اُونچی

چوٹیاں افلاک کو ڈھانپ گئیں۔

تڑ تڑ پھیلتی آگ سفید خیموں کو راکھ کے ڈھیر بنا رہی تھی۔ جنت المعلیٰ جنت البقیع میں دفن ہونے کی آرزو میں جینے والوں کو شعلوں میں کفنا رہی تھی۔ اس زمین سے نہ لوٹنے کی دُعائیں کرنے والوں کی دُعائیں مستجاب ہو رہی تھیں۔

جنت کی اُمید میں یہاں آنے والوں کے لیے زمین دوزخ بن گئی تھی۔ ہر شئے کو شعلوں کی لپکتی لمبی زبانیں چاٹ رہی تھیں۔ سفید احراموں کو سفید کنوپیوں والے خیموں کو، عرفات کے میدان میں جمع ہونے کی خواہش میں آنے والوں کو نارِ جہنم ہڑپ رہی تھی کہ جنت بھیجنے کا ذریعہ شاید یہی مقسوم تھا۔ وہ اِس جہنم کے کڑاہے کے کناروں کھڑے عثمان خان کے لوٹ آنے کے لیے پُراُمید تھے، جو اپنا جہنمی حلق کھولے دوزخی پیٹ میں سب نگل رہا تھا۔

جلے بھنے آدھے ادھورے آگ بھڑکتے انسانی شعلے جہنمی کڑاہے سے نکال نکال کر ڈھیر لگائے جا رہے تھے۔ جن کی سانسیں چل رہی تھیں۔ ہسپتالوں میں پہنچ کر مر رہے تھے۔ ایمبولینسوں کا شور، آگ بجھانے والی گاڑیوں کے خشک پڑے پائپ۔ فضاؤں میں پروازیں بھرتے ہیلی کاپٹر۔ امدادی کارروائیاں پُرشور، روزِ حشر کا ہنگامہ۔ مُردوں کے ڈھیر اُوپر نیچے جیسے کھجوروں کے ڈھیر۔ لباس نہ جلے تھے جلد بھی پگھل گئی تھی۔ نقوش مسمار۔ شناخت ناپید۔ کوئلہ ہوئے ڈھانچے۔ بھسم ہوئے گوشت، اُبلی ہوئی ہڈیاں سب یکساں پھر بھی ان بھسم ڈھیروں میں سے عورتیں اپنے پیاروں کو شناخت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اُوپر والا غلاف جل گیا تو اندر سے سب برابر نکلا۔۔۔ ایک جیسی ہڈیاں ایک جیسا ڈھانچہ پسلیاں اور جبڑے۔

اُوپر منڈھا شناخت کا جو پرت اُتر گیا تھا۔ بس اِس باریک سی جلد میں ہی ساری شناختیں پنہاں تھیں۔ کچھ ہڈیوں پر دانتوں پر کندہ نہیں۔ شناخت اتنی عارضی اور معمولی جیسے کسی جانور کتے بلی کا ڈھانچہ جو کسی گاڑی کے ٹائروں تلے آ کر کچلا گیا، تو پھر مرا ہوا صرف کتا بلی رہ گیا جیسے یہ مرا ہوا انسان۔ کسی شناخت پہچان، نام نشان کا خارجی پرت اُتر گیا تو بس بے شناخت بے نام ڈھانچہ۔۔

وہ اس ڈھیر میں سے بھی شناخت کر عثمان خان کو کھینچ لائی تھی اور گھسیٹے لیے جا رہی تھی۔ کسی کو کسی کے عمل فعل کی کچھ خبر نہ تھی۔ شاید قیامت کا منظر ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ اتنا خوفناک کہ جس سے ڈرتے ہوئے انسان اپنی فطرت سے الگ ہو کر نیکیاں کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ سب بھی اتنا ہی خوفناک۔

''یہ کیا کر رہی ہو بھاوی۔''

''اسے گاڑی میں ڈالنے میں میری مدد کرو۔'' اُس کی ہتھیلیاں اُنگلیاں جھلس گئی تھیں جن سے ریزہ ریزہ گوشت چربی پگھل کر قطرہ قطرہ ٹپک رہے تھے، جیسے بھڑکتے ہوئے انگاروں کی سیخ پر چڑھا ہوا دمبہ۔ جس سے جلتی ہوئی راکھ جھڑتی ہو۔ ناک کی ننگی پھنک اور راکھ ہوئی پلکیں اور ابرو پھر بھی پوٹھواری شبیہ قائم تھی یعنی ڈھانچوں پر بھی اگر کوئی پہچان رہ جاتی ہے تو وہ صرف علاقائی چھاپ۔ نسلوں کے جینز خون کے گروپ رہ جاتے ہیں خود انسان نہیں رہتا۔

''کیوں پاگل ہوئی ہو بھاوی اس جلی بھنی لاش کو کہاں لے جاؤ گی۔ خوش قسمت ہے کہ جنت المعلیٰ میں اللہ جی نے جگہ دے دی ہے۔ بھاوی۔ اس کے مقدر پر ناز کرو۔۔۔''

وہ چھ عدد تاجوں کو ڈانٹنے لگی۔

''مدد کرو میری اپنے باپ کو اس بے شناخت موت سے بچانے میں میری مدد کرو۔''

وہ چھ لگے تو جلتے ہوئے گوشت اور پگھلتی ہوئی چربی کو اُس نے عبائے میں باندھ لیا۔ خود بے پردہ ہوگئی کسی کو روزِ حشر دوسرے کی برہنگی کی کیا خبر ہوگی۔ پردے ہٹ جائیں گے۔ نقاب اور عبائے اُٹھ جائیں گے۔ انسان اپنی فطرت کے رُوبرو برہنہ ہوگا۔

دوزخ بنی زمین پر اُس کے ہاتھ کی رگڑ سے اوپر لا گوشت اور چربی پگھل گئے تھے۔ سفید ہڈیاں جلتی دکھائی دے رہی تھیں۔ زمین کے سینے سے دھواں چھٹتا تھا۔ وہ عبائے میں بندھی پنڈ کو گھسیٹے چلے جا رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے۔ باپ کی موت سے زیادہ اس خوفناک منظر کی تاب نہ لا پا رہے تھے۔ عبائے میں بندھا جلتا پگھلتا گوشت سیاہ پوٹلی گھسٹتی، پیچھے پڑتی رگڑ پر اُبلتی چربی اور

پگھلتے گوشت کے ذرّے لوتھڑے راکھ اور بھربھری ہڈیوں کی لکیریں اور ڈھیریاں چھٹ رہی تھیں۔ وہ گاڑی دوڑاتی چلی گئی۔

کتنا کام تھا کرنے کو ماتم کا تو وقت ہی نہ تھا۔ مردہ ٹھکانے لگانا کتنا دشوار...... مر کر بھی دنیا کتنی تنگ، رسموں، عقیدوں میں گھٹی، غسل، کفن، تابوت مردہ خانے میں محفوظ کروانا۔ کتنے کام ہوتے ہیں مرنے کے بعد بھی یہ تجہیز و تدفین کتنا مشکل پر ہیجان عمل۔ ماتم کی فرصت ہی کہاں تھی۔

اُس کے برٹش پاسپورٹ نے ساری آسانیاں پیدا کر دیں۔ پاکستانی پاسپورٹ کی بے توقیری میں تو وہ اجتماعی قبر میں دفن بھی ہو چکا ہوتا۔ کوئی نام ونشان بھی نہ مِل پاتا۔ بکنگ بھی پہلے لندن کی ہی ملی تھی۔ ایئرپورٹ پر جسبیر کور سارے بینوں، سارے آنسوؤں، مستقبل کے سارے منصوبوں سمیت موجود تھی۔

''گڈی! اہنوں دفنا کے مڑ آئیں اُتھے ہن کی رکھیا تیرے لئی۔''

سارے رشتے سارے انگ ساک تو وہیں ہیں لیکن وہ پرائے ہو جائیں گے جب وہ اُن کے گھروں میں گھسنے کی کوشش کرے گی، جب ڈالر پونڈز اور ریال آنے بند ہو جائیں گے تو بڑی اجنبی اور بوجھ ہو جائے گی۔ پوٹھوار کی عورتوں کی بڑی بڑی لڑائیاں اُسے یاد آئیں۔

تیرا ابا بہت روندا اے پر اُٹھ نہیں سکتا۔ پاسا بھی نرس چینج کراتی ہے، دماغ پورا جاگتا ہے اس کا۔ پر جسم سوتا ہے، یہ بڑا دکھ ہے دماغ بھی سو جاتا تو سکھ میں آ جاتا...... گڈی،

''مڑ آئیں اپنی دُنیا اِچ۔ رنڈاپا سوکھا لنگ جاندا اے۔ اوتھے سہاگ سوکھا لنگدا اے۔ ایتھے رنڈاپا ٹپ جاندا اے۔۔۔ مڑ آ وَ۔ مِل کر میدہ گوندھیں گی۔۔۔ شیرہ اُبالیں گی دونوں جنیاں۔۔۔ مٹھائیوں کے سانچے بہت اُداس ہیں تیرے بنا۔۔۔ گڈی! تیری بھی کالی مرغی کھو گئی۔۔۔ تیرا بھی دل ٹھکانے نا رہا۔۔۔ آ جا دونوں مِل کر کھوئی مرغی کا غم سہاریں گی۔۔۔ میری کالی مرغی کھو گئی۔۔۔ میرا دل ٹھکانے نا۔۔۔'' لیکن اُس کی شناخت اُس کی توقیر اس کی حیثیت صرف اس میّت کی قبر سے وابستہ ہے۔ کتنی ضروری تھی قبر۔ کتنا ضروری تھا عثمان خان کو شناخت

دینا۔ اس قبر کی شناخت سے اپنی شناخت کو محکم کرنا۔ کتنی قبریں تھیں یہاں جن سے شناختیں وابستہ تھیں جو خود تو خاک ہوئے لیکن عورتوں کی شناختیں انہی سے استوار رہیں۔

زرینہ جان کے حوالدار کی قبر ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اُس کا اُونچا تعویذ اوندھا گیا تھا، لیکن زرینہ جان کی اس سے وابستہ شناخت ابھی بھی باقی تھی۔ امیر جان کے کپتان صاحب کی قبر ابھی قائم تھی کہ وہ شہید کی قبر تھی، جسے ابھی بھی فوجی دستہ سلامی پیش کرنے آتا تھا اور اُس کی حفاظت کا بندوبست کر جاتا تھا۔ صنوبر جان کی قبر تو زنانہ قبر تھی، اُس کی بے شناختی میں ہی عورت ذات کی توقیر تھی۔ اُس کی بنیادیں مضبوط رکھی گئی تھیں کہ کہیں بارشوں، طوفانوں، زلزلوں میں ننگی نہ ہو جائے۔

سب سے اُونچے تعویذ والی سفید سنگِ مرمر کے چوکھٹے والی خوبصورت اور مہنگی ترین قبر عثمان خان کی تھی، جسے وہ روز چوے کے پانی سے دھوتی۔ عرقِ گلاب چھڑکتی۔ اگر بتیاں لگاتی، گھی کی تر واٹ والے مٹی کے دیئے جلاتی۔ اُس کا جی چاہتا تھا وہ اس کی اتنی پرستش کرے کہ یہ قبر مرجعِ خلائق ہو جائے۔ لوگ کسی ولی اللہ کی قبر سمجھنے لگیں۔ منت کی چادریں چڑھانے لگیں۔ حاجتوں کی دُعائیں کرنے لگیں۔ ہر چوٹی پر بنی کسی بزرگ کی قبر کی کوئی تاریخ تھوڑی ہے کسی کے پاس کہ وہ بزرگ تھے کون اور کہاں سے آئے تھے۔ ارادتوں کے یہ سلسلے کیسے قائم ہوئے، اندھا اعتبار بس موروثی ارادت، نسل در نسل پیری مریدی کے سلسلے۔ کبھی کسی نے رُک کر تدبر کیا کہ یہ سلسلہ کیونکر قائم ہوا۔

قبروں کے بھی نام اور شہرتیں بنائی جاتی ہیں۔ خوش قسمت ہیں وہ قبریں جو زندوں کے لیے حاجات کا منبع بن جاتی ہیں۔ اُس نے سرہانے پر جنڈ کا درخت بھی لگا دیا تھا کہ جس پر منت کی ٹاکیاں اور حاجات پوری ہونے پر جھنڈے باندھے جا سکیں گے۔ عثمان خان جیسے اچھے انسان کی قبر کو یہ توقیر ملنی چاہیے کہ یہ قبر سدا جیتی رہے۔ یہ شہید کی قبر ہے جسے فرشتے خود غسل دیتے ہیں اور وہ زندہ رہے گا اور شہید زندہ ہوتا ہے۔ ہمیں اُس کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔ اُسے شہید کی قبر کو زندہ رکھنا تھا۔ فاتحہ سے حاجات تک کا سفر طے کروانا تھا۔ شہید اپنے فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں مر گیا۔

اُسے شہید کی عظمت دُنیا کو باور کروانا تھی۔ قبر کو خانقاہ میں بدلنا تھا، لیکن سولہ سترہ برس کے تاج نے اُسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ سنگِ مرمر کی سفید ٹھنڈی سِل سے سر اُٹھا کر اُس نے اُوپر دیکھا۔ تاج محل کے سفید بُراق سنگِ مرمر کے دراز قامت ستون، جیسے سینے پر آن گرے۔

''ممی! میں واپس جا رہا ہوں، یہاں کیا رکھا ہے۔ اس قبر کے سوا۔ میں اپنا برٹش پاسپورٹ یہاں اس ''گراں'' میں خوار ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔۔۔ اگر آپ ساتھ جانا چاہیں تو بھی اگر نہ جانا چاہیں تو بھی۔۔۔ مجھے اپنی یورپی نیشنیلٹی پر فخر ہے مجھے اپنے بہن بھائیوں کو اس قبر کے ترس زدہ ماحول میں نہیں چھوڑنا۔۔۔ مجھے اپنی حیثیت کا احساس اور ذمہ داری ہے۔''

پورا قبرستان عطر کستوری سے مہک رہا تھا، اگر مہک سے دہک اُٹھا تھا۔ گلاب چنبیلی کے تازہ پھولوں سے ہمک رہا تھا۔

''آپ دونوں ویسے کونسا اِتنے قریب تھے ماما! تمام عمر تو آپ کو آپوزِٹ دیواروں میں گُھسے دیکھا۔ اب دُنیاداری کی حد حاصل کرلی آپ نے، زرینہ جان، نسرین جان کے منصب کو پا لیا آپ نے۔ اب Extra محنت کرنا چھوڑ دیں، جو وفا اور محبت آپ منوانا چاہتی تھیں وہ مان لی دُنیا نے۔ آپ کی سائیکلوجیکل پرابلمز پر ہم اپنا Future تو Sacrifice نہیں کر سکتے نا۔''

کپڑے نوچ لینے والا وہ تاج کہیں دانت نکوسے قریب ہی کھڑا تھا۔ برہنہ بے حیانہ اپنے ستر کی شرم نہ دوسرے کی شرم گاہوں کی پروا۔۔۔ خود غرض ننگی لوبھی فطرت کا اذیت ناک سچ......

پورا قبرستان اگربتیوں، گلابوں، عطروں اور چوے کے باسی پانیوں سے بوجھل تھا۔ ڈونگھے لڑ میں جنات کے ہاں کوئی موت واقع ہوگئی تھی جننیاں لمبے گونجیلے بین ڈالتی تھیں جو تیز گام کے دھڑک دھڑک پہیوں سے لپٹتے تھے۔ پوٹھوار کے سارے پہاڑی سلسلے گونجتے تھے۔

میری کالی مرغی..................

ooo

مصنفہ کی دیگر کتب

- سنگ بستہ (افسانے)
- ریخت (افسانے)
- گنجی بار (افسانے)
- زمیں رنگ (افسانے)
  (بابائے اردو مولوی عبدالحق ایوارڈ یافتہ)
- مٹی کی سانجھ (ناولٹس)
- نگیں گم گشتہ (سفرنامے)
- منٹو کا اسلوب (تحقیق و تنقید)
- پاکستانی اردو افسانہ (تحقیق و تنقید)
  (سیاسی و تاریخی تناظر میں)
- طاہرہ اقبال کے منتخب افسانے
  مرتب: عمیر منظر۔ (انڈیا)
- نیلی بار (ناول)
- حرفِ زار (کالم) زیرطبع

ISBN: 978-969-496-541-3

رب لامکاں کا صد شکر ہے کہ اس نے ہمیں توفیق دی کہ ہم اردو ادب کی کتب کو سافٹ میں تبدیل کر سکے۔ اسی صورت میں یہ کتاب آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ مزید اس طرح کی مدہ کتب حاصل کرنے کے لئے ہمارے گروپ میں شمولیت اختیار کریں۔

انتظامیہ برقی کتب

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

اسکالر سدرہ طاہر صاحبہ: +92- 334 0120123